حرف حرف حقیقت

واصف علی واصفؔ

KASHIF PUBLICATIONS

جملہ حقوق بحق "کاشف پبلیکیشنز" محفوظ

"کاشف پبلیکیشنز" کی جانب سے تصانیفِ واصفؒ کی اشاعت و تقسیم کی ذمّہ داری

"دَرِ اِحساس پبلیکیشنز" کو تفویض کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں کوئی شخص یا اِدارہ قانونی طور پر کتابِ ہذا کی طباعت و تقسیم کا مجاز نہیں!

نام کتاب	:	حرف حرف حقیقت
مصنّف	:	واصف علی واصفؒ
سرِورق	:	محمد حنیف رامے
طبع اوّل	:	1994ء
اشاعتِ نَو	:	2024ء
ہدیہ	:	900/- روپے

دَرِ اِحساس
پبلیکیشنز
509 H2, Johar Town, LHR

اَدب، دِین اور تصوّف کے موضوعات پر — تمام مکاتبِ فکر کی کتابوں کا مرکز

25/1 بہاولپور روڈ مزنگ لاہور (مزار حضرت واصف علی واصفؒ کے عین سامنے)

0302-0011614 +92 42 3723 2424

wasifcentre@gmail.com www.dareehsas.com

دُکان نمبر 7، گراؤنڈ فلور، الحمد مارکیٹ، 40 غزنی روڈ، اُردو بازار، لاہور

فہرستِ مندرجات

حرفِ چند	04
الفاظ	05
خُلقِ عظیم	12
رحمت	21
اِلٰہی، اِلٰہی یا اِلٰہی!	29
اِنسان اور اِنسان	33
وضاحت	40
بچّہ	47
جھڑکی نہ دو—!	52
کہانی	57
آنکھیں	63
کائنات اور کائنات	68
آدھا رستہ	73
سنگتیں	78
وسعتیں	84
عظیم لوگ	91
اَمیر غریب	97
ہمہ رنگ	106
عدل	113
حقوق	118
مقصد	124
منزل	132
جوازِ ہستی	138
سوچتے سوچتے	143
جہاں مَیں ہوں	148
ہم کیا کرتے ہیں؟	155
بے ترتیب	160
رابطہ	165
رِشتے	170
نصیحت	176
ضمیر کی آواز	182
محنت	188
فطرت	195
حقیقت	202
دِیدنی	207
بیزاری	215
معلوم اور نامعلوم	221
آخری خواہش	227

حرفِ چند

حضرت واصف علی واصفؒ کے نثری مضامین کا تیسرا مجموعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ اِس سے قبل اُن کی ایسی ہی تحریروں کے دو مجموعے بعنوان "دل دریا سمندر" اور "قطرہ قطرہ قلزم" شائع ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں حضرت واصف علی واصفؒ کے اُن مضامین کو یکجا کیا ہے جو اُن کے وصال (۱۸ جنوری ۱۹۹۳ء) سے قبل تقریباً دو اڑھائی سال کے عرصے میں اشاعت پذیر ہوئے اور حسبِ سابق روزنامہ "نوائے وقت" کے صفحات کی زینت بنتے رہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ان بصیرت افروز اور ایمان پرور تحریروں سے اکتسابِ فیض کیا اور بڑے ذوق و شوق سے ان کا مطالعہ کرتے رہے۔

اس کتاب کی طباعت اور تزئین کے تمام مراحل حضرت واصف علی واصفؒ کی زندگی ہی میں مکمل ہو گئے تھے لیکن آپؒ کی علالت کے باعث طباعتی عمل میں بار بار رکاوٹ پڑتی رہی۔ یہ کتاب صاحبِ کتاب کی زندگی میں طبع نہ ہو سکی اور اب یہ بعد اَز وصال Posthumous تصنیف کی حیثیت سے پیش کی جارہی ہے۔ اِس کتاب کا عنوان "حرف حرف حقیقت" حضرت واصف علی واصفؒ نے خود ہی تجویز کر دیا تھا۔ آپؒ کی اِس انداز کی کتب کے سہ لفظی عنوانات جز اور کُل کے وصل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اِس داستانِ وصل کو خوبصورت علامات کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اَدب کا محور و مرکز یہی داستان رہی ہے، اور دورِ حاضر کے صوفیٔ باصفا، بے مثل درویش اور صاحبِ اسلوب ادیب حضرت واصف علی واصفؒ نے بھی اسی روایت کو نئی آب و تاب کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔

یہ تعارف نہیں بلکہ چند معروضات ہیں جن کا تعلق کتاب کی طباعت سے ہے۔ اُمّیدِ واثق ہے کہ آپؒ کی دیگر تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی طالبانِ حق اور مسافرانِ راہِ سلوک کے لیے مینارۂ نُور ثابت ہو گی۔

محمد اکرام چغتائی

الفاظ

ہر خیال اپنے مخصوص پیرہن میں آتا ہے۔ یہ پیرہن الفاظ سے بنتا ہے۔ خیال نازل فرمانے والے نے الفاظ نازل فرمائے ہیں۔ الفاظ ہی کے دَم سے انسان کو جانوروں سے زیادہ ممتاز بنایا گیا۔ انسان اشرف ہے، اس لیے کہ وہ ناطق ہے۔ انسان کو بیان کی دولت سے نوازا گیا اور بیان الفاظ کی ترتیب کا نام ہے۔ حُسن، ترتیبِ الفاظ کی اپنی صفت ہے۔ اندازِ بیاں بے شک انسان ہی کا ہے، لیکن یہ خوبی دراصل الفاظ کی ساخت میں پنہاں ہوتی ہے۔ موزوں الفاظ کا انتخاب ہی انسان کو صاحبِ طرز بناتا ہے۔ سنگ تراش کا فن یہ ہے کہ وہ پتھر میں چھپے ہوئے نقش کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ کام بڑا کام ہے۔ ہر آدمی کے بس کا نہیں۔ اسی طرح الفاظ سے مضمون اور مضامین سے الفاظ کے رشتوں کا علم ہی انسان کو مصنّف بناتا ہے۔ الفاظ کے بغیر حُسنِ خیال بس جلوہ ہے، صرف جلوہ — ایک گونگے کے خوبصورت خواب کی طرح — اور خیال کے بغیر الفاظ صرف ایک ڈکشنری ہیں — ایک ڈھیر ہے، ایسی اینٹوں کا، جنہیں کوئی عمارت بننا نصیب نہیں ہوا۔

دنیا میں اصل قوّت الفاظ کی ہے۔ اس کائنات کی ابتدا ایک لفظ سے ہوئی — ایک مقدّس لفظ — ایک اَمر، صاحبِ اَمر کا — "کُن" کے لفظ میں ایک مکمل کائنات، ایک مکمل نظام، ایک مکمل داستان پنہاں تھی۔ یہ ایک ایسا لفظ تھا کہ جس کی اطاعت میں آج تک ہر شے عمل پیرا ہے۔ یہ لفظ کا عجب کرشمہ تھا کہ "نہ ہونے" سے "ہونا" ہو گیا۔ عدم سے وجود کا سفر "کُن" سے

شروع ہوا اور وجود سے عدم تک سفر بھی اِسی لفظ کی تاثیر کا حصہ ہی ہے۔

الفاظ کی طاقت قدم قدم پر عیاں ہوتی ہے۔ قوموں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے الفاظ کا تازیانہ ہی کافی ہے۔ قومی و ملّی شعراء کا کمال الفاظ کے دَم سے ہے۔ الفاظ خون میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔ غلامی آزادی میں بدل جاتی ہے۔ انسان کے عمل کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ کسی معاشرے میں استعمال ہونے والے الفاظ کا بغور مطالعہ کرنے سے اس معاشرے کا اخلاقی معیار واضح ہو جاتا ہے۔ ترقی کرنے والے معاشروں میں اور طرح کے اَلفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

الفاظ ہی اُمّید کے چراغ روشن کرتے ہیں اور الفاظ ہی مایوسی کی تاریکیاں پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی خاص ترتیب حُدی خوانی کا کام کرتی ہے۔ ہمارے ترانے ہماری کیفیات کو ایک نہج کی طرف مائل کرتے ہیں۔ دشمنوں کے خلاف صف آراء ہونے کا عمل الفاظ کی بدولت ممکن ہے۔

محبّت ایک جذبہ ہے، ایک خواہش ہے، کسی کے قریب ہونے کی۔ محبّت خاموش بھی ہو سکتی ہے لیکن الفاظ محبّت کو کچھ اور ہی چاشنی اور رنگ عطا کر دیتے ہیں۔ محبّت کرنا اپنی جگہ لیکن محبّت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا شعر کچھ اور ہی جلوہ ہے۔ محبّت اتنی قابلِ محبّت نہیں ہوتی جتنا اسے الفاظ بنا دیتے ہیں۔

ہمارے رشتے، ہماری چاہتیں، ہماری نفرتیں اس لیے دیرپا ہیں کہ ہم اُنہیں الفاظ میں ریکارڈ کر دیتے ہیں۔ کسی کو دوست کہہ دینے کے بعد ہم اس کی جفائے وفا نُما کو برداشت کرتے ہیں۔ دوستی کا جذبہ اندر سے کئی دفعہ زخمی ہوتا ہے لیکن ہم جذبوں کے سرد ہونے کے باوجود لفظ دوستی کو نبھاتے ہیں۔ الفاظ ہمارے تعلّقات کو استقامت بخشتے ہیں۔ ہم رشتوں کو اس لیے بھی قائم رکھتے ہیں کہ انہیں رشتہ کہہ دیا جا چکا ہے۔ کہہ دینا ہی قیام ہے۔ کلمہ پڑھنے سے مسلمان ہونے والا، زندگی بھر مسلمان رہتا ہے۔ اگر اسلام کا مفہوم سمجھ میں نہ بھی آئے تو بھی

مسلمان ہی رہتا ہے۔ کلمہ پڑھ لینے سے ہی مُہرِ ثبات لگ جاتی ہے۔

الفاظ سے ہی قرآن ہے — خدا کے مقدّس الفاظ، بندوں کے نام، روح القدس کا لایا ہوا پیغام، پیغمبر ﷺ کے ذریعے سے تمام بنی آدم کے لیے۔ ان الفاظ کی ترتیب اتنی مستقل، کہ اس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لگا رکھی ہے۔ زیر، زبر، نقطہ تک نہیں تبدیل کیا جا سکتا — قرآن کے الفاظ قرآن کے علاوہ استعمال ہوں تو قرآن نہیں — الفاظ خدا کے ہوں تو قرآن ہے۔ نبی ﷺ کے الفاظ حدیث ہیں۔ بزرگانِ دین کے الفاظ ملفوظات ہیں۔ داناؤں کے الفاظ اقوال ہیں۔ جتنی مقدّس زبان سے ادا ہوں گے، اتنے ہی الفاظ مقدّس ہوں گے، اتنے ہی مؤثر ہوں گے۔

ہم الفاظ کی دنیا میں رہتے ہیں۔ الفاظ کے حصار میں رہتے ہیں۔ الفاظ ہمارا کردار ہیں۔ الفاظ ہمارا ماحول ہیں اور کبھی کبھی تو الفاظ ہماری عاقبت ہیں۔ الفاظ کانوں کے راستے دل پر اثر کرتے ہیں اور دل پر اثر کے بعد اعضاء وجوارح پر عمل کا حکم نازل ہوتا ہے اور یوں انسان کا کردار بنتا رہتا ہے۔ اچھے الفاظ پر کچھ خرچ نہیں ہوتا، لیکن اچھے الفاظ سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ الفاظ ہی انسان کو پسندیدہ یا ناپسندیدہ بناتے رہتے ہیں۔ الفاظ خوشبو کی طرح ماحول کو معطّر کرتے ہیں۔

ہر سماج اور ہر گروہ کے الفاظ الگ الگ ترتیب رکھتے ہیں۔ آپ کسی کے الفاظ یا گفتگو سن کر یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس پیشے سے تعلق رکھتا ہے۔ بازار میں بیٹھنے والے بازاری زبان استعمال کرتے ہیں۔ دارالعلوم کے لوگ اور ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ علماء کی زبان اور ہے۔ حکماء کی زبان اور ہے۔ اسی طرح جہلاء کی زبان اور ہے۔ فلمی ماحول کے الفاظ اور ہیں، ڈرامے کے اور، نثر کے اور — اور شعر کے اور — شعر کی دنیا میں الفاظ کی ایک بندش بس معنی کے پرت کھولتی چلی جاتی ہے۔ سامعین پر ایک کیفیت طاری کر دینا، شعر کا اعجاز ہے۔ دل سے نکلی ہوئی بات دلوں میں ایسے داخل ہوتی ہے کہ سامع کہہ اٹھتا ہے کہ ”میں نے یہ جانا کہ گویا

یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ بولنے والے کا سوز الفاظ میں سوز پیدا کر دیتا ہے۔ درد سے گایا ہوا کلام محفل میں عجب سماں پیدا کر دیتا ہے۔ الفاظ کے معنی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ گانے والے کا سوز قلوب کو زندہ کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ عظیم پریم راگی نے اپنی ایک نجی محفل میں ایک واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے کہ ایک رات ایک محفل میں انہوں نے بہت گایا۔ دیر تک محفل بپا رہی۔ سامعین محظوظ ہوئے۔ بہت ہُن برسا، لیکن رنگ نہ برسا۔ بس اندر ہی اندر وہ کچھ پریشان ہوئے۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنے گُرو کو یاد کیا۔ دل کا چراغ روشن کر کے کچھ الفاظ اپنے پاس سے مرتب کر کے الاپنا شروع کیا۔ الفاظ تھے:

سیّاں سے سیّاں مِلا جارے بالَم — بالَم سے بالَم مِلا جارے سیّاں

بس کیا تھا، دل کے چراغ نے دلوں کے چراغ روشن کر دیے۔ محفل میں کیفیات کا عجب عالَم پیدا ہو گیا۔ بے خودی، محویّت اور سرشاری کا عالم تھا۔ گانے والے کا درد بیدار ہوا کہ سب کا درد بیدار ہو گیا۔ غرضیکہ الفاظ میں جادو بھرنے والی شے ادا کرنے والے کا جذبہ ہے۔ بولنے والے کا لہجہ بھی الفاظ کے حُسن کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ میٹھے بول کو کرخت لہجہ مل جائے تو بول میٹھا نہیں رہتا۔

مولانا رومؒ نے ایک کہانی بیان فرمائی ہے۔ ایک دفعہ صحرا میں دو قافلے قریب قریب آ کر ٹھہرے۔ ایک قافلہ مسلمانوں کا تھا، دوسرا یہودیوں کا۔ صبح کے وقت مسلمانوں نے فجر کی اَذان کہی۔ نماز اَدا کی۔ اتنے میں یہودیوں کے کیمپ کی طرف سے ایک آدمی ایک تھال میں کچھ تحفے تحائف لے کر مسلمانوں کے کیمپ میں داخل ہوا اور اَمیرِ قافلہ سے ملاقات کی تمنّا کی۔ ملاقات ہوئی تو آنے والے نے کہا: "یہ حقیر سا تحفہ ہمارے سالارِ قافلہ نے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے"۔ مسلمان اَمیر نے کہا: "آخر کس لیے؟" آنے والا بولا: "جناب! آج ہمارے سردار کا ایک دیرینہ مسئلہ حل ہو گیا، آپ لوگوں کی بدولت۔ ہمارے امیر کی ایک بیٹی اسلام

قبول کر چکی تھی اور وہ کسی قیمت پر اسلام کو ترک نہ کرتی تھی۔ ہمارے قافلہ سالار نے بڑی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ آخر آج صبح آپ کے مؤذّن نے اَذان کہی۔ وہ کچھ اتنے کرخت لہجے میں تھی کہ ہمارے سردار کی بیٹی اپنے پرانے دین پر واپس آ گئی"۔ نتیجہ یہ ہے کہ مؤذّن اور مبلغ کو خوش الحان ہونا چاہیے۔ اچھی دعوت کو اچھے انداز سے پیش کرنا ہی اچھی بات ہے۔ رسمِ اذان کو روحِ بلالیؓ کی کتنی ضرورت ہے، اِس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

علاقائی الفاظ علاقائی تہذیب و تمدّن کا آئینہ ہیں۔ کسی انسان کے ذخیرۂ الفاظ سے یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ وہ آدمی کون سے علاقے کا رہنے والا ہے اور کون سے پیشے سے تعلق رکھتا ہے۔ تشبیہ اور استعارے کے الفاظ بھی علاقے اور زمانے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صحرائی لوگوں کے الفاظ اور ہیں، کوہستانی لوگوں کے اور۔ میدانی لوگوں کی زبان مختلف ہوتی ہے۔

بہر حال الفاظ کی حُرمت بولنے والے کے انداز اور لہجے کے دَم سے ہے۔ مقدّس الفاظ کو منزّہ زبان میسر نہ ہو تو لفظ اپنی تاثیر کھو بیٹھتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ اگر اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کیا جاتا تو وہ بھی اللہ کی خشیّت سے لرزنے لگ جاتا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن پڑھا جاتا ہے اور سننے والے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ صادق کلام کے لیے صادق زبان چاہیے۔

ہم نے قوم ہونے کی حیثیت سے الفاظ کے استعمال پر غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم بے جہت و بے سمت الفاظ کے سیلاب میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ ہر روز لاکھوں الفاظ اخباروں میں چھپ رہے ہیں۔ کالم کے کالم چھپ رہے ہیں لیکن میٹھے بول ختم ہو رہے ہیں۔ "اَز دل خیزد بر دل ریزد" والے الفاظ نظر نہیں آتے۔ دلوں کو زخمی کرنے والے الفاظ عام ہیں۔ زخموں کے مرہم کہاں ہیں؟ کرامتیں بننے والے الفاظ کہاں غائب ہو گئے؟ انسان کو انسان کے قریب لانے والے الفاظ گم ہو گئے کیا؟ گنج شکرؒ ایک میٹھی زبان کی تاثیر کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ آج نہ جانے کیوں لوگوں کے پاس شکریہ اَدا کرنے کے لیے نہ وقت ہے، نہ الفاظ۔ اپنی کوتاہی پر معذرت

کرنے کی نہ توفیق ہے، نہ جرأت۔ آج کسی سیاسی اجتماع میں بولے جانے والے الفاظ کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہم لوگ کہاں سے چلے تھے اور کہاں آ گئے۔

تلخ الفاظ معاشرے کو تباہ کر رہے ہیں۔ میٹھا بول زندہ کرنا چاہیے۔ ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو'' کے اصول کو اپنایا جائے تو ہمارا اندازِ کلام یکسر بدل سا جائے۔ لوگ اپنی زندگی میں مطمئن ہو جائیں۔ میٹھے بول سننے سے زبان میٹھی ہو جاتی ہے اور یوں مٹھاس سے مٹھاس پیدا ہوتی رہے گی۔ جب سے انسان کا احترام کم ہوا، الفاظ کا احترام بھی کم ہو گیا۔ الفاظ کے انتخاب میں ذرا بھی احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا — اور نتیجہ یہ کہ ہر دل زخمی، ہر انسان آزردہ۔ ہماری زبان تلوار کی کاٹ سے کم نہیں۔

بعض اوقات صداقت کی زبان بھی اتنی تلخ ہوتی ہے کہ بس خدا کی پناہ۔ اگر کسی انسان کی ایک آنکھ کام نہ کرتی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اُس کے منہ پر ہی اسے کانا کہہ دیا جائے۔ ہر چند کہ یہ صداقت ہے لیکن یہ ایک بدتمیزی کا مظاہرہ ہے۔ صداقت کا غیر محتاط اظہار بھی باعثِ پریشانی ہو سکتا ہے۔

ایک دفعہ ایک بادشاہ نے ایک دست شناس و ستارہ شناس انسان کو بلایا۔ اس سے اپنا احوال پوچھا، مُنجّم نے حساب لگایا، زائچہ بنایا اور بادشاہ کو اطلاع دی: ''جہاں پناہ! آپ کے سب عزیز آپ کے سامنے مر جائیں گے''۔ بادشاہ اتنی بُری خبر پر بڑا پریشان ہوا۔ اسے غصہ آ گیا کہ منجّم نے کیا خبر دی ہے۔ اس نے منجّم کو گرفتار کروا دیا۔ سلطنت میں منادی کروا دی گئی کہ کوئی اور منجّم بادشاہ کے لیے حساب لگائے۔ ایک آدمی حاضر ہوا، اس نے زائچہ بنایا، حساب لگایا اور کہا: ''جہاں پناہ! آپ کی عمر طویل ہے۔ آپ اپنے سب عزیزوں سے زیادہ عمر پائیں گے''۔ بادشاہ خوش ہو گیا۔ بولا: ''مانگ کیا مانگتا ہے''۔ منجّم نے کہا: ''جہاں پناہ! بس میرے استاد کو رہا کر دیں''۔ سلطان نے وضاحت چاہی تو منجّم نے کہا: ''گرفتار منجّم میرا اُستاد ہے۔ اُس نے بھی وہی کچھ بتایا جو میں نے بتایا لیکن وہ الفاظ کے انتخاب میں محتاط نہ ہو سکا۔ آپ عزیزوں سے زیادہ عمر پائیں

یا آپ کے عزیز آپ سے پہلے مر جائیں، بات ایک ہی ہے لیکن ادائیگی مختلف ہے"—— اور یہی چیز اہم ہے کہ ہم الفاظ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

الفاظ بھی خاندان رکھتے ہیں۔ قصیدے کے الفاظ اور ہوتے ہیں اور مرثیے کے اور، تنقید کے اور، توصیف کے اور، رزمیہ اور، عشقیہ اور۔ غزل کے الفاظ اور ہیں، مثنوی کے اور۔ کیا یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں کہ شرافت کے الفاظ کون سے ہیں۔ بدمزاج ہونا اتنا خطرناک نہیں جتنا بدتمیز ہو جانا، کیونکہ بدتمیز آدمی الفاظ کے غلط استعمال کا مجرم بھی ہے۔

الفاظ کے صحیح استعمال کی توفیق، نعمت ہے۔ یہ نعمت بھی کم انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔ الفاظ سے ماحول کو خوشگوار بنانے کا کام لیا جائے تو بڑی بات ہے۔ خالی الفاظ نگلنے اور الفاظ اُگلنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ الفاظ سے ماحول روشن کیا جائے۔ الفاظ سے دلوں کو خوش کیا جائے۔ الفاظ سے تعمیرِ ملّت کے عظیم کام میں شامل ہونے کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔ الفاظ حقیقت ہیں۔ الفاظ امانت ہیں۔ الفاظ دولت ہیں۔ الفاظ طاقت ہیں۔ انھیں ضائع نہ کیا جائے۔ انھیں رائیگاں نہ ہونے دیا جائے۔

خُلقِ عظیم

حکمائے عالَم نے سب سے بڑے اخلاق کے بارے میں دنیا کو جو معیارِ اخلاقیات دیا، وہ سب انسانوں کا تصوّر ہے اور انسانی تصوّر میں نفس کا ہونا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ اِس کے برعکس جو معیار اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا، وہ ہر خامی سے آزاد ہے۔ خالق ہی بہتر جانتا ہے کہ مخلوق کے لیے کون سا معیارِ اخلاق بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی ذات میں یہ فیصلہ فرما دیا کہ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ اس کے بعد اخلاق کا بہترین نمونہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔

تکمیلِ انسانیت کا نقطۂ عروج حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ تکمیلِ ذات میں تکمیلِ اخلاق کا دعویٰ اپنی تکمیل کے ساتھ موجود ہے۔ ذات کامل ہو تو صفت مکمل ہو جاتی ہے۔ ذات اور صفات کا رشتہ عجب ہے۔ کبھی صفت ذات کی پہچان ہے اور کبھی ذات صفت کی۔ مثلاً اگر صفت صداقت ہے تو ذات صادق ہی کہلائے گی، لیکن اگر ذات حضورِ اکرم ﷺ کی ہو، تو آپ ﷺ ایسے صادق ہیں کہ آپ ﷺ جو بھی فرمائیں، وہی صداقت ہے۔

آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی اتنی مکمل ہے کہ آپ ﷺ کے دَم سے ہی صفات کی تکمیل ہوئی، صفات کو مرتبہ ملا، صفات کو تقدّس ملا، پہچان ملی، عروج ملا۔ ایک عام آدمی سچ بولے تو ہم اِس سچ کی تحقیق کر سکتے ہیں، عقل کے ذریعے سے، مشاہدے کے ذریعے سے، لیکن ایک پیغمبر اور خاص طور پر حضورِ اکرم ﷺ کی صداقت ہماری تحقیق سے بلند و ماورا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ نے زندگی کے معاملات میں جو بھی ارشاد فرمایا، وہ صداقت ہے کہ

ان کا مشاہدہ موجود تھا، لیکن کمالِ صفت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کریم کے بارے میں اور مابعد کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ ہماری تحقیق میں نہ آسکنے کے باوجود صداقت ہے، بلکہ صداقتِ مطلق ہے — اور کمالِ صفت کا یہ اعجاز ہے کہ ہم آپ ﷺ کی ہر بات کو تحقیق کے بغیر تسلیم کرنے کو اپنا ایمان، بلکہ سرمایۂ ایمان سمجھتے ہیں۔

آپ ﷺ سے پہلے پیغمبروں میں رسالت کا رنگ مخصوص اور جزوی تھا۔ آپ ﷺ کی شخصیت میں رسالت اپنے انتہائی رنگ سے ایسی مکمل ہوئی کہ اِس کے بعد کسی رسول کی ضرورت ہی نہیں — یعنی آپ ﷺ نے اخلاق کو اِس درجہ مکمل فرمایا کہ اِس کے بعد کسی اور تفصیل کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ ﷺ نے انفرادی اور اجتماعی اخلاق میں وہ انقلاب پیدا فرمایا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

حضورِ اکرم ﷺ کی تعلیم کا نتیجہ تاریخ نے دیکھا کہ آقا پیدل چل رہا ہے اور غلام سوار ہے۔ آپ ﷺ کے دَم سے گویا اخلاق اور صفات کو سند عطا ہوئی۔ آپ ﷺ کے اخلاق کی یہ تاثیر ہے کہ آپ ﷺ جب ارشاد فرماتے تو سامعین سر جھکا کر اور خاموش ہو کر یوں سنتے جیسے اُن کے سَروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ آپ ﷺ کا حُسنِ اخلاق یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس کو دفعتاً دیکھا، وہ مرعوب ہو گیا، جو آپ ﷺ سے آشنا ہوا، وہ محبّت اور اَدب کرنے لگ گیا۔

آپ ﷺ نے اخلاق کو تکمیل کا وہ درجہ عطا فرمایا کہ ایک طرف تو اللہ اور اللہ کے فرشتے آپ ﷺ پر دُرود بھیجتے ہیں اور دوسری طرف آپ ﷺ کے جاںنثار آپ ﷺ کی خدمت میں آج تک دُرود و سلام اور نعت کا ہدیہ پیش کرتے آرہے ہیں — اپنے تو اپنے، بیگانے بھی آپ ﷺ کو عقیدت کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ آج بھی چودہ سو سال کی دُوری کے باوجود آپ ﷺ دِلوں کے قریب ہیں۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں جہاں اللہ کریم نے انسانیت کی تکمیل فرمائی، نبوّت کی تکمیل فرمائی، وہاں اخلاقِ جلیلہ کی تکمیل بھی فرمادی۔ آپ ﷺ کا کردار، کردار کی انتہا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد، ارشاد کی انتہا ہے اور آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب آسمانی کُتب کا

حرفِ آخر۔ آپ ﷺ کے اخلاقِ عالی کا یہ مقام ہے کہ اِسے صداقتِ نبوّت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا۔ سورۃ یونس میں ارشاد ہے: ”میں اِس سے پہلے تم لوگوں میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم سمجھتے نہیں“۔ گویا اعلانِ نبوّت سے پہلے آپ ﷺ کی چالیس برس کی تمام عمر بھی مرقّعِ اخلاق ہے۔

نبوّت اخلاق کا نتیجہ نہیں، اخلاق نبوّت کی عطا ہے —اور نبوّت، اور پھر آپ ﷺ کی نبوّت، کمالِ عطائے الٰہی ہے۔ جب اللہ کریم اپنے حبیب ﷺ کو اخلاق کا معیار بنا کر پیش کرے تو وہ اخلاق کتنا مکمل ہو گا، اِس کا اندازہ مشکل نہیں۔ دراصل اخلاق ایک ایسی راہِ عمل ہے جس پر چلنے والے انسان کا کردار مخلوقِ خدا کے لیے بے ضرر اور منفعت بخش ہوتا ہے۔ انسانی سوچ اخلاق کا جو معیار دیتی ہے، وہ قابلِ تاثیر ہو سکتا ہے لیکن جب پیغمبر اخلاق کا معیار دے تو وہ معیار خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور خالق بہتر جانتا ہے کہ مخلوق کے لیے کون سا کردار بہتر ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے اخلاق کے بیان کے بارے میں جہاں تاریخ گواہ ہے، وہاں قرآن بھی شاہد ہے: ”بے شک (اے پیغمبر ﷺ)! آپ اعلیٰ اخلاق پر فائز ہیں“۔ حضور ﷺ کا اپنا ارشاد تکمیلِ اخلاق کے ضمن میں ایک مینارۂ نُور کی طرح درخشاں ہے۔ ارشاد ہے: ”میں حُسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں“۔ اور یہ کہ ”میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارمِ اخلاق کا معاملہ تکمیل تک پہنچاؤں“۔ شاید ہی کوئی ایسی اخلاقی صفت ہے جس کو اپنانے کی آپ ﷺ نے تلقین نہ فرمائی ہو اور جس پر آپ ﷺ نے خود عمل کر کے نہ دکھایا ہو۔ آپ ﷺ نے زندگی کو اخلاق کی تفصیل اور تکمیل بنا دیا۔

آپ ﷺ محافظِ اخلاق ہیں، مفسّرِ اخلاق ہیں، مظہرِ اخلاق ہیں، منبعِ اخلاق ہیں، مجسّم اخلاق ہیں، بلکہ مکمل اخلاق ہیں۔ آپ ﷺ کی اخلاقی رفعتوں کا بیان دراصل آپ ﷺ کی پوری سیرت کا بیان ہے۔ اِخلاق کی جزئیات میں آپ ﷺ کے ہاں استقامتِ عمل ہے، حسنِ سلوک ہے، حسنِ معاملہ ہے، عدل و انصاف ہے، جود و سخا ہے، ایثار ہے، مہمان نوازی ہے، سادگی اور بے تکلفی ہے، شرم و حیا ہے، عزم و استقلال ہے، شجاعت ہے، صداقت ہے، امانت ہے،

ایفائے عہد ہے، زہد و تقویٰ اور قناعت ہے، عفو و رحم ہے، کفار اور مشرکین سے حُسنِ سلوک ہے، غریبوں کے ساتھ محبّت ہے، حیوانات اور پرندوں پر رحم ہے، رحمت و محبّت عام ہے، رقیق القلبی ہے، عیادت و تعزّیت ہے، اَولاد سے محبّت ہے، غرضیکہ حسنت جمیع خصالہٖ۔

آپ ﷺ کے بارے میں کیا لب کشائی کی جا سکتی ہے۔ آپ ﷺ کے اخلاق اور اَوصاف کا ذکر احادیث اور سیرت کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اخلاق و اوصاف کی تفسیر نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ کے اخلاق میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس اخلاق کا پرچار کیا، اُس پر مکمل طور پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس تمام انبیائے کرام اور مصلحینِ عالَم میں واضح طور پر اِس لیے ممتاز ہے کہ آپ ﷺ کا عمل آپ ﷺ کے علم کا شاہد ہے۔ حدیثِ نبویؐ اور سنّتِ نبویؐ میں تطابق ہے۔

آپ ﷺ کا کمالِ اخلاق یہ ہے کہ وہ دَور جس میں صداقت، دیانت اور امانت کے چراغ گل ہو چکے تھے، آپ ﷺ نے اپنے پاکیزہ کردار سے اُس دَور میں "الصّادق" اور "الامین" کے القاب حاصل کیے، اور وہ بھی مخالفین سے۔ آپ ﷺ کے قریب رہنے والے سبھی لوگ یک زبان یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نیک سیرت تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی برائی کے بدلے میں برائی سے کام نہیں لیا۔ آپ ﷺ ہمیشہ درگزر فرماتے، معاف فرما دیتے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کا دِل نہیں دکھایا۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کو بات کرنے کے دوران میں ٹوکا نہیں۔ آپ ﷺ خندہ جبیں، نرم گفتار اور مہربان تھے۔

آپ ﷺ پر جب پہلی بار وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ نزولِ وحی کی شدّت سے گھبرائے اور آپ ﷺ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آپ ﷺ نے گھبرا کر رفیقۂ حیات سے اپنی کیفیت کا ذکر فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو تسلّی دی اور آپؐ کے اخلاق کے بارے میں یہ کہا: "ہرگز نہیں! خدا کی قسم! خدا آپؐ کو کبھی اندوہ گیں نہ کرے گا۔

آپؐ عزیزوں اور رشتے داروں سے حسنِ سلوک کرتے ہیں۔ ناتواں، بے کسوں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا، اُسے دیتے ہیں، مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں، مصائب میں حق کے معاون و مددگار ہیں اور آپؐ میں وہ تمام صفات ہیں کہ آپؐ صادق القول ہیں"۔ آپ ﷺ کے قبلِ نبوّت کے اخلاق کا گواہ حضرت خدیجہؓ سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ داعیِ حق ہونے کی حیثیت سے اپنی تعلیم کا افضل و اعلیٰ نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں انسانی زندگی کے لیے جس انسانی اخلاق کی تعلیم فرمائی، اُس کا عملی مظہر سرکار ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کو اِس بات کی پوری آگہی تھی کہ آپؐ کو دنیا کے لیے معلّمِ اخلاق بنا کر بھیجا گیا ہے۔ آپ ﷺ کے اعمال اور آپ ﷺ کے اقوال اِس بات کا مکمل ثبوت ہیں۔ اخلاق کی تکمیل آپ ﷺ کے دَم سے ہوئی۔

آپ ﷺ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "کامل ایمان اُس مومن کا ہے جس کا اخلاق اچھا ہے" — "اعمال کے ترازو میں حُسنِ خُلق سے بھاری کوئی نیکی نہیں" — "انسان حسنِ اخلاق سے عبادت کا درجہ حاصل کر سکتا ہے" — "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں"۔ حضورِ اقدس ﷺ سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا: "کون سی نیکی بہتر ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "کھانا کھلانا اور سب کو سلام کہنا"۔ یعنی سب کو سلامتی کی دُعا کا پیغام پہنچانا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک مرتبہ اپنے کسی غلام کو بُرا بھلا کہا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے سُن لیا۔ فرمایا: "ابوذرؓ! ابھی تم میں جہالت باقی ہے، غلام تمہارے بھائی ہیں، اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کیا ہے، جس کا بھائی ماتحت ہو، اُسے چاہیے کہ بھائی کو ویسا ہی کھانا کھلائے جیسا خود کھائے، ویسا ہی پہنائے جیسا خود پہنے، بھائی سے ایسا کام نہ لے جو اُس سے نہ ہو سکے، کوئی سخت کام ہو تو اس کی مدد کرے"۔

حضور ﷺ کے اخلاقِ عالی میں حسنِ سلوک کو بڑی اہمیت ہے۔ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا: "قسم ہے! وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم! وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم! وہ ایمان

نہیں لایا"۔ صحابہؓ نے عرض کیا: "یارسولؐ اللہ! کون؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جس کا پڑوسی اُس کے شر سے محفوظ نہیں"۔

آپ ﷺ کی زندگی کے واقعات اور آپ ﷺ کے ارشادات میں ایسے ہزار ہا پہلو سامنے آتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے تشریف لائے۔ کون سی ایسی خوبی ہے جو آپ ﷺ کی ذات میں موجود نہ ہو۔ آپ ﷺ نرم مزاج تھے، خوش گفتار تھے، متین تھے، حلیم الطبع تھے، کسی کی دل آزاری نہ فرماتے۔ آپ ﷺ کی مجلس میں نئے آنے والوں کو جگہ نہ ملتی تو آپؐ اپنی رِدائے مبارک بچھا دیتے۔ بچوں پر تو آپ ﷺ اِس حد تک شفیق تھے کہ مشرکوں کے بچوں پر بھی رحم کرنے کا آپؐ نے حکم فرمایا۔ غلاموں پر آپ ﷺ کی شفقت کا یہ عالم تو اِس بات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آج بھی آپؐ کی غلامی ہی سرفرازی کا ذریعہ ہے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ غریبوں اور بے کسوں سے عملی ہمدردی کا اظہار فرمایا۔ آپ ﷺ نے دنیا میں مساوات کا اعلیٰ ترین نمونہ قائم کیا۔ فتحِ مکہ کے بعد آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "اے گروہِ قریش! اللہ نے جہالت کا غرور اور نسب کا افتخار مٹا دیا۔ تمام لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے" — اور خُلق کا یہ عالم ہے کہ آپ ﷺ کے پاس خُلقِ عظیم ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "ہر دین کا خُلق ہوتا ہے اور اِسلام کا خُلق حیا ہے"۔

آپ ﷺ کے پاس جو صفت بھی موجود ہے، دائم ہے۔ آپ ﷺ دائم الرّضا ہیں، دائم الزّہد ہیں، دائم الشّوق ہیں، دائم الصّبر ہیں، دائم الصّدق ہیں، دائم الامر ہیں اور دائم الفکر ہیں۔ غرضیکہ آپ ﷺ ہمہ صفت موصوف ہیں۔ حُسن آپ ﷺ کی صفت ہے اور صفت آپ ﷺ کا حُسن۔ آپ ﷺ ہمیشہ ہشاش بشاش رہے اور اللہ تعالیٰ کے خوف اور اللہ کی محبّت نے آپ ﷺ کو دنیا کے خوف اور محبّت سے آزاد کر دیا۔ حضرت سعد بن ہشامؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا: "اے ایمان والوں کی ماں! حضورِ اکرم ﷺ کے اخلاق کے بارے میں کچھ بتائیں"۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "تم نے قرآن نہیں پڑھا؟" انہوں نے کہا: "قرآن تو پڑھا ہے"۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "حضورِ اکرم ﷺ کا خُلق قرآن تھا"۔

یعنی آپ ﷺ قرآنِ مجسّم تھے۔ آپ ﷺ کا اخلاق ہی منشائے قرآن کے عین مطابق ہے۔ قرآن کو پڑھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن جس اخلاق کی تعلیم دے رہا ہے، وہ حضور ﷺ ہی کا اخلاق ہے اور حضور ﷺ کی زندگی اور آپ ﷺ کے اخلاق کو دیکھیں تو یوں نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ کا اخلاق قرآن ہی کا اخلاق ہے۔ اللہ کا پسندیدہ اخلاق آپ ﷺ کی ذات میں اور آپ ﷺ کا اخلاق اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں موجود ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ کے اخلاق کی پیروی ہی رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے۔

اخلاقیات کے تمام مکاتبِ فکر اِس بات پر متفق ہیں کہ رحم اخلاق کی اعلیٰ صفت ہے، اور حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں رحم اور رحمت کا یہ عالَم ہے کہ آپ ﷺ کے بارے میں اِرشاد ہے: وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۔ آپ ﷺ تمام مخلوق کے لیے رحمتِ مجسّم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اپنا، بیگانہ، مومن، کافر، چرند پرند، ذی جان، بے جان، مرئی یا غیر مرئی کوئی مخلوق ہو، آپ ﷺ کی رحمت کا سایہ سب کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ آپ ﷺ کو جب بھی کسی نے کفار پر لعنت بھیجنے کے لیے کہا، آپ ﷺ نے ہمیشہ یہی فرمایا: ”میں لعنت کے لیے نہیں، رحمت کے لیے بھیجا گیا ہوں“۔ روایت ہے کہ حضورِ اقدسؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، آپ ﷺ کے رعب و جمال سے کانپنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے آپ کو سنبھال، میں کوئی بادشاہ نہیں، میں تو قریشی ماں کا بیٹا ہوں، جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی“۔

آپ ﷺ لغزشوں کو معاف فرمانے والے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے: ”میں نے حضورِ اقدسؐ کی خدمت کی ہے، میں نے کبھی آپ ﷺ کو یہ کہتے نہیں سنا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا“۔ غلاموں کے ساتھ شفقت کا یہ عالَم ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: ”یارسولؐ اللہ! غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کریں؟“ آپ ﷺ خاموش رہے۔ اُس نے جب تیسری مرتبہ یہی گزارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہر روز ستر مرتبہ“۔ حضورِ اقدسؐ اکثر دُعا فرمایا کرتے تھے: ”اے اللہ! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اُٹھا، مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر ہو“۔ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا: ”یہ کیوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا:

”اس لیے کہ مسکین دولت مندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے“۔

آپ ﷺ کی روزمرہ کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ آپ ﷺ میں تکلّف اور تصنّع کا شائبہ تک نہیں تھا۔ لباس، خوراک اور رہائش میں ہمیشہ سادگی سے کام لیتے۔ عمارات اور فضولیات آپ ﷺ کو ناپسند تھیں۔ واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے نیا مکان بنوایا، جس کا گنبد بلند تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو پوچھا: ”یہ مکان کس کا ہے؟“ لوگوں نے نام بتایا۔ آپ ﷺ چپ رہے۔ وہ شخص جب حسبِ معمول آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا تو آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا۔ اُس نے پھر سلام کیا، آپ ﷺ نے پھر منہ پھیر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ناراضی کی کیا وجہ ہے۔ گھر جا کر گنبد کو زمین کے برابر کر دیا۔ آپ ﷺ نے جب دوبارہ مکان دیکھا تو ارشاد فرمایا: ”ضروری عمارت کے سوا ہر عمارت انسان کے لیے وبال ہے“۔

ایک دفعہ آپ ﷺ ایک چٹائی پر آرام فرما رہے تھے۔ اُٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوئے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں۔ عرض کیا: ”یا رسولؐ اللہ! ہم لوگ کوئی گدّا منگوا کر حاضر کریں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھ کو دنیا سے کیا غرض، مجھے دنیا سے اتنا ہی تعلّق ہے جتنا اُس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لیے کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاتا ہے اور پھر اُس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے“۔ آپ ﷺ نے سادہ زندگی ہی کو بلند خیالی کے لیے لازمی قرار دیا۔

دنیا کے تمام مفکرینِ اخلاق نے آج تک جتنے بھی اخلاق کے اصول بنائے ہیں، آپ ﷺ کی زندگی اُن اصولوں کی مظہر ہے۔ آج کے زَرپرست اور ہوس پرست معاشرے میں شاید یہ بات سمجھنا مشکل ہو کہ وہ انسان جو پیغمبروں کا اِمام ہو، اللہ کا محبوب ہو، قبیلے کا سردار ہو، جس کا نام لوگوں کے ایمان کا حصہ ہو، جس کا علم دِلوں پر جاری ہو، جس کے اشاروں پر لوگ اپنی جان نثار کرنے کو سعادت سمجھتے ہوں، اُس انسان کے جسمِ مقدّس پر کوئی پیوند دار لباس ہو اور پیوند بھی اپنے دستِ مبارک سے لگائے ہوں۔ جس کو دولتِ معراج عطا ہو رہی ہے، عروج کی انتہا ہو رہی ہے، اُس کی زندگی اتنی سادہ ہو کہ اگر حضرت عمرؓ دیکھیں تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں کہ قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور آپ ﷺ اللہ

کے پیغمبر ہوتے ہوئے اِس حال میں زندگی بسر کریں، اور پھر حضور ﷺ سادگی اور یقین سے یہ ارشاد فرمائیں: ”اے عمرؓ! تم کو یہ پسند نہیں کہ اُن کے لیے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت“۔

حضورِ اقدسؐ نے اخلاقِ انسانی کو تکمیل کے اُس درجے تک پہنچا دیا کہ یہ اخلاقِ آسمانی ہو گیا۔ اللہ نے انسانوں کے لیے جو بھی اخلاق پسند فرمایا، وہ دراصل اخلاقِ محمدی ﷺ ہے۔ حضور ﷺ نے جس اخلاق کو پیش کیا، وہ دراصل اللہ کا پسندیدہ اخلاق ہے۔ کوئی خوبی ایسی نہیں جو حضور پُر نُورؐ میں نہ ہو۔ آپ ﷺ ایفائے عہد میں اتنے بلند تھے کہ آپ ﷺ تین دن تک ایک جگہ کھڑے رہے، ایک انصاری نے آپ ﷺ سے ٹھہرنے کا وعدہ لیا اور وہ خود بھول گیا۔ تین دن کے بعد جب وہ وہاں سے گزرا، آپ ﷺ کو دیکھا تو اُسے یاد آیا، لیکن آپ ﷺ نے اُس سے صرف اتنا کہا کہ تُو نے مجھے بہت تکلیف دی۔

حضور ﷺ کے اخلاق کے بارے میں کیا کیا کہا جائے۔ آپؐ نے اللہ سے اُسوۂ حسنہ کی سند لی، دنیا نے آپ ﷺ کو معلّمِ اخلاق مانا، آپ ﷺ پر نبوّت کی تکمیل ہوئی، انسانیت کی تکمیل ہوئی اور اخلاق کی تکمیل ہوئی۔ آپ ﷺ کی ذات کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں
جس شان توں شاناں سب بنیاں

رحمت

رحمت کا تصوّر یا اِس کے وجود کا ثبوت اللہ تعالیٰ نے خود عطا فرمایا۔ اُس کا ارشاد ہے، اور یہ اِرشاد بڑے زور دار لہجے میں آیا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا، یعنی خبر دار میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔

اگر انسان کے اعمال اپنے منطقی نتیجے پر منتج ہوں تو رحمت کا لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انسان محنت کرے گا، حاصل کر لے گا۔ بدی کرے گا، سزا پالے گا۔ نیکی ہو گی، انعام پائے گا۔ ہر وجہ کا ایک نتیجہ ہے اور ہر نتیجے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ اگر وجوہ اور نتائج صرف وجوہ اور نتائج ہی ہوتے تو غالباً انسان کے دل سے اُمّید، آس اور رحمت کا تصور ختم ہو جاتا۔ رحمت ہوتی ہی انسان کو اُس کی بد اعمالیوں کی سزا سے بچانے کے لیے، یعنی حال کی غلطی جو مستقبل میں اپنے لیے سزا مرتب کر چکی ہے یا لکھ چکی ہے، اِس سے بچانے والی شے رحمت کہلائے گی۔ پس یہ ارشاد کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا، صرف یہی مفہوم رکھتا ہے کہ اے انسان! اپنے مستقبل سے مایوس نہ ہونا اور یہ کہ اے انسان! اگر کبھی غلطی سرزد ہو جائے تو یاد رکھنا کہ غلطی کی سزا ضرور ہے لیکن یہ بات نہ بھولنا کہ میری رحمت میرے غضب سے زیادہ وسیع ہے۔ غلطی کی سزا دینے والا مَیں ہی ہوں لیکن یہ میرا ہی فضل ہے کہ میں غلطیاں معاف بھی کرتا ہوں، خطاؤں سے در گزر بھی کرتا ہوں، انسان کی کمزوری کو اپنی رحمت کی طاقتیں عطا فرماتا ہوں۔

آنے والے اندیشوں میں مبتلا رہنے والے انسان کے لیے ایک صدا بلند ہوتی ہے کہ

خبر دار! یہ نہ بھولنا کہ مَیں اور صرف مَیں اِس بات پر قادر ہوں کہ گناہ معاف کر دوں اور یہی نہیں بلکہ انسان کی تمام غلطیوں کو معاف کر دوں، اور یہ کہ اُس کے تمام گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دوں۔ مَیں انسان کو تاریکیوں سے نکالتا ہوں، اسے روشنی عطا کرتا ہوں، ظلمات سے نُور کا سفر میری رحمت کے سہارے ہو سکتا ہے، کافروں کو سزا سے پہلے انہیں ہدایت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمانے والا ہوں، بے ایمانوں کو ایمان کی دولت عطا کرتا ہوں۔

اللہ کریم کی رحمت کو اگر غور سے دیکھیں تو زندگی میں قدم قدم پر چھائی ہوئی ہے۔ ہمارا ایک ایک سانس اُس کا مرہونِ منّت ہے۔ رات کو سونے کے بعد صبح کی بیداری اُس کی رحمت کے سہارے ہوتی ہے۔ انسان نہیں جانتا کہ وہ کن کن مشکل مقامات سے گزار دیا جاتا ہے۔ یہ زندگی مشاہدات سے بھری ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ رحمت کے قائل نہیں، وہ کس مشکل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس مال ہوتا ہے، سکون نہیں ہوتا۔ وہ اپنی آرزوئیں پوری کر کے بھی دولتِ سکون سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ اُس کا فضل ہے کہ وہ انسان کے دل کو سکون و قرار کی دولت سے مالامال کر دے۔

اللہ کریم نے انسان کو رحمت کا تصوّر دیا۔ رحمت کے خیال سے ہی انسان کے تصوّر میں بہار پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی آرزو جس کے حاصل کرنے کی خواہش ہو اور اُس کا استحقاق نہ ہو، رحمت کے انتظار میں پل جاتی ہے۔ مسلمان جنّت کی تمنّا میں اپنی حیات کا سفر کر رہے ہیں۔ یہ یقین کہ ان کی آخرت بہتر ہو گی، صرف رحمت کے تصوّر سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے لیے سب سے بڑا اعزاز یہی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے انتظار میں رہتے ہیں۔ مسلمان رحمت کے حق سے مایوس نہیں ہوتا۔ ہم اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے، بھروسہ اُس کے فضل پر ہے۔ ہمیں اپنے اعمال کا آسرا نہیں، آسرا اُس کی رحمتوں کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عبادت وہ ہے جو معبود کو منظور ہو جائے، ورنہ کروڑوں سال کی عبادت ایک سجدہ نہ کرنے سے ضائع ہوتی دیکھی گئی اور مقرب معتوب ہوا کہ اُس نے اپنے عمل کے غرور میں اپنا مقام چھوڑ دیا۔ یہاں مقام

صرف منظوری کا ہے، تقرّب صرف رضامندی کا ہے۔ نتیجہ —اعمال کا نتیجہ —اعمال پر نہیں، عنایات پر ہے۔ عدل اہم چیز ہے لیکن فضل عدل سے بہت زیادہ قوی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ انسان کو ضعیف پیدا کیا گیا، ترغیبات کے رنگین جال میں انسان پھنس جاتا ہے اور جو لوگ اِس جال سے بچ گئے، وہ رحمت کے دائرے میں پناہ پا گئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کیے ہوئے، اپنے نامزد فرمائے ہوئے انبیاء علیہم السّلام کو دنیا میں اِس لیے مبعوث فرمایا کہ وہ لوگوں کو گناہ اور کفر کی تاریکی سے باہر نکالیں۔ اُن سے جہالت کے اندھیرے دُور کریں اور وہ لوگ جو خواہشات کے جال میں جکڑے جا چکے ہیں، اُن کو اُمّید اور رحمت کی قوت عطا فرما کر اُنہیں ہر بندھن توڑنے کے لیے تیار کر دیا جائے۔

دنیا میں آنے والے تمام پیغمبروں علیہم السّلام نے انسانیت کی خدمت کی، انسان کو فلاح کی طرف سفر کروایا اور سب پیغمبروں میں سب سے زیادہ بزرگ پیغمبرؐ، محبوب پیغمبرؐ، منوّر پیغمبرؐ اور پیغمبروں کے امام پیغمبر ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں کے کمال کا مظہر بنا کر بھیجا۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ یہ مقام بڑے غور کا ہے کہ کیا ایک انسان سب انسانوں کے لیے اور سب جہانوں کے لیے رحمت یا باعثِ رحمت ہو سکتا ہے، اور اگر ایک انسان سب انسانوں کے لیے، سب جہانوں کے لیے، پوری کائنات کے لیے، ماضی، حال، مستقبل کے لیے، ظاہر باطن کی کائنات کے لیے، رسولِؐ رحمت ہے تو وہ ایک انسان کیا انسان ہو گا! اب ایسے انسان کے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے اُس پر دُرود و سلام بھیجا جائے۔ عام آدمی اپنی ذات کے لیے باعثِ رحمت نہیں ہو سکتا اور سرکار ﷺ پوری کائنات کے لیے باعثِ رحمت ہیں —یعنی پوری کائنات کے لیے مایوسیوں سے نکلنے کی ضمانت عطا فرماتے ہیں —تو مطلب واضح ہوا کہ رحمت قربِ رسولؐ ہے اور اِس قرب سے محروم انسان کو اُس کے اعمال کی عبرت کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ عمرِ گذشت کے کفر اور اُس کی بداعمالیوں کے نتیجے سے بچنے کا واحد ذریعہ حضور ﷺ کی مہربانی ہے۔ ہمیں اپنے اعمال کی

کمی بیشی سے بچانے والی ذات حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ آپ ﷺ کا وجودِ مبارک جہاں باعثِ تخلیقِ کائنات ہے، وہاں باعثِ قیامِ کائنات اور باعثِ نجاتِ کائنات بھی ہے۔

انسان دنیا کے بکھیڑوں میں مبتلا ہو کر بھول جاتا ہے کہ وہ کس سفر پر آیا، کس مقصد کے لیے آیا اور اُسے کہاں جانا ہے۔ وہ کھیل میں مصروف ہو جاتا ہے اور مقصدِ اعلیٰ اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی گمراہوں کو ہدایت دے کر صراطِ مستقیم سے آشنا فرماتی ہے۔ آپ ﷺ کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ رسولوں میں سے ہیں اور آپ ہی صراطِ مستقیم پر ہیں —یعنی حضور ﷺ کے راستے پر چلنے والا، حضور ﷺ سے محبت کرنے والا، حضور ﷺ کی اطاعت کرنے والا، اللہ کے قرب کو حاصل کر لیتا ہے، اور جس پر حضور ﷺ مہربان، اُس پر اللہ مہربان، اور جس پر اللہ مہربان ہو جائے، وہ کسی اعمال کی کمی بیشی سے کیوں خوف کھائے گا۔ اللہ ہی کا ارشاد ہے کہ اے میرے محبوبؐ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اِن پر عذاب ڈالوں جبکہ آپؐ اِن میں ہیں، یعنی جس دل میں حضور ﷺ کی یاد ہے، وہ ہمیشہ قرار میں رہے گا اور جائے قرار بہشت کے علاوہ کیا ہے؟ گویا کہ حضور ﷺ کی محبّت باعثِ حصولِ نجات ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان نیک اعمال نہ کرے، کیونکہ یہ حضور ﷺ کی محبت سے انحراف ہے۔ حضور ﷺ کا ہر عمل ہمارے لیے ایک نمونہ ہے اور ہر عمل ہمارے لیے نجات کا باعث ہے۔

یہاں تک بھی کہا جاتا ہے کہ فقرائے کرام سے سرزد ہونے والی کرامتیں بھی حضور ﷺ ہی کی رحمتوں کے جلوے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ آپؐ کی نگاہ رحمت کی ضمانت ہے۔ آپؐ کی رحمت ، اللہ کی رحمت ہے کیونکہ آپؐ خود ہی اللہ کی رحمت ہیں۔ مولانا رومؒ کو مولوی بنانے والا عمل اُس کی رحمت کا عمل ہے۔ رحمت انسان کو عام سے خاص اور خاص سے خاص الخاص بناتی رہتی ہے۔ اقبالؒ کو محرمِ راز بنانے والی شے یہی رحمت ہے۔ اقبالؒ جانتا تھا کہ اُس کے شعر باقی شعراء سے زیادہ بلند نہیں، اُس کا فکر باقی فلسفیوں سے زیادہ بلیغ نہیں۔ ملّت

کا دَرد حالؔی کے پاس بھی تھا اور شب بیداری اُسی اقبالؒ کے بقول عطارؒ، رومیؒ، رازیؒ اور غزالیؒ کو بھی ملی، لیکن اِقبالؒ کو جو پذیرائی عطا ہوئی، قوم نے اپنے دل میں اسے جگہ دی، یہ صرف اور صرف حصولِ رحمتِ مصطفیٰ ﷺ کے دَم سے ہے۔ اِقبالؒ کردار کا غازی نہ ہونے کے باوجود قلندرانہ مقامات پر فائز کیا گیا۔ اُس کی آواز قوم کے لیے ایک پُرسوز حُدی خواں کی آواز تھی۔ اُس کا نالۂ نیم شبی آج بھی قوم کے لیے بیداری کا پیغام رکھتا ہے۔ اُس نے قوم کو ایک ایسے تصوّر سے ہمکنار کیا، جسے پاکستان کا لقب ملا۔ یہی تصوّرِ اقبالؒ تھا۔

رحمت ایک مستقبل کا تصوّر دے کر انسان کو جاوداں کر دیتی ہے۔ خاک افلاک تک جا پہنچتی ہے۔ رحمت کے شکر میں جھکا ہوا سَر، سرفراز کر دیا جاتا ہے۔

رحمت ایک عام زندگی میں ایسا انقلاب برپا کرتی ہے کہ وہی عام انسان خاک کے ایک ذرّے سے ماہتاب و آفتاب بنا دیا جاتا ہے۔ آنے والے زمانوں کو رخ عطا کرنے والے لوگ رحمت سے نوازے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن کی فکر رحمت کا کرشمہ ہے۔ اُن کی فصاحت اور بلاغت رحمت کا اعجاز ہے۔ رحمت رفعتیں عطا کرتی ہے، فانی کو جاودانی بناتی ہے، جُز کو کُل کے راستے دکھاتی ہے، کثرت کو وحدت میں سمیٹتی ہے، مایوسیوں میں اُمّیدوں کے چراغ جلاتی ہے، ہونی کو انہونی اور انہونی کو ہونی کر دیتی ہے، غریبی میں بادشاہی اور بادشاہی میں فقیری عطا کرنے والی شے رحمت ہے۔ وہ جو دیکھنے میں خاک نشیں نظر آتا ہے، حقیقت میں عرش نشیں ہے۔

دونوں جہان کے لیے رحمتوں کا پیغام لانے والی ذات انسان کو تکلیفوں میں مبتلا دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ کو اپنا کوئی غم نہیں۔ آپ ﷺ آدھی آدھی رات تک جاگتے ہیں، سجدے کرتے ہیں اور روتے ہیں۔ بس اُمّت کا حال دیکھ کر آپ ﷺ کو آزردہ کرنے والی بات صرف یہی ہے کہ اُمّت نے آپ ﷺ کا راستہ ترک کر دیا، لیکن ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ ابھی اُمّیدوں کے چراغاں ہیں، ابھی اعتماد کی منزلیں طے ہو رہی ہیں۔ ابھی لوگوں میں یقین

ہے، آپ ﷺ کی رحمتوں کا، آپ ﷺ کی نوازشوں کا۔ حق نہ رکھنے کے باوجود آپ ﷺ کی عنایات کو اپنا حق سمجھنے والے اتنی ناحق بات بھی نہیں کر رہے۔ یہی تو حق ہے اور یہی اللہ کے حکم کا مفہوم ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا، یعنی عمل کی کوتاہی کی وجہ سے حق نہ رکھنے کے باوجود رسولِ رحمت ﷺ کی عنایت کو اپنا حق مانتے رہنا۔ یہی راستہ مایوسیوں سے بچنے کا راستہ ہے۔ اِسی یقین کو ایمان کہتے ہیں۔ وہ اللہ جس نے ہمیں اپنا دین عطا فرمایا، اپنی عنایات عطا فرمائیں، ہمیں آنکھیں عطا کیں اور آنکھوں کے لیے روشن روشن کائنات بنائی، اُسی اللہ نے ہمارے لیے دنیا کی راہیں آسان فرمائیں اور ہمارے لیے دریاؤں کو حکم دیا کہ ہمیں راستہ دے دیں۔ بلند پہاڑوں کے لیے حکم ہے کہ انسان کو راستہ دے دیں۔ ہر راز کو حکم ہے کہ انسان کے لیے آشکار ہو جائے۔ ہر مخفی کو ظہور کا حکم دینے والا اپنی رحمتوں کے اٹل ہونے کا اعلان فرماتا ہے۔ رحمت آ کے رہے گی، گناہ معاف کر دیے جائیں گے، شرط اظہارِ ندامت ہے، شرط خلوصِ دل سے توبہ ہے— شرط حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے کی تمنّا ہے— شرط اللہ کی رسی کو مل کر مضبوط پکڑنے کی ہے، یعنی شرط رحمت کی تمنّا ہے اور اِس کا انعام حصولِ رحمت!

رحمت کے کرشمے دیکھنے والی آنکھ اکثر پُرنم رہتی ہے۔ رحمت والے لوگ اِس جہان میں رہ کر بھی اُس جہان کے خیال میں زندہ ہوتے ہیں۔ دُور کے زمانے بھی اُن کو حضور ﷺ کے قریب رکھنے میں رکاوٹ نہیں ڈالتے، کیونکہ اُس نگاہ میں صدیوں کے فاصلے بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ وہ نگاہ صدیاں عبور کر کے اپنے درویشوں کی زندگی کو آج بھی روشن کرتی ہے۔ آپ ﷺ آج بھی قریب کرتے ہیں اور قریب ہوتے ہیں۔ یہی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اِس میں نہ ماضی دُور ہوتا ہے، نہ مستقبل بعید ہوتا ہے۔ اِس میں فاصلے سمٹ جاتے ہیں— فاصلے تاریخ کے ہوں یا جغرافیے کے، اِس میں کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ آج رجوع کرنے والا پُرانے جلوے کو حاضر پاتا ہے۔ گزرے زمانے کے جلووں کو پکارنے والا مایوس نہیں کیا جاتا، کیونکہ جلوے

گزرتے نہیں۔ سورج میں روشنی قائم ہے، چاند میں نُور باقی ہے، آسمانوں کی گردش برقرار ہے —یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کائنات کے لیے رحمت کا سبب ماضی بن جائے۔ یہ ناممکن ہے۔ کائنات حاضر، رحمت حاضر، کائنات موجود، رحمت موجود، بلکہ یہاں تک کہ کائنات نہ موجود ہو، رحمت تب بھی موجود رہتی ہے کیونکہ رحمت دراصل حیّ و قیّوم کی صفت ہے اور اِس صفت سے حضور ﷺ کو متّصف کیا گیا ہے۔ جب صفت نہیں مر سکتی تو موصوف نعوذ باللہ کیسے فانی ہو سکتے ہیں۔ رحمتیں مرنے کے بعد بھی حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

ہم دُعا کرتے ہیں کہ اللہ! ہمارے ماں باپ پر رحم فرما، ہماری اولادوں پر فضل کر، اور اگر ماں باپ یا اَولاد رخصت ہو چکے ہوں، تب بھی دُعا کے حوالے سے اُن پر رحمت ہو سکتی ہے۔ رحمت ہڈیوں پر کیا ہو گی، خالی بے جان گوشت پوست پر کیا ہو گی، رحمت تو ہمارے ماں باپ پر ہو گی اور اگر ماں باپ زندہ نہیں تو پھر ماں باپ کا لفظ کس کے لیے ہے۔ ہم کسی واہمے کے لیے دُعا نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ یہ دُعا ہمیں حیّ وقیّوم نے بتائی ہے۔ اللہ واہموں کی بخشش کی دُعائیں نہیں بتاتا۔ رحمت کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاری ہے، اور رحمت مانگنے والے کے لیے ہے اور نہ مانگنے والے کے لیے بھی ہے —اور کبھی کبھی تو نہ مانگنے والے زیادہ خوش قسمت نظر آتے ہیں کہ اُن کے لیے ہر صاحبِ راز نے دُعا کی۔

اللہ کو بھول جانے والے لوگ اللہ کو تو یاد ہیں۔ وہ جنھوں نے اللہ کو نظر انداز کر دیا، اللہ انہیں نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ جنھوں نے اللہ کو چھوڑ دیا، اللہ اُنہیں نہیں چھوڑتا۔ اللہ نے پیغمبرؑ بھیجے کہ اِن ناسمجھ لوگوں کو ہدایت عطا فرمائی جائے۔ اِن لوگوں کا استحقاق نہیں، لیکن اِن پر رحمت کرنا، رحمتوں والے کی شان ہے۔ وہ اتنی بڑی رات کے اندر روشنی کا چراغ جلاتا ہے، وہ کفر کے اندھیروں میں ایمان کے نُور کا جلوہ دکھاتا ہے۔

رحمتِ حق اُس شخص کی تلاش میں رہتی ہے جس کی آنکھ پُرنم رہتی ہے۔ آنسوؤں کے قریب رہنے والے رحمتِ حق کے قریب ہیں۔ انسان کی زبوں حالی پر ترس کھانے والے،

رحمتِ حق کے اندر ہیں۔ رحمت کرنے والے، دراصل رحمت حاصل کرنے والے ہیں۔ انسان کے قریب رہنے والے، خدا کے قریب ہیں اور خدا کے قریب رہنے والے، محبوبِ خدا ﷺ کے قریب رہتے ہیں — اور یہ قرب، قربِ رحمت ہے۔ رسولِ رحمت ﷺ کی ہر بات حصولِ رحمت کا ذریعہ ہے۔ آپ ﷺ نے کسی سے کبھی انتقام نہیں لیا۔ غلاموں کو ایک دن میں ستّر مرتبہ معاف کرنے کا حکم فرمایا۔ آپ ﷺ پوری کائنات کے لیے دعوتِ رحمت ہیں۔ اپنوں کو عبادت کے غرور سے بچاتے ہیں اور عبادت سے محروموں کو رحمت کا تصور دے کر عبادت کے قریب لاتے ہیں۔ فریاد کرنے والوں کو رحمت کے حصول کا حق عطا فرماتے ہیں۔ جس کو رحمت کا حق مل گیا، اُسے رسولِ رحمت ﷺ کے دامن میں پناہ مل گئی۔ جسے حضور ﷺ کے دامن میں پناہ مل گئی، اُس کا کام آسان ہو گیا— یعنی حضور ﷺ پر ہمیشہ دُرود و سلام بھیجتے رہنا— اور یہی اصل نسخہ ہے، حصولِ رحمت کا!!

اِلٰہی، اِلٰہی یا اِلٰہی!

اے خاموشی کی زبان سننے والے مالک! اے اپنی مخلوق کے ہر حال سے ہمہ حال باخبر رہنے والے مولا! ہم پر رحم فرما! تُو ہی تو جانتا ہے کہ ہم کس چیز سے محروم ہو رہے ہیں۔ اے بنانے والے! ہمیں پھر سے بنا— ہم شاید ہم نہیں رہے۔ سب کچھ وہی ہے لیکن سب کچھ بدل سا گیا ہے—!

ہمارا آسمان خوبصورت ہوتا تھا مگر اب وہی آسمان ہمارے سر پر وزن ڈال رہا ہے۔ پاؤں تلے سے زمین نکلا چاہتی ہے۔ ہم تیرے دیرینہ اِلتفات سے محروم سے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری زندگی تیرے محبوب ﷺ کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئی ہے—!

ہم انسان کی محبّت سے محروم ہیں— انسان، انسان کے قریب آئے تو یوں لگتا ہے کہ خطرہ، خطرے کے قریب آ گیا ہے— بھائی، بھائی کے لیے خوف پیدا کر رہا ہے۔ ہم پر بے یقینی کی وبا نازل ہو چکی ہے۔ ہر آدمی ہر دوسرے آدمی سے ڈر رہا ہے۔ ہم عزمِ کوہکن کی باتیں کرتے ہیں لیکن ہم حوصلہ شکن واقعات سے روشناس کر دیے جاتے ہیں۔ جس قوم کے دل سے علماء اور اُدباء کا احترام ختم ہو جائے، اُس کے انجام سے ڈر سا لگتا ہے۔

میرے مولا! تُو ہی ہمیں اندھیروں سے نکال— ہمیں روشنی دکھا، ہمیں راستہ دکھا— اپنی محبّت کا راستہ— کامیابیوں کا راستہ— یقین کی منزل دُور ہوتی جا رہی ہے— تیرا فضل چاہیے— تُو نے ہمیشہ ہمارے ساتھ مہربانی کی— عظیم مہربانی، بڑا احسان! تیرا فضل ہمیں میسّر رہا— اب کیا ہو گیا؟

ہم نے شاید شکر کرنا چھوڑ دیا— ہم گلہ اور شکایت کرنے والی قوم بنتے جا رہے ہیں— ہمارا مستقبل محرومی نہ ہو جائے— میرے مولا! تیرا اپنا ارشاد ہے: ''اگر تم شکر کرو گے تو نعمتوں میں اضافہ کروں گا''— ہم توبہ کرتے ہیں، ناشکر گزاریوں سے توبہ، احسان فراموشی سے توبہ!

میرے آقا! تیرا شکر ہے کہ تُو نے ہمیں اپنے پیارے نبی ﷺ کی اُمّت میں پیدا کیا — ہر احسان سے بڑا احسان یہی احسان ہے۔ ہمیں اپنی اِس عنایت کی قدر کرنے کا شعور بخش—! میرے مالک! تُو نے ہمیں اس ملک کی نعمت سے نوازا— یہ صرف تیرے فضل اور تیری شفقت کے سبب سے ممکن ہوا— تُو نے دس کروڑ غلام مسلمانوں کو آزادی کا شعور اور آزادی کے حصول کا حوصلہ بخشا— دس کروڑ غلام مسلمان آزاد مملکت حاصل کر گئے اور آج دس کروڑ[1] آزاد مسلمان اس مملکت اور اِس آزادی کی حفاظت کرنے کا حق اَدا نہیں کر رہے!

میرے اللہ! ہم تیرے سب احسانات کا شکر ادا کرتے ہیں۔ تُو نعمتوں میں اضافہ فرما — ہمیں ایک منزل کے حصول کے لیے آمادۂ سفر کر— ہم مختلف گروہوں میں بٹتے جا رہے ہیں — ہمارے ہاں کچھ لوگ ظالم ہیں، کچھ مظلوم۔ ہم پر رحم فرما— جب محروم اور غریب اُس مقام تک پہنچا دیا جائے کہ وہ تیری رحمت سے مایوس ہونے لگے، تو وہ وقت اُمراء کے لیے آغازِ عبرت کا وقت ہوتا ہے۔ یا اللہ! جنھیں دولت دی ہے انہیں سخی بنا اور جنھیں غریب بنایا انہیں اپنے قریب رکھ!!

اے شفیق و رحیم آقا! ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں ہمارے اعمال کے حوالے نہ کر دیا جائے— ہمیں اعمال کی عبرت سے بچا— ہمیں اُس بُڑھیا کے انجام سے بچا جس نے محنتِ شاقہ سے سُوت کاتا اور آخر میں اسے اُلجھا دیا۔ ہمیں رائیگاں محنتوں سے دو چار نہ ہونے دے۔ میرے خدا! ہم پر کسی بیرونی دشمن نے نہیں، اندرونی دشمن نے عذاب ڈالا— سفید پوش طبقے کی کمائی، تیری کتاب چھاپنے والوں کے ادارے میں لُٹ گئی— فنانس کمپنیاں غریبوں سے ظلم کر گئیں— میرے مولا! حالات بہتر فرما— تُو تو مسبّب ہے۔ سکون کے اسباب پیدا فرما—!

---

1 یہ مضامین 1980ء کی دہائی میں تحریر کیے گئے، اس وقت وطنِ عزیز کی آبادی دس کروڑ تھی۔

یہ ملک تیرا ہی ہے — تیرے لیے، تیرے نام کی عظمت کے لیے، تیرے ہی فضل سے بننے والا یہ ملک تیرے اور صرف تیرے ہی کرم سے قائم رہ سکتا ہے — تُو اکابرینِ ملّت کے دِلوں کو ہدایت سے منوّر فرما، تاکہ ملّت میں وحدتِ کردار پیدا ہو سکے۔ دشمن کبھی طاقتور نہیں ہوتا، بس دوست ہی چھوڑ جاتے ہیں — اے اللہ! ہم اِلتجا کرتے ہیں، ہم تیرے دربار میں دُعا کرتے ہیں کہ ہم پر رحم فرما —!

دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں اُس دن سے، جب ہمارے اعمال ہماری عبرت بن کر ہماری راہ میں کھڑے ہوں گے اور پھر اُس کے بعد کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ یاالٰہی! تُو ہماری منزل کو آسان فرما — ہمیں توبہ کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! ہمیں اپنے ماضی، اپنے حال اور اپنے مستقبل پر خوش ہونے والی قوم بنا — ہمیں وسوسوں سے باہر نکال۔ ہمیں مغرور اور مایوس ہونے سے بچا۔ ہم مال جمع کرنے والی اور گننے والی قوم بنتے جا رہے ہیں، ہم چھینا جھپٹی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ عافیت مشکل ہوتی جا رہی ہے۔

کامیاب ریاست تو وہی ہے کہ ایک خوبصورت عورت، زیورات سے لدی ہوئی، تنِ تنہا ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کر جائے اور اسے کوئی خطرہ نہ ہو — ایک ایسا معاشرہ جس میں نہ کوئی مظلوم ہو، نہ محروم — میرے اللہ! یہ دَور کبھی آئے گا؟ تُو چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ تُو نے تو حرفِ ''کُن'' کہنا ہے اور پھر بدل جائے گا نظامِ ہستی — تیرے ہی کرم کی بات ہے — تیرے ہی فضل کا سوال ہے — تیرے ہی رحم کا آسرا — تیری ہی عنایات کا سہارا ہے —!

تُو ہمارے دلوں کو اپنے نُور سے زندہ کر — ہماری راتوں کو اپنی یاد سے آباد کر — ہمیں سوزِ دروں سے نواز دے — ہمیں نمائش اور آلائش سے بچا۔ ہم پر نازل فرما، اپنے کرم کی بارش — ہم پر آسان فرما، اپنی معرفت کی منزل — ہمیں ایک بار پھر وہی جامِ اُلفت دے — آباد کر اُجڑے ہوئے آشیانے — ایک بار پھر اِس قوم کو سنبھلنے کا موقع دے — ہمیں ایک درخشاں تاریخ لکھنے کا موقع دے — ہمیں تاریخِ اسلام میں کسی روشن باب کا اضافہ کرنے والا بنا۔

اے مالک! تُو ہمیں وہ زندگی دے کہ ہم بھی خوش رہ سکیں اور تُو بھی ہم پر راضی رہے۔ اے اللہ! ہماری زندگی کے تقاضے اور دین کے تقاضوں میں جو فرق آ چکا ہے، اسے دُور فرما۔ ہماری زندگی کی ضروریات اور ہیں اور دین کی ضرورت اور ہے—!!

یاالٰہی! ہمیں لیڈروں کی یلغار سے بچا! ہمیں ایک قائد عطا فرما—ایسا قائد جو تیرے اور تیرے حبیب ﷺ کے تابع فرمان ہو، ہم اُس کی اطاعت کریں تو تیری ہی اطاعت کے حقوق ادا ہوتے رہیں۔ مولا! اس قوم کو میزان کا محافظ بنا! عدلیہ کا میزان، تجارت کا میزان، سیاست کا میزان، علم و تعلیم کا میزان، اور امانتوں کی حفاظت کے اداروں کے نظام کا میزان!

اے مولا! تُو بن مانگے دینے والا ہے، اور ہم لاعلم یہ بھی نہیں جانتے کہ تجھ سے کیا مانگا جائے۔ ہمارے لیے جو بہتر ہے وہ بن مانگے دے دے اور جو ہمارے لیے نامناسب ہے، اُس کے مانگنے کی توفیق ہی نہ دے۔

یااللہ! اِس قوم کے دن دیانت دارانہ محنت میں گزریں—اِس قوم کو رزقِ حلال سے تعارف کروا—اِس کی راتوں کو اپنے ذکر سے آباد رکھ۔ جس قوم سے نالۂ نیم شب اُٹھ جاتا ہے، اُس سے سکون اُٹھ جاتا ہے۔ یااللہ! ہمیں اپنے خوف کے علاوہ ہر قسم کے خوف سے آزاد رکھ! یااللہ! آدمی کا آدمی کے دل میں احترام پیدا کر—ہم میں ایک عظیم قوم بننے کی صفات پیدا کر—والدین کو اولاد کی گستاخی سے بچا، اولاد کو والدین کی ناراضی سے بچا—ہمارے مستقبل کو ہمارے حال سے بہتر بنا—ہمیں وعدے پورے کرنے والی قوم بنا۔ ہمیں مخالفین کو معاف کرنے کا حوصلہ عطا فرما۔ ہمیں اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کی جرأت عطا فرما—!

اِس قوم کو ایک قوم بنا—الٰہی! اپنی توحید کا واسطہ، مسلمانوں میں وحدت پیدا فرما! تیرے حبیب ﷺ کی اُمّت، تیرے حبیب ﷺ کی اُمّت کہلانے کی مستحق ہو جائے—! یاالٰہی! سادہ اور صداقت والی زندگی عطا فرما!—اور سب سے بڑی بات—تیرے کرم کی انتہا چاہتے ہیں کہ تجھ سے تیرے محبوب ﷺ کی محبّت مانگتے ہیں۔

اِنسان اور اِنسان

اللہ کی تلاش کرنے والے انسانوں کی راہوں سے گزرتے ہیں۔ انسان ہی متلاشی ہے اور انسان ہی مظہرِ صفات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اپنے اظہار کے لیے۔ انسان کو صلاحیتیں عطا فرمائیں تاکہ وہ اِس کائنات کے بارے میں اور اِس کے خالق کے بارے میں غور کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذریعے اپنا اور اپنی مخلوق کا تعارف کروایا۔ ہم ہر روز دُعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھا، یعنی اُن انسانوں کی راہ جن پر تیرا انعام ہوا۔ گویا انعام یافتگان کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے، خدا کا راستہ ہے۔

وہ لوگ جو اِنسان کو چھوڑ کر یا انسان سے منہ موڑ کر خدا کی تلاش کرتے ہیں، کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اللہ کی کتاب انسانوں کے تذکرے اور انسانوں کے انجام کے بارے میں آگاہی دینے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت بلند مقام عطا فرمایا۔ انسان کے آگے فرشتوں کو جھکا دیا۔ انسان کو اللہ کے راستے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ نے اپنا گھر انسانوں کے ذریعے بنایا۔ اللہ کے ذکر کے لیے انسانی زبان اور اللہ کی یاد کے لیے انسانی دل درکار ہیں۔ اللہ کی خوشی انسان کی خدمت میں ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ انسانوں کی خدمت کرو، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، سائل کو جھڑکی نہ دو، یتیم کا مال ہرگز نہ کھاؤ، کیے ہوئے وعدے پورے کرو، نرم خُو اور نرم دل ہو جاؤ، زمین پر اکڑ اکڑ کر مت چلو۔ یہ تمام احکام اللہ کے ہیں اور انسان کی خدمت کے لیے ہیں۔ اللہ کی رضا انسان کو خوش رکھنے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ماں باپ کے آگے اُف

نہ کرو، اُن کو جھڑکی نہ دو، اُن سے نرم الفاظ میں بات کرو۔ وہ جب بڑھاپے میں پہنچیں تو اُن کے لیے رحمت کے بازو پھیلا دو"۔ خدمت ماں باپ کی اور خوشی اللہ کی !— یہی بات غور طلب ہے کہ اللہ کہاں ہے ؟ سجدے میں اللہ ملتا ہے لیکن مسکین کو کھانا کھلانے میں اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ انسان نے جس مقام پر انسانوں کو چھوڑ کر خدا سے محبّت کا دعویٰ کیا، وہ اکثر غلط نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ، اپنے کلمے کے ساتھ انسان کا اسم بلند کیا۔ اپنا کلام انسانی قلب پر نازل فرمایا اور اپنے دین کی تبلیغ انسانوں کے ذریعے کی، انسانوں کے لیے—!

اللہ کے بارے میں جتنی بھی آگاہی دنیا میں موجود ہے، جتنا بھی بیان اور علم موجود ہے، سب انسان کے ذریعے سے ہے۔ اللہ جن انسانوں کو اپنے قریب رکھتا ہے، انھی انسانوں کو انسانوں کے قریب کر دیتا ہے، یعنی جو شخص اللہ کے ہاں جتنا محبوب ہو گا، اُس کے لیے انسانوں کی دنیا اتنی ہی محبوب ہو گی۔ اس لیے جو انسان محبوبِ ربّ العالمین ﷺ ہے، وہی انسان رحمۃ للعالمین ﷺ ہے۔ اللہ کے ساتھ محبّت کرنے والے انسانوں سے بیزار نہیں ہو سکتے اور انسان سے بیزار ہونے والے اللہ کے قریب نہیں ہو سکتے۔

دیکھنے والی بات یہ ہے کہ انسان کی محبّت اور خدا کی محبّت میں کیا فرق ہے؟ اللہ کے حوالے کے بغیر انسان کی محبّت یا انسان کی خدمت ہمیں غافل کر سکتی ہے، عاقبت سے بے خبر رکھتی ہے اور ہم اِس دنیا اور اِس زندگی میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف اخلاقیات، الٰہیات کے بغیر، معاشرے کو گمراہ کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر ہم غریب کی مدد کریں تو یہ نیکی ہے۔ یہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ ہمیں جاننا چاہیے کہ جس مال سے ہم غریب کی مدد کر رہے ہیں، وہ مال حرام کی کمائی نہ ہو کیونکہ حرام کی کمائی کہیں نہ کہیں سے ظلم یا دھوکے کے ذریعے آتی ہے۔ لہٰذا غریب کی مدد کرنے کی نیکی ایک بدی کو جنم دے سکتی ہے۔ اسی طرح رشوت کی دولت سے اگر حج کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہی نہیں، اُس کے نظام کے خلاف بغاوت ہے۔ لازم یہ ہے کہ انسان اللہ

کی رضا کے لیے اللہ کے قانون کے مطابق کمائی ہوئی دولت سے غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی خدمت کرے۔ مسکین یا بھوکا کوئی بھی انسان ہو، اسے کھانا کھلانے سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ یہاں دین کی کوئی قید نہیں۔ بھوکے آدمی کو کھانا کھلانا ہے لیکن کھانا کھلانے والا انسان احتیاط کرے اور غور کرے کہ اس نے یہ کھانا کہاں سے حاصل کیا۔ ناجائز کمائیوں سے بنے ہوئے محلّات پر لکھ دینا کہ یہ اللہ کے فضل سے بنا ہے، ایک ظلم ہے۔

اللہ کے ہاں انسانوں کے تذکرے ہیں۔ جب ہم اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے اپنے ارشاد کے مطابق وہ ہمارا ذکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان کی کتنی اہمیت ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ساری کائنات کی وسیع و عریض تخلیق میں سب سے اشرف مخلوق انسان ہے۔ انسان کا مقام یہی ہے کہ اسے ''احسنِ تقویم'' بنایا گیا۔ اگر کسی انسان کا دِل توڑ دیا جائے تو اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔ کسی انسان کو حق سے محروم کر دیا جائے، اللہ کو ناپسند ہے۔ جو زمانہ اللہ کی منشا کے مطابق ہوتا ہے، وہ انسان کی سرفرازی کا دَور ہوتا ہے، انسان کے حقوق کے تحفظ کا دَور ہوتا ہے، انسان کی عزتِ نفس کے لحاظ کا زمانہ ہوتا ہے۔ انسانیت کی عزت ہی خدا کے احکام کی بجا آوری میں ہے۔ نیکی دراصل انسانوں کے ساتھ نیک سلوک کا نام ہے، خالی نیکی تو کوئی نیکی نہیں۔ ہم نیکی انسان کے ساتھ کرتے ہیں، انعام اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے۔ ہم غریب کی خدمت کرتے ہیں، سخاوت کی منزل پاتے ہیں۔ غریب انسان ایک لحاظ سے محسن ہے کہ وہ سخی ہونے کا موقع دیتا ہے۔ اگر اللہ کی طرف رجوع ہو تو لوگ غریبوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کی خدمت کریں، اُن کی مدد کریں۔

عبادت اُس مقام پر نہیں پہنچا سکتی، جہاں غریب کی خدمت پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا حکم فرمایا، غریب کے لیے۔ اللہ کے پاس زمین و آسمان کے خزانے ہیں۔ وہ مالک ہے، وہ خود عطا کر سکتا ہے، پھر زکوٰۃ کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حکم دیا کہ اپنے جمع شدہ مال میں سے غریب بھائی کی خدمت کرے تاکہ وہ پیسہ جو سنگدلی پیدا کر رہا ہے، فراخدلی پیدا

کرے۔ نظامِ خیرات، صدقات اور بیت المال سب غریبوں کے لیے ہے تاکہ جو لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں، اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُن کو بھی ساتھ چلا دیا جائے، ورنہ اِس چند روزہ زندگی میں سفر تو سب کا کٹ ہی جائے گا، اور پھر اِس کے بعد ایک ایسا دَور آئے گا، ایک ایسا دن ہو گا، جب انسان سے پوچھا جائے گا کہ اُس نے اللہ کی دی ہوئی نعمتیں کس طرح استعمال کیں، اُس نے انسانوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔

ہماری نیکیاں انسان کے ساتھ، ہماری بدی انسان کے ساتھ، یعنی نظامِ ثواب و گناہ انسانوں ہی کے ذریعے سے مرتّب ہوتا ہے۔ اگر ہمارے علاوہ دنیا میں اور کوئی انسان نہ ہو تو ہمارے لیے نہ کوئی جزا ہے، نہ سزا— ہم جمادات و حیوانات میں سے ہو جائیں گے۔ انسانوں کے دَم سے ہی رونقیں ہیں۔ اللہ کے نام پر انسانوں کے ساتھ سنگتیں بنتی ہیں۔ اللہ کے خوف سے انسانوں کے ساتھ نیکیاں کی جاتی ہیں۔ یہی خوفِ الٰہی ہمیں گناہوں سے بچاتا ہے۔ ہم دوسروں کے حقوق پامال نہیں کر سکتے، اِس لیے کہ ہم اللہ سے ڈرتے ہیں۔ ہم ایک بتائے ہوئے راستے کے مطابق سفر کرتے ہیں کہ وہ راستہ ہمیں اللہ نے اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعے بتایا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی عملی شکل پیغمبر ﷺ کی حیاتِ طیبّہ میں نمایاں ہوتی ہے۔ پیغمبر ﷺ کی ذات اِس لیے بھی اہم ہے کہ اِس ذات میں ثبوت ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ اِس ذات کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ زندگی صرف عبادت نہیں ہے، زندگی کوشش ہے، زندگی جہاد ہے، زندگی محبّت ہے، زندگی فتوحات ہے، زندگی تنہائی بھی ہے، مجلس بھی ہے، زندگی تنہائی کا سجدہ بھی ہے اور محفلوں کی رونقیں بھی! اللہ کی محبّت، انسانوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص مقرّبِ الٰہی ہو اور انسان کی محبّت سے محروم ہو۔ یہ دعویٰ شیطانی ہے کہ ہم صرف اللہ سے محبّت کرتے ہیں اور مخلوق سے کچھ سروکار نہیں— یہ غرور ہے، تکبر ہے۔ شیطان نے انسان کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور نتیجہ یہ کہ خدا کے آگے کیے ہوئے سجدے بھی رائیگاں ہو گئے۔ ہمارا سارا نظامِ عبادت انسانوں سے مرتّب ہے، ہماری دُعائیں بالعموم اجتماعی

ہیں — اے ہمارے رب! ہم پر رحم فرما — ہمیں سیدھی راہ دکھا — ہم پر ہماری ہستی سے زیادہ بوجھ نہ ڈال — ہمیں گناہوں سے بچا۔ گویا منشائے الٰہی یہی ہے کہ ''میں'' سے ''ہم'' بنا جائے۔ ''ہم'' کے بغیر ''تم'' کی عبادت جھوٹ ہے۔ ایک مقام پر انسان کو تنہار کھا گیا ہے — سجدہ — اللہ کی عظمت بیان کرتے وقت — !!

ہمارا سارا منظر اور پس منظر انسانوں سے ہے۔ غور کیا جائے تو کوئی انسان، انسانوں کی وابستگی کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ مثلاً میرے پاس صرف آنکھیں ہیں، نظر ہے، لیکن میرا منظر انسانوں کے چہرے سے بنا ہے۔ اگر منظر نہ ہو تو نظر کس کام کی؟ اسی طرح میری سماعت محتاج ہے، انسانوں کی آواز کی۔ میرے ارد گرد بولنے والے انسانوں کا ہجوم نہ ہو تو میرے کان بیکار ہو جائیں۔ اللہ نے انسانوں کو بیان عطا فرمایا۔ یہ بڑے غور کا مقام ہے، کہ بیان سننے والا نہ ہو تو بیان کیا بیان ہو گا۔ میری زبان محتاج ہے، سننے والے کانوں کی۔ میرا دل محتاج ہے، انسان کے چہرے کی محبّت کا۔ میرے جذبات، میرے احساسات سب انسانوں سے وابستہ ہیں۔ مجھے راہنمائی چاہیے، کسی انسان کے ذریعے! اللہ کی منزلوں تک پہنچانے والا، اللہ کا بندہ ہی ہو گا۔ میں نیکی، بدی، گناہ و ثواب، خوشی اور غم جو کچھ بھی حاصل کروں گا، انسان کے ذریعے۔ میری زندگی انسانوں کے ذریعے سے گزرے گی۔ ہمیں بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ میری پیاس بجھانے والا پانی کتنے ہاتھوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پاؤں کے نیچے جو سڑک ہے، اس کے بننے میں کتنے سال اور کتنے انسانوں کے پسینے لگے ہوئے ہیں۔ آنکھ کھول کر چلے، تو انسان کو انسانوں کے احسانات نظر آئیں گے۔ ان انسانوں کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جس نے انسان کا شکریہ ادا نہ کیا، اُس نے خدا کا کیا شکر ادا کرنا ہے۔ جس انسان نے ماں باپ کو پرورش کرتے ہوئے دیکھا اور انہیں نہ مانا، اُس نے خدا کو دیکھے بغیر کیا ماننا ہے!

اللہ تعالیٰ انسانوں ہی کی دنیا میں اپنے جلوے دکھاتا ہے۔ انسان خاموشی سے دُعا مانگتا ہے، اللہ خاموش دُعاؤں کو سنتا ہے، منظور فرماتا ہے۔ اللہ کے جلوے انسانوں کے روپ میں ہر

ہر جگہ نظر آ سکتے ہیں۔ یہ جہان اللہ کی نشانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اللہ کے بندوں نے اللہ کی یاد کے چراغ جلا دیے اور ان چراغوں کی روشنی میں آنے والے انسانوں کو نئی منزلوں پر چلنے کی توفیق دی۔ اللہ کی تلاش بہت آسان ہے۔ وہ انسانی شہ رگ سے قریب ہے، بہت قریب لیکن اس تک رسائی حاصل کرنا اس لیے مشکل ہے کہ انسان، انسان ہے اور اللہ، اللہ! حادث، قدیم نہیں ہو سکتا اور قدیم، حادث نہیں ہو سکتا۔ بس فرق یہی ہے کہ ہم ساجد ہیں، وہ مسجود۔ ہم پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں، اور وہ پیدائش اور موت سے آزاد، حیّ و قیّوم ہے۔ وہ ہر آغاز سے پہلے موجود تھا اور ہر انجام کے بعد موجود رہے گا۔ وہ اتنا قریب ہے، لیکن اسے دیکھا نہیں جا سکتا — جس طرح ہم اپنی بینائی کو خود نہیں دیکھ سکتے، لیکن بینائی ہمارے قریب رہتی ہے۔ ہماری روح ہمارے پاس ہے لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ہماری ذات ہر وقت ہمارے ساتھ ہے لیکن اپنی ذات کا دیدار ممکن نہیں۔ سمندر میں رہنے والی مچھلی سمندر کو دیکھ نہیں سکتی۔ پانی سے نکلے بغیر سمندر نظر نہیں آتا اور پانی سے نکلے تو مچھلی، مچھلی نہیں رہتی۔ بس اللہ کے جلوے، اللہ کے جلوے ہیں — پاس ہیں، ساتھ ہیں، لیکن کیا ہیں — اور کہاں ہیں، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے — اور اللہ کی محبّت کی انتہائی عملی شکل اللہ کے محبوب ﷺ کی اطاعت اور محبّت میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے کہ اگر تم لوگوں کو اللہ سے محبّت ہے تو میری اطاعت کرو، اللہ تم سے محبّت کرے گا"۔ یعنی اللہ کی محبّت انسان کے حوالے کے بغیر منظور ہی نہیں ہو سکتی۔ ہم اللہ سے محبّت کریں اور پیغمبر ﷺ کی نفی کریں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ ہم سے محبّت کرے۔ رابطے کے لیے انسان اور انسانِ کاملؐ کا ہونا شرطِ اوّل ہے — اور اُس انسانِ کامل ﷺ کی زندگی اللہ کی یاد میں اور انسانوں کی خدمت میں گزری۔

عرفانِ الٰہی کے لیے مقامِ انسانیت کو پہچاننا ضروری ہے۔ انسانوں سے محبّت کرو۔ یہی اللہ سے محبّت کا ایک پہلو ہے۔ اللہ کی منزل کے سفر پر انسانوں کے ڈیرے ہیں۔ یہ راستہ انسانوں میں سے گزرتا ہے۔ اللہ کا ذکر کرنے والے، اللہ کے نام پر نثار ہونے والے، اللہ کی راہ

میں شہید ہونے والے، اللہ کی یاد میں بے خبر ہونے والے— سب اللہ کے مظاہر ہیں۔ ان مقامات سے گزرے بغیر توحید کا سفر ممکن نہیں۔ زمین پر رہنے والوں کا خیال رکھو، آسمان والا تمہارا خیال رکھے گا۔ اللہ کے نام پر ہی بعض اوقات اللہ کے بندوں پر ظلم ہوا، اس بات کا خیال رکھا جائے کہ انسانوں کو تنگ نہ کیا جائے۔ انسان کے ذریعے ہی سے منزلیں حاصل ہوتی ہیں۔ وحدت کے جلوے کثرت میں پنہاں ہیں لیکن اس کے سمجھنے کے لیے احتیاط اور استادِ کامل کی ضرورت ہے۔

وضاحت

پچھلا مضمون ''انسان اور انسان'' جب اخبار میں چھپا تو کافی دوستوں کو خوشی بھی ہوئی اور پریشانی بھی، اور شدّت کے ساتھ ایک قاری نے تحریر کیا: ''آپ کا مضمون پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ بھی ہماری طرح انسان دوست محسوس ہوتے ہیں۔ اس زندگی کا مقصد اخلاقیات اور انسان دوستی ہی تو ہے۔ انسان، انسان کے کام آئے تو انسان ہے، ورنہ وہ کیا انسان! دنیا کے مذاہب میں صرف انسانوں کی خدمت اور اخلاقیات کا درس دیا جاتا ہے اور یہ کہ نظامِ عبادات انسان کو خدمتِ انسان پر مائل کرنے کے لیے ٹریننگ کا ایک نظام ہے اور بس''۔

وہ آگے چل کر فرمانے لگے: ''ہم سب لوگ مل کر ''ہیومنزم'' کی تحریک چلائیں اور قوم کو مُلّا کے دِین کی اَذیت سے بچائیں اور اس کام کے لیے آپ ہی موزوں شخص نظر آتے ہیں، مثلاً آپ کے مضمون کا یہ فقرہ کہ جو انسان رب العالمینؐ ہے، وہی انسان رحمت للعالمینؐ ہے''۔ اِن صاحب کے خیال میں یہی تھا کہ انسان کا رب تو انسان ہی ہے اور وہ اس بات کو بھی مانتے تھے کہ انسان میں اشرف انسان رحمت للعالمین ﷺ ہیں۔

اپنے عزیز کی یہ تحریر پڑھ کر مجھے تعجّب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ تعجّب اس بات کا کہ یہ بات تو میں نے لکھی ہی نہیں، انہوں نے کہاں سے پڑھ لی اور افسوس اس بات کا کہ میرے عقیدے کے بارے میں میرے عقیدے کے باوجود لوگوں کو کیا بد عقیدتی ہے۔ میں نے اخبار دوبارہ پڑھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ وہاں اتفاق سے کمپیوٹر کی تیز رفتاری کے باعث ایک لفظ رہ گیا اور

اس سے یہ سارا ابہام پیدا ہوا۔ وہ فقرہ دراصل یوں تھا: ''جو انسان محبوبِ ربّ العالمین ﷺ ہے، وہی انسان رحمت للعالمین ﷺ ہے''۔ یعنی جو انسان سب کائنات کے لیے مجسّم رحمت ہے، وہی انسان تو محبوبِ رب العالمین ﷺ ہے — یعنی ربّ العالمین کو محبوب ہی وہی ذات ہے جو انسانوں کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ انسان کو چھوڑ کر خالی رب کی عبادت کرنے والے عام طور پر کہیں نہ کہیں کھو جاتے ہیں۔ اس میں ایک وضاحت ضرور درکار ہے کہ انسان کی خدمت اور خالی انسان کی خدمت کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔

اخلاقیات کی تعریف کرنا آسان نہیں۔ کسی ایک دَور کا قانونِ اخلاقیات کسی دوسرے دَور میں بد اخلاقی ہو سکتا ہے۔ کسی خاص جغرافیائی حالات کا ضابطۂ اخلاق کسی مختلف جغرافیائی حالات کے ممالک میں کچھ اور صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بہر حال اخلاقیات کے بالعموم قواعد کچھ یوں سے ہیں کہ — لوگوں کی خدمت کرنا — بھوکے کو کھانا کھلانا — کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنا — کسی انسان کو دُکھ یا نقصان نہ پہنچانا — دنیا میں فتنہ و فساد نہ پھیلانا — ماں باپ کی فرمانبرداری کرنا — زمین پر اکڑ اکڑ کر نہ چلنا — علم کی قدر کرنا — ہوس پرستی اور زر پرستی سے اجتناب کرنا — گفتگو میں نرمی اختیار کرنا — کسی انسان سے ایسا سلوک نہ کرنا جو ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ساتھ ہو۔ اخلاق کا سارا سفر مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ بے ضرر ہونے سے شروع ہوتا ہے اور منفعت بخش ہونے پر ختم ہوتا ہے۔ وہ جذبات اور وہ کوششیں جو انسان کے مجموعی ارتقاء کے لیے کی جائیں، اخلاقیات کا حصہ ہیں۔

مہذّب قومیں با اخلاق ہوتی ہیں۔ مہذب قومیں محنتی ہوتی ہیں۔ اپنے حق کے مطابق اپنا معاوضہ حاصل کرتی ہیں اور دوسرے کے حق کے مطابق اُن کی خدمت کرتی ہیں۔ ہر مذہب نے اس مضمون پر وضاحتیں کی ہیں۔ دنیا میں آنے والے مصلحین نے انسان کی خدمت کے مضمون کو واضح کیا ہے۔ اِس حقیقت کو آشکار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ آج رنگ و نسل، فرقہ و قبیلہ، عقیدتوں اور عقیدوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو سکھایا جائے کہ وہ

ایک نفس سے پیدا ہوئے ہیں۔ کثرتِ انسان وحدتِ آدم پر منتج ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو معلّم اور مصلح کہا جاتا رہا ہے۔

ضابطۂ اخلاق انسانوں کی بہتر سوچ کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب ضابطہ بجا اور درست مانا جا سکتا ہے اگر انسانی زندگی دنیاوی سفر تک ہی محدود ہو۔ زندگی صرف ظاہری اخلاقی عمل تک ہی محدود نہیں۔ اس میں بے شمار عنوانات پائے جاتے ہیں اور یہیں سے ایک مفکر اور پیغمبر کا فرق شروع ہوتا ہے۔ پیغمبروں نے دنیا کو یہ بتایا ہے کہ زندگی ظاہری موت تک ہی نہیں، اس میں ایک مابعد بھی شامل ہے۔ جب انسان سے اُس کے اعمال کی بازپرس ہوگی اور اُس کو اُس کے اعمال کے بدلے جزا و سزا نصیب ہوگی۔ مذہب نے یہ بھی بتایا کہ یہ زندگی اور اس زندگی کے لیے بہتر نتائج کو سمجھنے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ وہ یہاں کیسے آیا۔ کیا وہ اپنی مرضی اور اختیار سے آیا؟ اگر اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے آیا ہوتا تو وہ اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے یہاں سلامت رہتا۔ چونکہ وہ یہاں ہمیشہ ٹھہر نہیں سکتا اس لیے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کو لانے اور واپس لے جانے میں کسی اور طاقت کا دخل ہے۔ اگر انسان صرف اپنے ماں باپ کے عمل سے پیدا ہوتا تو ماں باپ کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ چاہیں تو بیٹے پیدا ہوں اور چاہیں تو بیٹیاں پیدا ہوں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ کمزور ہیں، بے اختیار ہیں، مجبور ہیں اور اسی طرح انسان:

ع اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

پیغمبروں نے یہ بتایا کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والے نے ہی انسان کو پیدا فرمایا۔ جس نے چاند ستاروں کو تخلیق فرمایا، انہیں روشن کیا، اُسی ہستی نے انسان کو صورت عطا کی۔ اسے ایک خاص مقصد اور مدت کے لیے اِس جہانِ اجنبی میں بھیجا۔ اِس طاقت کو بالعموم فطرت کہا جاتا ہے۔ پیغمبروں نے یہ بتایا کہ فطرت کو صنعت گری عطا کرنے والی ذات صانعِ عظیم ہے۔ وہ فاطر ہے، زمین و آسمان اور اِن میں ہونے والی تبدیلیوں کا — اور یہ کہ اُس ذاتِ بزرگ کا نام اللہ ہے، اور پیغمبروں نے یہ بھی بتایا کہ اللہ کریم وہ ذات ہے جس کا نہ کوئی ماں باپ ہے اور نہ اس

کی کوئی اولاد ہے، وہ حیّ و قیّوم ہے، جو وقت کی پیدائش سے پہلے بھی موجود تھا اور وقت کے اختتام کے بعد بھی موجود رہے گا۔ یعنی وہ ہر مخلوق اور ہر آغاز سے قبل موجود تھا اور ہر انجام کے بعد بھی اپنی ذات میں قائم و دائم رہے گا۔ پیغمبروں نے یہ بھی بتایا کہ وہ اللہ جس نے زندگی کو تخلیق فرمایا، جس نے انسان کو پیدا فرمایا، اُسی نے انسان کو اِس سفر پر بھیجا اور اُسی نے ایک مقصدِ حیات اور عرصۂ حیات کا حکم دے رکھا ہے۔

پیغمبروں کی بات کو بالعموم باتوں کا پیغمبر مانا گیا۔ وہ منتخب لوگ اخلاقیات میں اِس حد تک ارفع و اعلیٰ تھے کہ انہیں لوگوں نے سند مانا اور پیغمبروں نے یہ بات بڑی وضاحت سے بیان کی، کہ اِس زندگی کو ضابطۂ اخلاق دینا انسان کے بس میں نہیں، کیونکہ انسان ایک محدود سوچ رکھتا ہے، ایک بڑے محدود عرصے کو دیکھ سکتا ہے — یہ تو صرف اسی ذات کا حق ہے جو زندگی اور موت دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

نظامِ عبادات اُسی ذات کے قرب کا ذریعہ ہے اور اِسی طرح اخلاقیات بھی قربِ حق کا ایک ذریعہ ہے۔ اس بات کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ جب ہم نیکی بدی، اچھائی برائی کے تصور کے مطابق عمل کرتے ہیں تو ہم کسی نہ کسی ذات کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ اگر وہ ذات کسی ملک کا بادشاہ ہو تو بادشاہ کی خوشنودی اخلاق کے نام پر ظلم پیدا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک بادشاہوں کے دربار میں بھی بد درباری رہے۔ بادشاہ رحم دل تھا لیکن اس کے مصاحب رعایا پر ظلم ڈھاتے رہے۔ اگر وہ ذات اپنی ذات ہے تو تجربہ بتاتا ہے کہ انسان ایک فاقے کو ٹالنے کے لیے اپنی عزت تک کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اپنی خوشنودی، نفس کی خوشنودی ہو جاتی ہے اور نفس کی خوشنودی اخلاقیات کو چھوڑ دیتی ہے۔ وہ ذات اگر اللہ کی ذات ہو تو اِس میں حکومت، مصلحت اور نفس پرستی شامل نہیں ہو سکتی۔ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے نجات دلاتا ہے۔

یہاں پر مذہب کی اخلاقیات اور اخلاقیات کے "مذہب" میں فرق آتا ہے۔ صرف

اخلاقیات کا سفر محدود سفر ہے۔ اخلاقیات کا مذہب، مذہب ہی نہیں، یہ ہر آدمی اور ہر انسان کا اپنا اپنا مذہب ہو جاتا ہے۔ مذہب کی اخلاقیات ہر دَور کے لیے، ہر زمانے کے لیے ایک خوبصورت نتیجہ حاصل کرتی ہے۔ اس بات کی وضاحت یہ ہے کہ مذہب دراصل اخلاقیات میں الٰہیات کا شامل ہونا ہے۔ ہم جوابدہی کے تصور کے مطابق، اللہ کے حکم کے مطابق، نظامِ اخلاقیات پر کاربند رہیں تو انسان، انسان کے قریب آسکتا ہے اور انسان اللہ کی خوشنودی حاصل کر لیتا ہے۔

دنیا میں جتنے بھی مصلحین آئے ہیں، اُن میں سب سے بڑا، معتبر اور معزز نام حضورِ اکرم ﷺ کا ہے۔ آپ ﷺ پوری کائنات کے انسانوں کے لیے معلّمِ اخلاق ہیں۔ ایک طرف تو آپ ﷺ خدا کے انتہائی قریب ہیں اور ایک طرف آپ ﷺ انسانوں کے بہت نزدیک۔ بھوکے کو کھانا کھلایا جاتا ہے اِس بات سے قطعِ نظر کہ وہ یہودی ہے یا کون ہے۔ آپ ﷺ کی رحم دلی کا کیا عالَم بیان کیا جا سکتا ہے! آپ ﷺ نے کسی کو زندگی بھر اَذیّت نہیں دی، کسی انسان سے بدلہ نہیں لیا۔ فتحِ مکہ کے وقت آپ ﷺ نے پوچھا کہ لوگو! تمھیں معلوم ہے کہ میں آج تمھارے کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں، تم سے کیا بدلہ لینے والا ہوں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ آپؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج میں تمھیں وہ بات کہنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ”آج کے دن تمھارے لیے کوئی سزا نہیں“۔ آپ ﷺ کے مثالی اخلاق اور رحم دلی کی کیا بات کی جا سکتی ہے!

آپ ﷺ ایک بار کسی غزوہ سے اپنے رفقاء کے ساتھ واپس تشریف لا رہے تھے کہ آپؐ نے اپنے راستے پر دُور سے دیکھا کہ ایک کُتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی ہے۔ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو حکم فرمایا کہ سفر روک دیا جائے اور راستہ بدل دیا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کُتیا کے عمل میں رکاوٹ آئے اور ڈر کے مارے وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانا چھوڑ دے۔ کُتیا کے بچوں کے ساتھ یہ سلوک عام تو کیا، خاص انسانوں کے بس کی بات بھی نہیں، بلکہ کسی انسان کے بس کی

بات نہیں ہے۔ آپ ﷺ ایسی ذات ہیں، اِس شان کی رسالت رکھتے ہیں کہ آپ ﷺ ہی کا حق ہے کہ آپ ﷺ حکم فرمائیں اور دُنیا کے اخلاقیات کے ماہروں پر حق ہے کہ وہ آپ ﷺ کی اطاعت کریں۔

مزید وضاحت یہ ہے کہ انسان کو پتا ہی نہیں چل سکتا کہ اُس کے لیے کیا اچھائی ہے اور کیا برائی ہے۔ بے شمار لوگوں نے دنیا میں اچھائی سمجھ کر برائی کی ہے۔ یعنی ایک ایسا کام جو بظاہر اچھا ہو اور جس کا نتیجہ بُرا ہو، سرزد ہوتا رہا ہے۔ جس کی مثال جابر حکمرانوں کے دَور سے دی جا سکتی ہے۔ فرعون کا یہ حکم کہ لوگو! تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم میرے سامنے جھکو اور میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں تم پر حکومت کروں۔ کچھ لوگ تو کہتے رہے ہیں کہ سب انسان برابر ہیں اور جب انہوں نے اپنی ذات میں اِس کا ثبوت نہیں دیا تو پھر یہ کہا جاتا رہا کہ سب برابر تو ہیں لیکن کچھ لوگ زیادہ برابر — یعنی حکومت کرنے والے کا حق اور ہے اور محکوم ہونے والے کا حق اور — اور اسی طرح اخلاقیات کے نام پر مصیبتیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انسان اپنے لیے پسند کرے وہ چیز جو اُس کے لیے نقصان دہ ہو، اور ناپسند کرے وہ چیز جو اُس کے لیے فائدہ مند ہو۔ اِس کی عام مثال اُن بچوں کی زندگی سے ملتی ہے جو وقت ضائع کرنے کو پسند کرتے ہیں، حالانکہ اس کا نتیجہ اُن کے لیے مصیبت ہے۔ انسان اپنے لیے آرام پسند کرتا ہے اور آرام طلبی کے ذریعے وہ مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اِس لیے بہتر ہے کہ اپنی مرضی کو تابعِ فرمانِ الٰہی کر دیا جائے۔ اگر الٰہیات کو اخلاقیات سے نکال دیا جائے تو تنہائی کے جرائم، جرائم ہی نہیں رہیں گے۔ مجرم وہ ہو گا جو قانون کی زد میں آئے، اور جو قانون کی نظر سے بچ جائے وہ مجرم ہی نہیں کہلائے گا، لیکن الٰہیات کی شمولیت کے بعد گنہگار، گنہگار ہے، چاہے لوگوں میں نیکوکار ہی کیوں نہ مشہور ہو۔ ایسا انسان بد ہے، چاہے وہ ظاہر داری میں ایک بہت درویش صورت بن کر بیٹھ جائے۔

مزید وضاحت یہ ہے کہ اخلاقیات کا نظام جوابدہ ہے صرف زمانے کو، اور دین میں

اخلاقیات اور اِلٰہیات کا مجموعہ انسان کو جوابدہ کرتا ہے اُس ذات کے آگے جس نے زندگی پیدا کی اور زندگی کو مدعا دیا کہ اے انسانو اور جنات کے گروہ، میں نے تمہیں عبادت کے لیے پیدا کیا۔ اب عبادت کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ نظامِ عمل ہے جس سے انسان انسانوں کی فلاح بھی کر سکے اور تقربِ الٰہی بھی حاصل کر سکے۔ اِس کی اعلیٰ ترین شکل اور مکمل ترین صورت حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ پس اخلاقِ محمدیؐ ہی اخلاق ہے اور شریعتِ محمدیؐ ہی ذریعہ ہے، قربِ حق کا!

اِسلام میں رہبانیت منع ہے۔ خدا کو چھوڑ کر بندوں میں مصروف رہنا بھی رہبانیت کی ایک شکل ہے اوراِنسانوں کو چھوڑ کر عبادت میں مصروف رہنا بھی ایک طرح کی رہبانیت ہے۔ برائی اچھائی کے تصور کے ساتھ اخلاقیات میں الٰہیات کی شمولیت سے جرم اور گناہ کا فرق معلوم ہو سکتا ہے۔ جرم حکومت کے حکم کی خلاف ورزی ہے اور گناہ الٰہیات کے حکم کے خلاف عمل کا نام ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک چیز گناہ ہو اور وہ جرم نہ کہلائی جائے۔ یہیں سے اِس دھوکے کا امکان ہے جو ''ہیومنزم'' کے نام پر کھایا جا تا رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انسان دوستی اور انسان نوازی تو کی جائے لیکن انسان پرستی نہ کی جائے۔ پرستش اللہ کی اور خدمت انسان کی ——یہی ہمارا ''ہیومنزم'' ہے۔

بس! اپنے محترم قاری سے وضاحت کے ساتھ گزارش ہے کہ ہم کسی ''ہیومنزم'' کے نام پر کوئی تحریک نہیں چلا سکتے۔ ہم صرف ایک ہی تحریک مانتے ہیں،وہ تحریک ہے محسنِ انسانیت ﷺ کی عطا کی ہوئی—— کہ انسانوں کو انسان کی خدمت کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف مائل کرو اور یہ کہ اللہ کو اُس کی رحمت کے ساتھ انسانوں پر مہربان ہونے کی گزارش کرتے رہو۔ ہمارے لیے اتنا عمل، اتنا علم اور اتنا ہی اخلاق کافی ہے۔

بچّہ

میں دیکھتا کیا ہوں، کہ ایک بچہ ہے، اکیلا، اُداس — لیکن اُس میں کسی قسم کی گھبراہٹ یا مایوسی نہیں۔ وہ بچوں کی طرح نہ بے تاب ہے، نہ بے چین، اور نہ ہی بے فکر۔ بڑی عجب بات تھی — لیکن وہ بچہ اتنا اکیلا بھی نہیں تھا۔ اُس کے اردگرد ہجوم تھا اور یہ ہجوم بڑے انسانوں کا تھا۔ اِس سارے ماحول میں وہ بچہ اکیلا تھا، کیونکہ اور کوئی بچہ نہ تھا۔ میں یہ جاننے کے لیے کہ وہ کون ہے اور یہ سب کون ہیں، اور یہ میدان کون سا ہے، اس بچے کے قریب گیا اور اِس سے پہلے کہ میں اُس سے کچھ پوچھوں، وہ خود ہی بولنے لگ گیا۔ یہ مزید تعجب کی بات تھی۔ اُس کے انداز سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یا وہ مجھے جانتا ہے یا میں اُسے جانتا ہوں۔ میں نے مزید تجسس کا اظہار کیا تو بچہ بولا: ”بے صبر ہونا اچھی بات بھی نہیں۔ زبان اور کان کے استعمال سے پہلے آنکھوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ دیکھو! یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب لوگ ایک ہجوم ہیں اور سارے کے سارے تنہا ہیں۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں۔ یہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اسی لیے یہ ایک دوسرے کے پاس سے اجنبی اور بیگانے بن کر گزرتے جا رہے ہیں۔ اِن لوگوں کے اندر ایک اور ہجوم چل رہا ہے۔ یہ سب خاموش ہیں لیکن اِن کے اندر کا ہجوم ایک ہنگامہ کھڑا کر رہا ہے۔ اندر کا ہجوم، ہجومِ خیال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سب ایسے ہیں، جیسے یہ سب ہیں — اور ہاں!“ — بچے نے گفتگو جاری رکھی: — ”اچھا! تو تمہارے سوال کا جواب تو دے دوں، کہ میں کون ہوں، یہ کون ہیں، یہ

سب کیا ہے اور یہ کہ، یہ کون سا میدان ہے؟ تم نے اتنے سوال کر دیے کہ مجھے جواب کی مشکل سے دوچار ہونا پڑا"۔

بچے کی باتوں میں کہیں کوئی بچپن کا تاثر نہیں تھا۔ اِس عمر میں وہ ایسے تھا تو ویسی عمر میں کیسا ہو گا، میں سوچنے لگ گیا۔ بچے نے میری حیرت کی پرواہ کیے بغیر اپنا بیان جاری رکھا۔ وہ کہنے لگا: "یہ سب میرے رشتہ دار ہیں، میرے عزیز ہیں، میرے ہی ہیں، میرے ہی تھے۔ کل تک یہ سب میرے ساتھ تھے۔ ہم سب یہاں سے دُور گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے مجھے چھوڑتے چلے گئے، اِس وعدے کے ساتھ کہ وہ جلد واپس آئیں گے، لیکن وہ اِس میدان میں آ کر سب کچھ بھول گئے، بلکہ ایک دوسرے کی پہچان تو کیا، خود اپنی پہچان اور شناخت بھول گئے۔ شاید واپسی کے وعدے اور واپسی کے راستے ہی بھول گئے۔ ان کے اِس دیس میں اب میں اکیلا رہتا ہوں اور میرے ساتھ اِن لوگوں کی یادیں رہتی ہیں۔ ان کی یادیں اب پرانے کھنڈرات میں چمگادڑیں بن کر اُلٹی لٹکتی ہیں۔ وہ صرف رات کے اندھیروں میں نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ بڑے بڑے کشادہ ماحول کو چھوڑ کر آئے ہیں لیکن اِن لوگوں نے مجھے کبھی یاد نہیں کیا۔ اِن کے دل تنگ ہو گئے ہوں جیسے! مَیں مدّتِ بسیار اِن کا انتظار کرتا رہا۔ آخر تھک ہار کر ان کی تلاش میں یہاں آ نکلا۔ یہ میدان، میدانِ خود پرستی ہے، اسے آپ دولت اور شہرت کے حصول کی "تمنا گاہ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ان لوگوں نے اپنے قد بڑھا لیے ہیں۔ اپنے لہجے بدل لیے ہیں۔ اپنے دِل تک سے دستبردار ہو چکے ہیں، یہ لوگ۔ یہ مشینوں اور کمپیوٹروں پر کام کرتے کرتے خود بھی کمپیوٹر ہو گئے ہیں۔ یہ سب مجھے دیکھتے ہیں، لیکن پہچانتے نہیں۔ یہ لوگ میری آواز اور پکار سنتے ہیں لیکن اِن کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں۔ یہ سب کبھی کبھی مجھے یاد بھی کرتے ہیں لیکن مشینوں نے اِن سے احساس چھین لیا ہے۔ یہ اپنے قد سے نکل کر اپنے اصل سے کٹ گئے ہیں"۔

بچہ اپنے بیان کے جادُو میں مجھے لپیٹتا جا رہا تھا اور میں ایک بچے کے ہاتھوں بے بس

ہونے کی ندامت کو چھپانے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھا کہ بچہ مجھ سے مخاطب ہوا:
''تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو کہ میں نے تمھیں سامع بنا دیا۔ یہ اس لیے کہ تم ابھی اپنے قد سے باہر نہیں نکلے۔ تم ابھی تھوڑا تھوڑا زندہ ہو۔ میرے اور ان لوگوں کے درمیان صرف تم ہی ایک پُل کا کام کر سکتے ہو۔ تم میری بات سنتے جاؤ کیونکہ اب اس کے سوا تمھارے پاس کوئی چارہ نہیں۔ ہاں! تو یہ لوگ، اپنی آبادیاں ویران کر کے آنے والے، یہاں کون سی آبادی میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ شاید مر چکے ہیں لیکن اِن کے پاس اپنی موت کی خبر دینے کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔ یہ بڑی اَذیّت اور گمنامی میں مرے ہوں گے — لیکن نہیں! یہ مرے نہیں — یہ تو صرف اور صرف موت کے انتظار میں زندہ ہیں۔ اِن کا زیادہ حصہ مر چکا ہے لیکن سانس زندہ ہے۔ اِن کا احساس مر چکا ہے، اِن کا دل مر چکا ہے، اِن کی یادداشت مر چکی ہے، اِن کا ماضی مَر گیا، اِن کا مستقبل بھی مَر گیا۔ اِن کا حال بدحال ہے۔ اِن کی سماعت بہری ہو گئی ہے۔ اِن کی آنکھوں کے آگے بینائی ہی کا پردہ آ گیا ہے۔ آوازوں کی کُہر میں اِن کی گویائی ڈوب گئی ہے۔ یہ سب لوگ کسی کے نہیں ہیں، یہ اپنے بھی نہیں ہیں۔ یہ محبّت نہیں کر سکتے۔ یہ صرف مقابلہ کر سکتے ہیں — اور آخری مقابلہ، موت کا مقابلہ ہے۔ یہ لوگ، ذرا غور سے دیکھو! — یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ صرف ''وقت'' کھاتے جا رہے ہیں اور وقت پورا کر رہے ہیں اور پھر اِن کا وقت ختم ہو جائے گا — لیکن نہیں، اِن کو جلد موت نہیں آئے گی۔ اِن کے پاس بڑے بڑے ہسپتال ہیں، بڑے انتظامات ہیں۔ یہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ کئی کئی مہینے، کئی کئی سال بستر پر زندہ رہتے ہیں۔ یہ ہزار قسم کی نالیاں لگا لیتے ہیں اور موت سے چھپ کر خاموش لیٹے رہتے ہیں کہ کسی کو خبر تک نہ ہو۔ یہ بڑے لوگ بن گئے ہیں۔ وہ دیکھو! وہ آدمی جو ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ ہم لوگ کون ہیں۔ وہ اپنا ہی ہے، وہ بہت قریبی تھا۔ وہ قریب آنا چاہتا ہے، لیکن اُس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ قریب آ سکے۔ وہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کا غلام ہو چکا ہے۔ اُس کے پاس اپنی مرضی سے چلنے پھرنے تک کا اختیار نہیں۔ وہ ایک صاحبِ مرتبہ آدمی

ہے۔ اُس کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے"۔

بچہ فسونِ کلام سے مجھے مکمل گرفتار کر چکا تھا۔ میں نے اس سے آزاد ہونا چاہا۔ میں نے چاہا کہ اِس کی باتوں کو سُنا اَن سُنا کر کے بھاگ جاؤں۔ بچہ بولا: "تم مجھ سے آزاد نہیں ہو سکتے، تم بھاگ نہیں سکتے۔ تم میرے حلقۂ تاثیر میں ہو۔ یہ دیکھو! تم خود کیا ہو۔ تم غور کرو۔ تم میری طرح بنتے جا رہے ہو۔ تم خود ایک بچہ ہوتے جا رہے ہو۔ لو! یہ دیکھو! تم میرے جیسے ہو گئے۔ لو! تم تو مَیں ہی ہو گئے۔ اب میری کیا ضرورت!"

یہ کہہ کر بچہ غائب ہو گیا۔ میں نے دیکھا اب اِس میدان میں مَیں اکیلا بچہ تھا۔ میں خود ہی پکار کر کہہ رہا تھا: "آؤ! ہم لوٹ چلیں۔ آؤ! ہم ایک بار پھر عہدِ کہن تازہ کریں۔ آؤ! ہم سب "ہم" بن جائیں۔ آؤ! تازہ ہواؤں کی طرف۔ مشینوں کو مشینوں کے کام پر لگا کر آؤ بھاگ چلیں۔ آؤ! ہم قدرت کے نظاروں کے قریب ہو جائیں تاکہ ہم صداقت کے قریب ہو جائیں۔ آؤ! چار دن کی زندگی میں زہر گھولنا بند کر دیں۔ آؤ! اَذیّت دینے اور اَذیّت لینے کے اَذیّت ناک عمل سے توبہ کریں۔ آؤ — آؤ —! گزرے ہوئے زمانوں کو پھر سے یاد کریں۔ آؤ! کہ ابھی تھوڑا سا وقت باقی ہے۔ آؤ! گزشتہ سے پیوستہ ہو جاؤ۔ آؤ! زندگی سے دُکھ کم کریں۔ آؤ! اپنی بجائے دوسروں کے لیے زندگی گزاریں۔ آؤ! فریادی کی فریاد سنیں۔ آؤ! چمگادڑوں کو آزاد کر دیں اور ویران زمانے آباد کر دیں۔ آؤ! بجھے ہوئے چراغ روشن کر دیں۔ آؤ! — آؤ، کہ معاف کر دیں ایک دوسرے کو۔ فتح کی سنّت پوری ہو گئی، عام معافی کی سنّت ادا کریں۔ آؤ! ایک بار پڑھا ہوا کلمہ پھر سے پڑھیں۔ آؤ! حضور اکرم ﷺ کی اُمّت کے ہر فرد کو خوشی عطا کریں۔ آؤ! دوسروں کی زندگی اور اپنی عاقبت خراب ہونے سے بچائیں۔ آؤ ساتھیو! — لیکن تم کیسے ساتھی ہو، تم ساتھ ہی نہیں دیتے۔ آؤ! ایمان کی روشنی تلاش کریں۔ آؤ! محبّت کے نخلستان آباد کریں۔ آؤ کہ ہم سب ایک ہی ندی کے دھارے ہیں۔ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں۔ بند کرو ذاتیات — بند کرو جھوٹ کو اخبار کی پذیرائی دینا۔ بند کرو ایمان فروشی کے مکروہ

کاروبار۔ بند کرو اپنی خواہشات کے بے ہنگم پھیلاؤ کا بے مقصد و بے ترتیب سلسلہ۔ بند کرو ایک دوسرے کو بدنامیوں کے بازاروں کی رُسوائی بنانے کا عمل۔ بند کرو کہ تم رُوبرو لائے جانے والے ہو، اُس دن، اُس مالک کے رُوبرو، جس کے سامنے تم جھوٹ نہ بول سکو گے اور پھر تمہارے سر سے ستّار العیوبی کی چادر اُتار دی جائے گی۔ تم کیسے نظر آؤ گے اُس دن، جب عمل تبدیل کرنے کا موقع نہ دیا جائے گا—جب توبہ کا لفظ تو ہو گا لیکن اُس کے معنی نہ ہوں گے—وہ دِن بہت دُور ہے—یہی تو ہے تمہاری ناعاقبت اندیشی!"

ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ آواز آئی: "بس اَب لوٹ جاؤ اِس ماحول سے—یہ تو عالمِ خواب ہے۔ تم کیا زور لگاتے جا رہے ہو"۔ بس پھر کیا تھا، خواب سے بیداری کے بعد پہلا کام یہ ہوا کہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ میں پورا ہی تھا۔ شکر ہے کہ میں بچہ نہ رہا—لیکن میں ابھی تک سوچ رہا ہوں کہ وہ کون تھا اور میں کون تھا—اور یہ سب کیا تھا۔ کیا یہ واقعی محض خواب تھا؟

جھڑکی نہ دو___!

جھڑکیاں دینے والا، رعب جمانے والا، دھمکیاں دینے والا، بھول چکا ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان ہے۔ انسان کو انسانوں پر رعب جمانے اور انہیں جھڑکی دینے کا کوئی حق نہیں۔ یہ نقلی استحقاق صرف غرورِ نفس کا دھوکا ہے اور غرور کسی انسان میں اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ بد قسمت نہ ہو۔ نصیب والے، قسمت والے ہمیشہ عاجز و مسکین بن کر رہے___وہ کسی مرتبے پر فائز ہوئے، تب بھی انکسار سے کام لیتے رہے۔ مغرور بادشاہ، فرعون کی عاقبت کے وارث ہوتے ہیں۔ مسکین سرفراز رہتا ہے___وہ سدا بہار ہے۔ وہ دولت اور حکومت کو امانت سمجھتا ہے، مالک کی عطا کردہ عنایت___وہ مالک جو اعلان فرماتا ہے کہ وہ اصل مالک ہے، ملک کا مالک___جسے چاہے ملک عطا کرتا ہے اور جسے چاہے معزول فرماتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ بیلٹ باکس ہمارے لیے قوّتِ نافذہ ہے۔ اس لیے ہم بیلٹ بکسوں کے ساتھ کھیل کرتے رہتے ہیں اور پھر___قدرت ہمارے ساتھ کھیل کرتی ہے اور جب ہم معزول ہو جاتے ہیں تو ہم اپنی آتش نوائیوں اور شعلہ بیانیوں کو اپنے لیے مرتبہ ساز مان لیتے ہیں اور اس طرح ہم بھول جاتے ہیں کہ اصل طاقت کیا ہے اور اس کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟

بہرحال بات جھڑکی سے شروع ہوئی تھی۔ یہ مالک کا حکم ہے کہ سائل کو جھڑکی نہ دو ___اب سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ مالک غریب کے ساتھ ہے، سائل کے ساتھ ہے، ضرورت مند کے ساتھ ہے۔ ہر وہ انسان جو ضرورت مند ہے اور ضرورت پوری کرنے کے لیے آپ کے

تعاون کے لیے سوال کرتا ہے، سائل ہے۔ سائل کی ضرورت پوری کرو یا نہ کرو، اسے جھڑکی تو نہ دو۔ یہ حکم ایک بڑا راز ہے۔

کہتے ہیں اور کہنے والے چشم دید گواہ ہیں کہ ایک دفعہ ایک بہت عظیم انسان، بہت پاکیزگی میں رہنے والا درویش اپنے معتقدین کے ساتھ نمازِ فجر ادا کر کے مسجد سے باہر آ رہا تھا، بلکہ تشریف لا رہے تھے۔ آپ نے ایک خاکروب کو دیکھا جو کوڑا وغیرہ اپنے ٹوکرے میں ڈال کر اسے اٹھا کر اپنے سر پر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وزن زیادہ تھا۔ بزرگ نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے ٹوکرے کو پکڑ کر اُس کی مدد کی — مریدوں نے تو بہت ہی شرمندگی و ندامت کا اظہار کیا اور خاکروب کو کوسنے لگے۔ کہتے تھے: ''پیر صاحب! آپ ہمیں حکم فرما دیتے۔ آپ نے خود کیوں زحمت فرمائی''۔ بزرگ بولے: ''بیو قوفو! — بات سمجھے نہیں ہو — یہ اللہ کا فضل ہے کہ اُس کو اُس حال میں رکھنے والے نے ہمیں اِس حال میں رکھا ہوا ہے۔ وہ ضرورت مند تھا، ہم نے ضرورت پوری کی۔ اللہ کا شکر ہے، اور تم لوگ ضرورت بھی پوری نہیں کرتے اور جھڑکی بھی دیتے ہو۔ توبہ کرو اور بے نیاز اللہ سے ڈرتے رہو — ہماری پیریاں اور فقیریاں بے کار ہیں اگر محروم اور محتاج کے کام نہ آئیں''۔

بات یہ کھلی کہ ہم لوگ اُسی سائل کو جھڑکی دیتے ہیں جسے ہم کچھ نہیں دیتے۔ ایک تو اُس کی مدد نہیں کرتے، دوسرے اُس کی تذلیل کرتے ہیں اور تیسرے اُس غرور کا اظہار کرتے ہیں جو ہمیں اپنے مرتبے پر ہے۔ خاک ہو جائے وہ مرتبہ، جو دوسروں کے لیے مفید نہ ہو — افسوس ہے اُس علم پر، جو دوسروں کے کام نہ آئے — اور پناہ مانگو اُس علم سے، جو اپنے بھی کام نہ آئے۔ وہ دولت جو غریب کو جھڑکی دینے کا ذریعہ بنتی ہے، ایک عذاب ہے — لعنت ہے وہ طاقت جو کمزور کی حفاظت نہیں کرتی بلکہ اسے ڈراتی ہے — جہنم کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔

سائل بڑے راز کی بات ہے — وہ بظاہر کچھ مانگنے کے لیے آتا ہے لیکن دراصل وہ

کچھ دینے کے لیے آتا ہے — ہم پہچان نہیں سکتے۔ ہم غافل ہوتے ہیں — مغرور ہوتے ہیں — اس لیے اس پیغام سے محروم رہتے ہیں جو صرف سائل کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔

ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک سائل ہمیں ملا — یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ڈپریشن سے ہماری نئی نئی آشنائی ہو رہی تھی — ہم ایک شام، ایک اُداس شام، ایک باغ میں تنہا غور کر رہے تھے — سورج ڈوب چکا تھا اور ڈوبنے والا اپنے بعد فضا میں ایک گہری سرخی چھوڑ چکا تھا — اتنے میں ایک سائل میری طرف آتا ہوا دکھائی دیا — میں اُسے دیکھے بغیر ہی اُسے ناپسند کرنے لگا — وہ اِس بات سے بے نیاز کہ میں اُس کی طرف متوجہ نہ تھا، بولا: ”سائل کی طرف، آنے والے کی طرف توجہ تو کرنی چاہیے“۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور کچھ سمجھے بغیر پوچھا: ”آپ کیا چاہتے ہو؟“۔ وہ بولا: ”ہمارا تو وہی سوال ہے پرانا — کچھ مدد کرو!“ میں اُس کی شخصیت اور اُس کے اندازِ گفتگو کے اثر میں آتا چلا گیا — میں نے اُس کی مقناطیسی شخصیت کے رعب میں آکر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی احتیاط سے ایک پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور اُس سے کہا: ”بابا جی! قبول فرماؤ — ؟“ بابا مسکرایا اور بولا: ”بیٹا! اِسے تو میں قبول کرتا ہوں لیکن میری بات غور سے سنو — میں بھیجا گیا ہوں تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ تم جس کو پریشانی سمجھ رہے ہو، یہ تو ایک اچھے دَور کا آغاز ہے — جب یوسف علیہ السلام کنویں میں گرائے گئے تو اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ نئے سفر کا آغاز ہے — پیغمبری کا سفر، بادشاہت کا سفر۔ جہاں ایک دَور ختم ہوتا ہے، وہیں سے دوسرے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ کبھی مایوس نہ ہونا — اور سائل کو کبھی جھڑکی نہ دینا۔ سائل محسن بھی ہوتا ہے، معلّم بھی — !“

بابا بولتا جا رہا تھا اور لفظوں کے چراغ مَن میں اُجالا پیدا کر رہے تھے — میرے بارے میں کچھ باتیں ایسی فرما رہے تھے جو صرف میں ہی جانتا تھا — میں چاہتا تھا کہ وہ یونہی بولتے چلے جائیں — لیکن وہ اچانک چپ ہو گئے۔ میں نے کہا: ”مزید ارشاد!“ بولے: ”نہیں!“ میں نے کہا: ”کیوں؟“ بولے: ”جس طرح تیری جیب میں پڑے ہوئے دو سو روپے میں سے

میرے لیے صرف پانچ روپے تھے، اِسی طرح میرے علم میں سے تمہارا اتنا ہی حصہ تھا—!"
میں نے کہا: "آپ سے پھر کب ملاقات ہو گی—؟" بولے: "ہو گی، ضرور ہو گی۔ ہاں تم اپنا پتہ تو بتاؤ—ہم تو سیلانی لوگ ہیں"۔ بابے نے جیب سے سنہری رنگ والا پوسٹ کارڈ سائز کا ایک کارڈ نکالا۔ میں نے اپنا پتہ لکھ دیا۔ دستخط کر دیے۔ روشنی ختم ہو چکی تھی—بابے نے کہا: "اچھا بیٹا! اَب میرے پیچھے نہ آنا۔ میں جا رہا ہوں"۔ بابا ایک طرف کو ہو لیا—لیکن میں اس کے پیچھے چل پڑا—مگر کہاں تک—بابا غائب ہو چکا تھا—ڈپریشن ختم ہو چکا تھا—نئے عنوان ظاہر ہو رہے تھے—بابا فقیر سرشار کر گیا—!

بات ختم ہو گئی، لیکن بات ختم نہیں ہوئی—سقوطِ ڈھاکہ پر بھی پھر ڈپریشن کا شکار ہوا—ایک شام نمازِ مغرب کے بعد مسجد سے نکلے—گہری شام ہو چکی تھی—میں نے دیکھا کہ میرے آگے آگے ایک بزرگ صورت انسان چل رہا تھا۔ لمبے بال—ننگے پاؤں—ہاتھ میں تسبیح—میں اُس کے پیچھے ہو لیا—کچھ دُور جا کر وہ اچانک رک گیا اور پیچھے مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا: "میرے پیچھے کیوں آ رہے ہو؟—میں نے پہلے بھی کہا تھا، میرے پیچھے نہ آنا۔ تم باز نہیں آتے—اچھا بولو! کیا تکلیف ہے—؟" میں نے کہا: "کچھ نصیحت ہی کریں"—بولا: "سائل کو جھڑکی نہ دیا کرو—ہم لوگ محسن ہیں، معلّم ہیں—ڈپریشن کی ضرورت نہیں—تم ہم سے زیادہ فکر مند ہو؟—سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ اِتنے میں بابے نے جیب سے ایک کارڈ نکالا اور کہا: "مجھے اِس پتہ پر پہنچا دو"—میں نے کارڈ دیکھا—میرا ہی نام، میرا پتہ اور میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا—دستخط میرے ہی، بقلم خود—میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی—آج سے پندرہ سال پہلے والا بابا میری نظروں کے سامنے آیا—لیکن یہ بابا، وہ نہیں تھا۔ قطعاً مختلف—میں اور حیران ہوا—بابا بولا: "حیران ہونے والی کوئی بات نہیں—ہمارا چولا بدلتا رہتا ہے—ہم صرف سائل ہیں—محسن، معلّم—ہماری شکل و صورت کچھ بھی ہو، ہم وہی ہیں۔ تمہیں عطا کرنے کے لیے آتے ہیں—ہماری طرف غور کیا کرو—ہم پیسے مانگتے ہیں تو صرف اِس لیے کہ تم بخیل

ہونے سے بچ سکو—ہم تم کو سخی بنانے کے لیے آتے ہیں— سخی—اللہ کا دوست صرف سائل کے دَم سے—سائل کو جھڑکی نہ دو"—بابا پھر غائب ہو گیا۔ ڈپریشن ختم ہو گیا— اندھیرے میں روشنی پھیل گئی—مایوسیوں میں اُمّید کے چراغ جل اُٹھے—کارسازِما، بہ فکرِ کارِما—!

آج تک وہ سائل میری نظروں کے سامنے ہے— معلّم— محسن— بخیل کو سخی بنانے والا— غیر اللہ کو حبیب اللہ بنانے والا— جھڑکی کے لیے نہیں، اَدب و اِحترام سکھانے کے لیے آتا ہے—ہمارے دروازے پر اللہ کی رحمت دستک دیتی ہے اور کہتی ہے— خبردار! غافل نہ ہونا!!

کہانی

یہ جیون ایک کہانی ہے اور یہ کہانی بڑی پرانی ہے۔ پہلے بچے کے ساتھ ہی کہانی پیدا ہو گئی اور پھر کہانی سے کہانی — اور پھر کہانیاں ہی کہانیاں — ایک جال ہے کہ بچھا ہوا ہے۔ کچھ پوری کہانیاں ہیں اور کچھ ادھوری — کسی کا آغاز نہیں، کسی کا انجام نہیں — !

کہانی سنانے والا کوئی نہ ہو، تو بھی کہانی خود کو سناتی رہتی ہے۔ سامع نہ بھی ہو، تو بھی کہانی جاری رہتی ہے۔ وجودِ آدمؑ سے پہلے بھی کہانی تھی اور تخلیق آدمؑ کے بعد تو کہانی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ فردوسِ بریں کا قصّہ، طاغوت، ابلیس اور پھر لغزشِ آدمؑ، دانۂ گندم، پھر سفر سُوئے زمیں، فردوسِ گم گشتہ — اور پھر قیام و قرار فی الارض — ایک مکمل کہانی!

اِس کے بعد عروجِ آدمِ خاکی — سب کہانی ہے۔ چھن جانے کے بعد جس مقام کی دوبارہ تلاش شروع ہو جائے، وہی مقام انسان کا بہشت ہے۔ انسانوں کی اقسام کی طرح کہانیوں کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔ شاید ہر آدمی کے لیے الگ قسم ہے۔ رونے والوں کے لیے المیہ، ہنسنے والوں کے لیے طربیہ، سیاحت کا شوق رکھنے والوں کے لیے سفر نامے، سیاحت نامے، بہادروں کے لیے رزمیہ، صاحبانِ فکر کے لیے تمثیل نگاری اور علامتی کہانیاں اور کچھ ملامتی کہانیاں۔ مختصر کہانی، طویل کہانی، بامقصد کہانی، بے معنی کہانی، مذہبی کہانی، اخلاقی کہانی، جنسی کہانی، روحانی کہانی، غرضیکہ فانی اور لافانی کہانی — بھول جانے والی کہانی — نہ بھولنے والی کہانی — بس کہانی ہی کہانی ہے۔

کسی علاقے میں جاؤ، وہاں کی علاقائی کہانی — کہیں بھی نہ جاؤ تو تصوّراتی اور تخیّلاتی کہانی — انسان میں جب تک کہانی سننے کا شوق ہے، کہانی رہے گی۔ ہم ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے رہتے ہیں، اپنی اپنی داستان — اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر وہی ایک دفعہ کا ذکر — !

کہانی سننے کا شوق بچپن سے ہی پیدا ہوتا ہے، یا کر دیا جاتا ہے۔ تمام لائبریریاں کہانیوں سے بھری پڑی ہیں۔ سائنس کے اِرتقاء کے ساتھ سائنسی کہانیاں شروع ہو گئیں۔ انسان کہانیوں سے بچ نہیں سکتا۔ انسانی کہانیاں نہ ملیں تو جانوروں کی کہانیاں موجود ہیں، دانائی اور حکمت کے خزانوں کے ساتھ — مثلاً پیاسا کوّا، لالچی کتّا، اتفاق میں برکت، بے وفا دوست اور ریچھ — نادان اور دانا بکریوں کی کہانی، جو کچھ اس طرح سے ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک پہاڑی نالے پر ایک نہایت ہی تنگ پل تھا۔ مشکل سے پاؤں رکھا جا سکتا تھا۔ ایک دفعہ دو نادان بکریاں آمنے سامنے سے پل کے درمیان تک آ گئیں۔ جگہ تنگ تھی۔ دونوں نہیں گزر سکتی تھیں۔ واپس جانا بھی مشکل تھا۔ ایک دوسرے کو کوسنے لگیں کہ تم نے میرا راستہ روکا ہے، جھگڑا شروع کر دیا۔ باتوں باتوں میں سینگوں کا استعمال شروع ہو گیا اور پھر — دونوں دھڑام سے نیچے گر گئیں۔ کچھ دیر کے بعد دو دانا بکریاں بھی آمنے سامنے یوں درمیان میں آ گئیں۔ اُنہوں نے غصہ کرنے کی بجائے صورتحال کا جائزہ لیا۔ سینگوں کی بجائے عقل سے کام لیا۔ ایک بکری بیٹھ گئی اور دوسری نے اس کے اوپر سے گزر کر اپنی راہ لی — دونوں بچ گئیں۔

وہ دن گئے جب بچوں کو سکولوں میں "گلستان" اور "بوستان" کی کہانیاں پڑھایا کرتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بااخلاق معاشرہ پیدا ہوتا تھا، اور آج جو کچھ ہو رہا ہے، ویڈیوز کی کہانیوں کا اثر ہے۔ جنسی تشدد اور دہشت گردی پہلے فلموں میں دکھائی جاتی ہے اور پھر سماج میں اسے دیکھا جاتا ہے۔ جب ذہن پختہ ہو جائے تو اِصلاح کا اِمکان کم ہو جاتا ہے۔

کہانی کے لیے ضروری ہے کہ اِس میں ایک مرکزی خیال ہو، مثلاً پاکستان کی کہانی

میں مرکزی خیال اقبالؒ کا ہے۔ ایک مرکزی کردار بھی ہونا چاہیے، جیسے قائدِ اعظمؒ، ایک آغاز بھی ہو، جیسے ۱۹۴۷ء۔ اِس میں ایک ماحول بھی ہونا چاہیے، ہمارا ماحول۔ اگر اخبارات کچھ نہ بیان کریں تو کہانی میں ایک کلائمیکس بھی ہونا چاہیے۔ کلائمیکس یا نقطۂ عروج اُس مقام کو کہتے ہیں جس کے بعد یہ مقام نہیں رہتا۔ عروج ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ ہر حکمران اپنے دَور کو عروج کا نقطہ سمجھتا ہے، یہ جانے بغیر کہ عروج کے بعد زوال ہوتا ہے۔ شکر ہے پاکستان نے ابھی عروج حاصل کرنا ہے۔ ہم ابھی راہگزر میں ہیں۔

عروج کے حوالے سے ایک کہانی مشہور ہے۔ کہتے ہیں، کسی خطّے نے عروج حاصل کر لیا۔ یہ بہت قدیم زمانے کا ذکر ہے۔ مالک نے دیکھا کہ بندہ فطرت میں مداخلت کر رہا ہے، جبریلؑ کو حکم دیا کہ بستی کو اُڑا دیا جائے۔ عزرائیلؑ سے نہیں، جبریلؑ سے کہا گیا۔ جبریلؑ نے عرض کی کہ اے مالک الملک! اجازت ہو تو میں اِن لوگوں کے علم کا معیار دیکھ لوں۔ اجازت مل گئی۔ وہ گئے اور ایک گڈریے کو دیکھا کہ وہ جنگل میں بھیڑیں چرا رہا تھا۔ جبریلؑ انسانی لباس میں اس کے پاس پہنچے اور بولے: ”بھائی کچھ حساب لگانا جانتے ہو“۔ وہ بولا: ”ہاں! لیکن بہت کم“۔ جبریلؑ نے کہا: ”حساب لگاؤ! اِس وقت جبریلؑ کہاں ہے؟“ گڈریے نے چھڑی سے ہی زمین پر دو چار لکیریں کھینچیں اور کہا: ”آسمان پر تو نہیں ہے“۔ جبریلؑ نے کہا: ”مزید حساب لگاؤ“۔ اُس نے حساب لگایا اور بولا: ”زمین پر بھی نہیں ہے“۔ جبریلؑ نے مزید حساب کے لیے کہا۔ وہ بولا: ”بھئی! یا تم جبریلؑ ہو یا مَیں — مَیں تو نہیں ہوں — بس تم ہی جبریلؑ ہو“۔ اِس کے بعد بستی کو نابود کر دیا گیا۔

مولانا رومؒ نے کہانیوں کے روپ میں معرفت کے مسائل حل کیے۔ وہ علمِ باطن اور علمِ رُوح کے اظہار کے لیے کہانیاں لکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر شوق مر جائے تو انسان کے زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ عشق کو مولانا ”طبیبِ جملۂ علّت ہائے ما“ کہتے ہیں۔ اِن کی ہر کہانی پُر مغز و پُر سوز ہے۔ وہ درسِ باطن دے رہے ہیں اور کہانیاں بیان کر رہے ہیں۔ نکتے کھولتے چلے

جاتے ہیں اور بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی ہے۔ اقبالؒ کو علم کا خزانہ پیرِ رومیؒ کے فیض سے حاصل ہوا۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ مریضِ محبّت کو اگر چارہ ساز سے نسبتِ قلبی نہ ہو تو سب چارہ سازی حجاب ہے۔ محبوب کا ہاتھ ہی دستِ شفا ہے۔ یہی عالم قوموں کا ہے۔ اگر قائد محبوب ہو تو ہر نسخہ شفا ہے، ورنہ بے تعلق ہجومِ چارہ گراں مرض کے اضافے کا باعث بنتا ہے۔ ہم لوگ چارہ سازوں کے چنگل میں ہیں۔ قائدین کے نرغے میں آگئی قوم ــ خدا لیڈروں سے بچائے! خدا لیڈر سے ملائے ــ!!

بہر حال کہانیاں تعلیم و تبلیغ کے لیے بھی موزوں ہیں اور عرفانِ ذات کے لیے بھی۔ سیف الملوک کہانی ہے، ایک شاہ زادے اور ایک پَری کی ــ لیکن یہ داستان ہے خود آگہی کی منزلوں کی، یہ سیر ہے وادئ حیرت کی، یہ بیان ہے فراق کے دَرد کا، بارگاہِ حسن میں دِل کی فریاد کا۔ میاں محمد صاحبؒ نے رنگ بھر دیے ایک فرضی کہانی میں۔ اِس میں قدر دانوں اور قدر شناسوں کے احسانات کا ذکر ہے، محسنوں کا فیض ہے اور شکر کا اظہار کہ

ع　　مَیں گلیاں دا رُوڑا کُوڑا، محل چڑھایا سائیاں

یعنی سخی نے ہمیں کیا سے کیا کر دیا ــ! گلیوں سے نکال کر محَلوں میں بٹھا دیا ــ وہ اگر چاہے تو قطرہ بھی سمندر ہو جائے۔ بڑے عرفان کی داستان ہے، بڑے درجے کا بیان ہے ــ کہانی ہے ــ لیکن معرفت کی داستان!!

کہانی کہانی کے روپ میں اصل کہانی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم داستانیں سنتے سناتے کہیں خود بھی کسی داستان کا حصہ نہ بن جائیں۔ ہمیں ہر لمحہ بیدار رہنا چاہیے۔ ہمارے ہاں بھی بڑے جادو بیان داستان گو موجود ہیں۔ غریبوں کو اَمیر ہونے کا کاذب مژدہ سنانے والے داستان گو، غریبی میں مزید اضافہ کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اور غریب دیکھتا رہ جاتا ہے ــ بیچارہ! آسمانوں کے تذکرے سنتے سنتے انسان بھول جاتا ہے کہ اُس کے پاؤں زمین پر ہیں۔

حضرت داتا گنج بخشؒ نے بھی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن کے اپنے انداز ہیں۔ وہ

توحید، رسالت اور عرفان کے بارے میں وضاحتیں دینے کے لیے کہانی پیش کرتے ہیں، مثلاً ایک دفعہ انہوں نے اپنے شیخ سے پوچھا: ”جناب توحید کیا ہے؟“ شیخ نے کہا: ”پھر کبھی بتاؤں گا“۔ کچھ ہی دنوں بعد سفر حج کا آغاز ہوا۔ دورانِ سفر ایک دن نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر یہ لوگ بیٹھے ہی تھے کہ مغرب سے ایک سوار آیا۔ داتا صاحبؒ کے شیخ نے تعظیم کی، استقبال کیا۔ آنے والے نے کان میں کچھ کہا، لیکن شیخ نے معذرت ظاہر کی۔ سوار واپس چلا گیا۔ داتا صاحبؒ نے پوچھا: ”سرکار! یہ کون تھے؟“ انہوں نے کہا: ”یہ تیرے سوال کا جواب تھا کہ توحید کیا ہوتی ہے“۔ داتا صاحبؒ نے وضاحت کی اِلتجا کی۔ شیخ نے کہا: ”یہ خضرؑ تھے۔ کہتے تھے کہ اگر مناسب سمجھو تو میں تمہارے ساتھ حج کے سفر کے لیے ہمراہی اختیار کروں۔ میں نے کہا، نہیں — کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں حج کے خیال سے غافل ہو کر تمہارے خیال میں مصروف ہو جاؤں“۔ بس توحید یہی ہے کہ وحدتِ مقصد قائم رہے۔ ایک مقصد سے دوسرا مقصد نہ نکالنا چاہیے، خواہ دونوں مقاصد ہی نیکی کے ہوں۔ نیکی اور ہے، توحید اور —!!

ایک اور کہانی بھی آپؒ نے لکھی۔ ایک سفر میں داتا صاحبؒ اپنے چند ساتھیوں سمیت سفر پر روانہ تھے۔ حج ہی کا سفر تھا۔ ایک آدمی کو قافلے کا اَمیر بنا دیا گیا تھا۔ راستے میں قزاقوں نے سب قافلے کو روک لیا اور اپنے سردار کے رُوبرو پیش کر دیا۔ سردار نے کہا: ”جو کچھ ہے، حاضر کر دو“۔ سب نے سب کچھ حاضر کر دیا۔ سردار نے پھر کہا: ”اِن سب کی تلاشی لو —“ تلاشی لینے پر اَمیرِ قافلہ کے پاس خفیہ جیب میں سے کچھ اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ ڈاکوؤں کے سردار نے حکم دیا کہ اِسے قتل کر دیا جائے۔ داتا صاحبؒ نے مداخلت کی اور کہا: ”یہ نہیں ہو سکتا، وہ ہمارے اَمیرِ قافلہ ہیں، ہم یہ برداشت نہیں کریں گے“۔ سردار نے کہا: ”عجیب آدمی ہو — یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سچے آدمیوں کا اَمیر جھوٹا ہو — اسے چھوڑ دو، واپس جانے کے لیے، اور تم اپنا سفر جاری رکھو۔ ہم لوگ ڈاکو نہیں ہیں، ہم تو سرکاری ڈیوٹی والے لوگ ہیں۔ دودھ پانی الگ کرنے والے، حاجیوں کو توکّل کی منزل عطا کرنے والے۔ آئندہ یاد رکھنا، سالارِ کارواں

کے لیے ضروری ہے کہ وہ صادق ہو، امین ہو۔ جھوٹے سالاروں نے ہی تو ملّت کا بیڑہ غرق کر رکھا ہے"۔

جہاں کہانیوں نے باطن روشن کیے ہیں، وہاں کہانیوں نے ہی فسادات پھیلائے۔ ملّتِ اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کہانیوں کا حصہ ہے۔ مثلاً ایک دفعہ ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا: "بھائی! آپ نے وہ کہانی سنی ہے؟" دوسرے نے کہا: "نہیں بھائی! میں نے دُوسری کہانی سن رکھی ہے"۔ بس کہانی ختم ہوگئی، لیکن یہ کیا کہانی ہوئی؟ یہی تو بڑی کہانی ہے کہ ایک آدمی نے ایک کتاب پڑھ لی، وہ ایک فرقہ بن گیا، دوسرے نے دوسری کتاب پڑھ لی، وہ دوسرا فرقہ بن گیا۔ جس نے جو کتاب پڑھ لی، وہ الگ فرقہ بنتا چلا گیا۔ کہانیاں جاری ہیں اور فرقے بننے کا کام بھی جاری ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ہم ایک خدا، ایک رسول ﷺ اور ایک کلمے سے آغاز کر رہے تھے اِسلام کا۔ اب تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بن گئے ستّر فرقے۔ کس نے بنائے؟ کون ہے ہم میں سے جو امام حسینؑ کے قافلے میں موجود تھا اور کون ہے جو یزید کے ساتھ موجود تھا؟ ہم سب ناموجود تھے اور کہانیاں جنم لے رہی تھیں۔ قلم چل رہے تھے اور صداقت قلم ہو رہی تھی۔ فرقہ پرستوں کی کہانی درمیان سے شروع ہوئی، اور اسے درمیان میں ہی ختم کر دینا چاہیے۔

یہ بہت کافی ہے کہ ہم کلمۂ توحید کی مرکزیت پر یقین رکھتے ہوئے ملّتِ واحدہ ہو جائیں۔ پاکستان کی کہانی جو اقبالؒ کی بلند خیالی سے شروع ہوئی ہے، اسے بلند اقبالی حاصل ہونا چاہیے — ورنہ —؟ ورنہ کچھ نہیں!!

۩۩۩

آنکھیں

عجائباتِ دہر میں سب سے بڑا اعجوبہ انسانی آنکھ ہے۔ یہ ایک کیمرے کی طرح ہے لیکن اِس کی ساخت میں قدرتِ کاملہ نے کمال دکھایا ہے — یہ چہرے کی زینت ہونے کے ناتے سے بھی انسان کی شخصیت کا طرّۂ امتیاز ہے۔

آنکھیں اِس کائنات کے ساتھ ہمارے رابطے کا ذریعہ ہیں۔ جس ذات نے انسانی آنکھ کو دیکھنے والا بنایا، اُسی نے انسان کے دیکھنے کے لیے ایک خوبصورت کائنات بنائی، رنگارنگ کے جلوے پیدا فرمائے اور اِن جلووں میں اپنی جلوہ گری کے کرشمے دکھائے — !

فنکار، فن کے جلووں میں خود جلوہ گر ہے — آنکھ نہ ہوتی تو کسی رنگ اور کسی روشنی کی کوئی ضرورت و افادیت نہ تھی۔ مشاہدہ جہاں مشہود کی جلوہ گری کا کمال ہے، وہاں یہ شاہد کے اندازِ نظر کا حسنِ بے مثال بھی ہے۔ قدرت نے جس ذوقِ تخلیق کا اظہار بے رنگ زمین میں رنگ دار گل کاری کر کے کیا ہے، اُس کی داد بس چشمِ بینا ہی دے سکتی ہے۔ بس آنکھ والا ہی ترے جوبن کا تماشا دیکھ سکتا ہے — دیدۂ کور تو پھر دیدۂ کور ہی ہے۔

آنکھ آسمان کے کروڑوں ستاروں کو بیک وقت دیکھ سکتی ہے۔ یہ آسمان کو زمین پر اُتارتی ہے۔ یہ دُور کے جلوے قریب لاتی ہے۔ یہ کیا کیا نہیں دیکھتی — یہ سب کچھ دیکھ سکتی ہے، لیکن یہ صرف اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی — خود بینی کے لیے اسے کسی آئینے کی ضرورت ہے — کسی اور کی ضرورت ہے — زمین و آسمان کی وسعتیں اِس کے سامنے آشکار ہوتی ہیں — صرف اپنی ذات مخفی ہوتی ہے۔ اپنی ذات کا سفر کسی اور ذات کے تعاون کے بغیر ممکن ہی نہیں

—یہ وسیلہ ہی خود بینی کے لیے اہم ترین ذریعہ ہے—خود شناسی نہ ہو تو خدا شناسی کا عمل ممکن ہی نہیں—آئینہ ہی آنکھوں کو اپنے باطن میں اُترنے کا راستہ بتاتا ہے۔ اگر آئینہ میسّر نہ ہو تو آنکھ خود کو دہر شناس سمجھ کر غرور میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

آنکھ انسان کو بڑے بڑے کرشمے دکھاتی ہے۔ آنکھ جب محوِ نظارہ ہو تو اِس کی مستی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے—سرشار اور محوِ حیرت آنکھ بار گاہِ حُسن میں دَم بخود ہو جاتی ہے—آنکھ جلوے میں گم ہوتی ہے اور وجود بے حرکت، اپنے آپ سے بے خبر، اپنے گردوپیش سے بے نیاز، گردشِ زمان و مکاں سے آزاد ہو جاتا ہے—زمانۂ انتظار، آنکھوں میں چنار جلنے کا موسم ہوتا ہے۔ موسمِ فراق میں آنکھوں سے انگارے پھوٹتے ہیں۔ دل خون ہو کر اَشکوں کے ساتھ بہہ جانا چاہتا ہے—!

آنکھیں دُور کے منظر کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں—جلوے کی جدائی میں ایک نیا جلوہ پیدا ہو جاتا ہے—ایک متاعِ بے بہا حاصل ہو جاتی ہے—درد کی دنیا، سوز کی دنیا، آرزومندی کی دنیا انسان کو عطا ہوتی ہے۔ آنکھیں انسان کو لبادوں اور نقابوں کے اندر دیکھنے کا شعور عطا کرتی ہیں۔ رونے والی آنکھ قربِ حق کے ذرائع میں سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آنکھیں ہمیں ایک دوسرے کی پہچان کرواتی ہیں—آنکھیں آنکھوں کو پہچان لیں تو بس ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ آنکھوں کا کمال یہ ہے کہ پہلی ملاقات سے پہلے بھی ایک دوسرے کی شناسا ہوتی ہیں—تبھی تو ہم فوراً کہہ اٹھتے ہیں، ہاں یہی ہے وہ نظارہ جس کی تلاش تھی!!

آنکھیں ایک اور انداز سے بھی انسان کی رہنمائی کرتی ہیں اور یہ بہت بڑی رہنمائی ہے۔ آنکھیں جلوے کو دیکھ کر اسے ایک خاص شعور کے ماتحت، جسم کے مختلف حصوں کو ٹیلی کاسٹ کرتی ہیں اور پھر ایک خاص قسم کا انداز پیدا ہو جاتا ہے انسانی زندگی میں—دیکھا ہوا نظارہ ارسال کر دیا جاتا ہے دل کو، دماغ کو، نفس کو، رُوح کو اور قوتِ متخیّلہ کو—آنکھوں کے اِس عمل سے عرفانِ ذات کے دلچسپ سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

اگر نظّارہ دماغ کو ارسال ہو تو انسان حیرت کے سفر پر روانہ ہوتا ہے—اسے

ماہیتِ اَشیاء سے تعارف ہوتا ہے — وہ ہونے اور نہ ہونے کے عمل کو دیکھتا ہے — وہ سفر کرتا ہے اور دیکھتا ہے، وقت کے عبرت کدے میں من مانیاں کرنے والوں کے عبرت ناک انجام کو — وہ دیکھتا ہے کہ گھمنڈ، غرور اور تفاخر سے زندگی بسر کرنے والے کاذب لوگ کس عاقبت تک پہنچے — اُن کے ساتھ کیا ہوا جو دلوں کو زخمی کرتے تھے — وہ زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے تھے، آج زمین کے اندر کس حال میں ہیں — جنہیں حق کی آواز سنائی نہ دیتی تھی، وہ اپنے لیے کیا رسوائی لکھ گئے — ! کہاں گئے دارا و سکندر، کہاں گئے وہ، جو کل تک یہاں تھے؟ آنکھیں کتنے بڑے اَلمیے سے تعارف کرواتی ہیں، کتنے بڑے حادثے کی نقاب کشائی کرتی ہیں — یہ دُنیا ہے، یہاں کوئی نہیں ٹھہر سکا — وقت کا دریا سب کچھ بہا لے جاتا ہے — اس صحرا میں کتنے قافلے گم ہو گئے، کتنے ہی محلات مسمار ہوئے، کتنی بستیاں ویران ہو گئیں، کتنے باغ سوکھ گئے اور کتنے دیار اجڑ گئے — ! آنکھیں ایک منظر کے بعد اور منظر دکھاتی چلی جاتی ہیں اور انسان کہہ اٹھتا ہے کہ باقی رہی تو ذاتِ ربِّ ذوالجلال ! — ہر شے فانی، ہر شے مسافر، ہر چیز راہی ہے — آنکھوں کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ وہ صاحبانِ فکر کو خوراک مہیا کرتی ہیں — جلوے کے اندر جلوہ — آئینے کے اندر آئینہ — اور دریا کے اندر دریا — !

نظّاروں کا صحیح چناؤ ہی اصل تعلیم ہے — یہی احسان ہے آنکھوں کا! — اور آنکھیں اگر مناسب سمجھیں تو جلوہ دل کو ارسال کر دیتی ہیں اور پھر بس گل و نغمہ، رنگ و نور، حُسن و جمال، شبِ انتظار، شبِ وصال و شبِ فراق کے جلوے ہوتے ہیں اور انسان — خاموش، دھڑکنے والا دل اچانک نئی دھڑکنوں سے آشنا ہو جاتا ہے — دلبری کے کمال ہوتے ہیں انسان کے سامنے — شوقِ دیدار اور شوقِ نظارہ انسان کو بے تاب کر دیتے ہیں۔ انسان بس ایک چہرے ہی کو مقصدِ حیات مان لیتا ہے۔ باقی سب لغو نظر آتا ہے — آنے والے کو پھر سے آنے کی دعوتیں ہوتی ہیں اور جانے والے پر قیامتیں نثار ہوتی ہیں — وجودِ محبوب ہی وجودِ مقدّس بن جاتا ہے۔ یہ کائنات دل والوں کے لیے ایک اور جہت اختیار کر جاتی ہے — اس میں کششیں ہوتی ہیں — لطف ہوتا ہے — آنکھیں چار ہوتے ہی زمین و آسمان کا رنگ بدل جاتا ہے — موسم

بدل جاتے ہیں، کیفیتیں بدل جاتی ہیں، تعلقات بدل جاتے ہیں، ترجیحات بدل جاتی ہیں — مکان و لامکاں تک بدل جاتے ہیں۔

آنکھوں نے جلوہ کیا دکھایا کہ جہاں، بلکہ دونوں جہاں بدل گئے — پتھر دل سے چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔ نزاکتِ احساس سے تعارف ہوتا ہے۔ بے حسی اور جمود ختم ہو جاتے ہیں — آنے والے زمانوں کے لیے حسین یادیں مرتب ہوتی ہیں۔ آنکھیں بولتی نہیں ہیں، صرف دیکھتی ہیں، لیکن آنکھوں کے اندازِ نظر پر سب گویائیاں نثار ہو جاتی ہیں۔

ندرتِ خیال اور ندرتِ بیان کا زمانہ آتا ہے۔ انسان، انسان پر مرتا ہے۔ تمنائے قربِ حُسن ہی محبّت ہے — غرضیکہ آنکھیں محبّت شناس کرواتی ہیں — اور زندگی نثر سے نکل کر نظم میں داخل ہو جاتی ہے — آنکھیں بڑی محسن ہیں۔

کبھی کبھی آنکھیں روح کی طرف روانہ کر دیتی ہیں منظر کی لطافت کو — بس انسان کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لیے یہی کافی ہے — آنکھیں مؤذن ہیں روح کی — کہ جاگ اے سونے والے! جلوۂ حق منتظر ہے طالبِ دیدار کا —! "اَلَسْتُ بِرَبِّکُم" کا زمانہ یاد کرو۔ وہ دن یاد کرو کہ تم نے ہی کہا تھا "بلیٰ"۔ کیا تم بھول گئے — ابھی کل ہی کی تو بات ہے — تم پر شفقتیں ہوئیں تھیں۔ تم پر عنایات نازل ہوئیں، تم پر رحمت کا مینہ برسا، تم پر اُس نے اپنے جلووں کو آسان کیا، تمھیں عطا کی اپنے محبوب ﷺ کی محبّت — یہ دیکھو! جن لوگوں کے آستانے ہیں، زندہ ہیں — اللہ کی یاد کرنے والوں نے قبرستانوں میں میلے لگا دیے اور غافل لوگوں نے زندگی کو ہی قبرستان بنا دیا — کیا کر رہے ہو تم لوگ! یہ آنکھوں کا احسان ہے کہ وہ غافل کو بیدار کرتی ہیں۔ وہ اسے ایسا منظر دکھاتی ہیں کہ بس انسان ایک زمانے سے کسی اور زمانے میں پہنچ جاتا ہے — وقت کے فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور روح محوِ عبادت ہو جاتی ہے — جبینِ شوق میں ہزاروں سجدے تڑپ تڑپ جاتے ہیں اور انسان پہنچ جاتا ہے وہاں، جہاں اُس کی خود آگہی، خدا آگہی کے سفر میں داخل ہوتی ہے۔ یہی زمانہ حاصلِ ہستی ہے۔ اِسی زمانے میں تطہیر و تقدیس کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں، مقطعات ہی مقطعات۔

آنکھوں کا یہ احسان سب سے بڑا احسان ہے۔

آنکھیں کبھی کبھی انسان سے ناراض ہو جاتی ہیں — اور پھر اس کو بدبخت نظاروں کی طرف لے جاتی ہیں۔ وہ آوارہ پھرنے لگ جاتا ہے — وہ برہنگیٔ اجسام کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ آنکھیں ایسا ایسا منظر تلاش کر کے انسان کے آگے پیش کرتی ہیں کہ وہ کہیں کا نہیں رہتا — بدبخت نظاروں کا متلاشی انہی بدبختیوں کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے اور پھر وہ اُس عاقبت تک جا پہنچتا ہے جو اُن نظاروں کی ہوتی ہے۔ نفس کو اُکسانے کا عمل آنکھوں سے شروع ہوتا ہے — اور پھر انسان ایک درندے کی طرح اپنے شکار کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے — گناہ کی تلاش ہی تو گناہ ہے — آنکھوں کا یہ عمل کبھی کبھی تو قوموں کو تباہ کر دیتا ہے — خدا نہ کرے، کبھی نہ کرے، اگر ہماری قوم کو کبھی کسی فرض کے پورا کرنے کی کوتاہی کی سزا ہوئی تو اِس کی وجہ وی سی آر بھی ہو سکتی ہے۔ نظّاروں کا گناہ ختم ہو جائے تو وجود کا گناہ ختم ہو سکتا ہے — ایسی باطل شناس آنکھیں شفایاب ہو سکتی ہیں، اگر ان کو وہ سُرمہ مل جائے جسے خاکِ مدینہ و نجف کہا گیا ہے۔

آنکھیں کبھی کبھی گزرا ہوا زمانہ بھی دکھا دیتی ہیں۔ جو ہو چکا، وہ پھر سے ہونے لگتا ہے — جو گزر گیا وہ پھر سے گزرنے لگتا ہے — جس سانحہ پر ہم رو چکے ہوں، اُس پر پھر سے رونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ آنکھوں کا کمال ہے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص منظر دکھا دیتی ہیں اور پھر پرانے نغمات یاد آ جاتے ہیں۔ پرانے ترانے، ہاں! قومی ترانے یاد آتے ہیں — لیکن کیا کیا جائے — آنکھوں کی تمام کوششیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ عہدِ جنوں ہی نہیں ہوتا۔ لوگ مطلب اور منفعت کی دنیا میں گم ہوتے ہیں — کون آتا ہے، درد کے صحرا میں — اور عہدِ جنوں بھی ایک یادگار ہی تو دے گیا — ایک مینار —! اس نے ہمیں شرمندہ تو نہیں کرنا، ہم شرمندہ ہی کیوں ہوں — چلو ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں — لیکن —

رہ گئی کان میں صدائے جرس
کارواں کا غبار آنکھوں میں

۩۩۩

کائنات اور کائنات

قدرت کے قوانین اور اصول اٹل ہیں۔ قدرت اپنے بنائے ہوئے قوانین اور اصولوں کے مطابق خود بھی پابندی اختیار کرتی ہے اور دوسروں کو بھی اِن میں پابند کر کے رکھ دیتی ہے۔ اللہ کا نظام نہیں بدلتا۔ اُس نے جو کچھ کر دیا، وہ ہو گیا، اور ایسا ہوا کہ ہمیشہ ہی ہوتا رہا۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے تو نکلتا ہی چلا آ رہا ہے۔ مغرب میں ڈوبتا ہے تو مغرب میں ہی ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔

یہ عجب بات ہے کہ ہر روز نئی اور نرالی شان والا اللہ ہر چیز کو اس کے حصار اور اس کے مدار میں ہمیشہ حرکت کرتے رہنے کا حکم لکھ چکا ہے، اور جو کچھ وہ لکھ چکا ہے، وہ اٹل ہے۔ ہمارے ارادے بدلتے رہتے ہیں لیکن اس کا "اَمر" اَٹل ہے — تبدیل نہیں ہوتا — زمین کی گردش، بلکہ گردشِ شام و سحر، گردشِ افلاک، گردشِ زمانہ — ہر چیز مقرر شدہ اور مکتوب ہے، ایک مخفی کتاب میں —!

جاننے والے جانتے ہیں کہ زندگی کے نصیب میں موت لکھی جا چکی ہے۔ ہونا، نہ ہونا ہو کر رہتا ہے۔ قادرِ مطلق نے قوانینِ قدرت بیان فرما دیے ہیں کہ ایسا ہو گا، ایسا نہیں ہو گا۔ انسان جتنی کوشش کرے گا، اتنا ہی نتیجہ حاصل کرے گا۔ یہ اصول ہے۔ دریا پہاڑوں سے نکلے گا — رواں دواں، اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گا اور سمندر سے ہمکنار ہو گا — آسمانوں سے مینہ برسے گا، زمین سے پودے اُگیں گے، پرندے ہوا میں اُڑیں گے اور مچھلیاں پانی میں تیریں گی

— سب اصول مقرر ہو چکے ہیں۔ تمام قوانین مُرتّب ہو چکے ہیں۔ سب باتیں طے ہو چکی ہیں۔ ہر آغاز کا ایک انجام ہو گا اور ہر انجام کسی آغاز پر منتج ہو گا۔

اگر بات صرف یہاں تک ہوتی تو یہ کائنات، یہ زندگی، ایک مشین بن کر رہ جاتی، لیکن غور کرنے والے، فکر کرنے والے، تدبر و تفکر کرنے والے جانتے ہیں کہ اِس منظّم اور مرتّب کائنات کے ساتھ ساتھ ایک اور کائنات بھی ہے — جہاں کے اصول، اصولوں کے جہاں سے الگ ہیں۔ جہاں کے قانون، قانون کی دنیا سے بہت ہی مختلف ہیں۔ یہ ایک نرالی کائنات ہے۔ بالکل مختلف یکسر عجیب، بلکہ ایک عجوبہ —!!

اصول تو یہ ہے کہ آگ جلائے گی، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ نار ہے اور اِس میں گلزار ہے — اور اِس گلزار کے اندر محرمِ اسرار جلوہ گر — اصول بنانے والے نے اصول کو معطّل کرنے کا بھی اصول بنایا ہے۔ جس نے آگ کو حدّت عطا فرمائی، اُسی نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ٹھنڈی ہو جائے، سلامتی کے ساتھ ابراہیمؑ پر —! منشا کا اصول الگ ہے — وہ چاہے تو کیا سے کیا ہو جائے — وہ اپنے اصولوں کا کیوں پابند ہو گا —!

قانون تو یہ ہے کہ محنت کرنے سے رزق ملے گا، لیکن جب دینے والا چاہے تو بے حساب دے دیتا ہے — بے پناہ دیتا ہے۔ وہ زمین اور آسمان کے خزانوں کا مالک ہے اور کسی کے آگے جوابدہ نہیں، نہ اُس کا کوئی آڈٹ کر سکتا ہے۔

کائنات کا کوئی اصول ایسا نہیں جس میں استثناء نہ ہو۔ علم ہی کو لیجیے۔ علم مکتب سے ملتا ہے، اساتذہ سے ملتا ہے۔ یونیورسٹی شیکسپیئر کا علم تو دے سکتی ہے لیکن شیکسپیئر بننے کا علم نہیں دے سکتی۔ اقبالؒ نے شرق و غرب کے علوم حاصل کر لیے — اُس کی رُوح میں تشنگی بڑھ گئی — اب شرق و غرب کے علوم کے بعد کیا ہے؟ "بعد" تو صرف اصول سے باہر کی کائنات کا علم ہے۔ وہ علم جو کتاب میں نہیں — وہ صرف "جنوں" سے ملتا ہے، نظر سے ملتا ہے، نصیب سے ملتا ہے۔ قانون سے باہر، اصول سے پرے، الگ، نرالا، انوکھا علم — انوکھی کائنات کی

دریافت کا علم — ایسی کائنات جہاں عمل معطل ہے اور علم ہی علم ہے۔ جہاں صرف مشاہدہ ہے، حیرت ہے، نیرنگی ہے — کوئی اصول نہیں۔ یہ ظاہری کائنات، اس کائنات کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے۔ وہ کائنات منشا کی کائنات ہے، عنایات کی کائنات ہے، عطا کی کائنات ہے۔ ایسی کائنات جہاں وقت ساکن ہو جاتا ہے اور جلوے متحرک رہتے ہیں۔ جہاں دن رات، ماہ و سال نہیں ہوتے۔ وہاں صرف محویت اور جلوے ہوتے ہیں۔ علم ہی علم ہوتا ہے اور تعلیم نہیں ہوتی۔ اس کائنات میں دُنیا کو علم عطا کرنے والے ہوا کرتے ہیں۔ یہ علمِ "لدنّی" والوں کی کائنات ہے۔ اس کائنات میں محنت نہیں، محبّت کام آتی ہے — ادب کام آتا ہے — نصیب کام آتا ہے۔

نصیب کے حق میں بات کرنے سے، کوشش کے حق میں بات کرنے والے خفا ہو جاتے ہیں۔ جب تک کوشش کی محرومیاں سمجھ میں نہ آئیں، نصیب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ کوشش کامیاب ہو جائے، تب بھی بے نصیب آدمی ناکام ہو جاتا ہے۔ کامیاب کوششوں نے بڑی ویرانیاں چھوڑی ہیں اِس دُنیا میں۔ کوشش کو اگر ہاتھی کہہ لیا جائے تو نصیب اَبابیل کی کنکری ہے۔ یہ سلسلہ بہت طویل ہے۔ یہ داستان بہت لمبی ہے۔

بہرحال مقصد یہ ہے کہ ظاہری کائنات جس میں کوشش اور اصول پر زور دیا جاتا ہے، اس باطنی کائنات سے قدرے مختلف ہے جہاں نصیب اور نصیب والوں کی جلوہ گری ہے۔ اُس کائنات کے بارے میں غور کرنا چاہیے۔ وہ باطنی کائنات دُعاؤں کی کائنات ہے۔ دُعا نصیب ساز ہوتی ہے۔ دُعا ناممکنات کو ممکن بنا دیتی ہے — وقت بدل جاتا ہے — زمانے بدل جاتے ہیں — ناتواں توانا ہو جاتے ہیں — شکست فتح میں بدل جاتی ہے اور معزول سرفراز کر دیے جاتے ہیں۔ وہ کائنات روح کی کائنات ہے، نشانیوں کی کائنات ہے، جلووں کی کائنات ہے، محبوب کے انکشاف کی کائنات ہے، رضا اور منشا کی کائنات ہے۔ وہ مخفی کائنات اِسی ظاہری کائنات کے اندر ہے۔ وہاں خاموشی بولتی ہے۔ وہاں درخت باتیں کرتے ہیں۔ پہاڑ پیغام رسانیاں کرتے

ہیں۔ دریا علامتیں بن جاتے ہیں اور سمندر حقیقت کا روپ اختیار کر جاتے ہیں۔ اس کائنات میں دل والے، روح والے، حق والے داخل کیے جاتے ہیں۔ اس کائنات کا سفر راتوں کو پچھلے پہر طے ہوتا ہے۔ اس کائنات میں اشکوں کے چراغ جلتے ہیں — روشنی ہی روشنی، نُور ہی نُور، جلوے ہی جلوے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اصول اور قانون تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وقت کے فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ غیب حاضر اور حاضر غیب ہو جاتا ہے۔ اسی کائنات میں موت کا عمل معطّل ہو جاتا ہے۔ دُور کی آواز قریب سے سنائی دیتی ہے۔ یہ مخفی کائنات اللہ کے خاص بندوں کی کائنات ہے — اُن لوگوں کی جن پر اُس کا فضل ہوتا ہے۔ یہ کائنات کوشش سے نہیں، نصیب سے میسّر آتی ہے۔ یہ عجب بات ہے کہ انسان آگ لینے جائے اور پیغمبری لے کر آئے — یہ کیسی کائنات ہے!

یہ باطنی کائنات سب سے پہلے اپنے باطن میں دریافت ہوتی ہے — اور پھر یہ کائنات پھیلتی ہوئی کُل کائنات بن جاتی ہے۔ یہاں کے اصول عجیب، یہاں کے قوانین نرالے ہیں۔ یہاں منزلیں نہیں ہوتیں — صرف سفر ہوتا ہے — مسلسل سفر! ایک مقام کے بعد ایک اور مقام انتظار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں دیکھنے کے لیے آنکھ بند کرنا پڑتی ہے، اور سننے کے لیے کان درکار نہیں۔ یہاں سماعت دل کے کان سے ہوتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اِس کائنات میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ کائنات نظاروں کی کائنات ہے۔ ایثار کی کائنات ہے۔ دوسروں کے دکھ بانٹنے کی کائنات ہے — اِس کائنات کے معتبر نام وہی ہیں جو دوسروں کے غمگسار ہیں — دوسروں کی تکالیف کم کرنے والے — خوشیاں دینے والے لوگ اِس کائنات کے خوش نصیب ساکن ہیں۔ وہ خوش نصیب جن کے پیشِ نظر انسان کی زندگی کو آسان بنانا ہے، جو ہمہ حال منشائے محبوب اور آوازِ دوست پر لبیک کہتے ہیں۔

اِس کائنات کا دستور عجیب ہے۔ یہ باطنی کائنات اتنی پُراسرار ہے جتنا انسان کا اپنا باطنی وجود — باطن میں اِرادہ ہوتا ہے اور ظاہر اِس ارادے کے مطابق عمل پیرا ہونا شروع ہو

جاتا ہے۔ مثلاً ذہن یا دماغ ارادہ کرے تو اعضاء و جوارح حرکت شروع کر دیتے ہیں۔ اگر دل میں محبّت آئے تو زبان میں شائستگی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اگر باطن میں غصہ آئے تو ظاہری وجود کے چہرے پر تیوری اور نفرت کا اظہار ہونا لازمی ہے۔ باطن مصروفِ عبادت ہو تو ظاہر معصومیّت کا پیکر بن جاتا ہے۔

اِس طرح یہ پُراَسرار باطنی کائنات صاحبانِ اِرادہ کی کائنات ہے۔ وہاں جو فیصلے ہوتے ہیں، وہ ظاہر کی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہاں دُعائیں ہوتی ہیں اور ظاہر میں تاثیریں میسّر آتی ہیں۔ وہاں ارادے بدلتے ہیں اور یہاں زمانے بدل جاتے ہیں۔ وہاں مزاج بدلتے ہیں تو یہاں حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ بس وہاں ''کُن'' کی جلوہ گری ہے تو یہاں ''فیکون'' کی کار فرمائی ہے۔ یہ پُراَسرار لوگوں کی پُراَسرار کائنات سب کے سامنے ہے لیکن یہ سب پر آشکار نہیں ہوتی۔ اِس میں داخل ہونے کا کوئی حتمی اصول نہیں۔ بس نصیب اور منشائے الٰہی ہے۔ جس کا نصیب بیدار ہو گیا، وہ صاحبِ اَسرار ہو گیا— جن کو منشائے الٰہی میسر ہو، انہیں آہِ سحر گاہی میسّر ہوتی ہے، اور آہِ سحر گاہی اِس کائنات اور باطنی کائنات میں رابطے کا بڑا معتبر ذریعہ ہے—!!

آدھا رستہ

انسان عجب مخلوق ہے — سوچتا ہے — عمل کرتا ہے اور عمل کے عین دوران میں پھر سوچتا ہے اور اپنے عمل پر نظرِ ثانی کرتے کرتے اپنی اُس سوچ پر بھی نظرِ ثانی کرتا ہے جس کے تحت سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہ کھیل جاری رہتا ہے، آری کے دندوں کی طرح — اور انجامِ کار یہ سوچ دَر سوچ کی آری افراد کو اور قوموں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے — جذبے سرد پڑ جاتے ہیں — سفر کی لذّت ختم ہو جاتی ہے — عمل سے حاصل ہونے والی عزتِ نفس، ندامت میں بدل جاتی ہے اور سفر بند ہو جاتے ہیں — قافلے پڑاؤ پر پڑے رہتے ہیں۔ منزل سے محروم، بد دل مسافر ایک نئی سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور نئی بستیاں بسانے کے دَرپے ہو جاتے ہیں — گھر چھوڑ کر سفر پہ نکلے اور مسافرت میں منزلیں فراموش کر کے نئے گھر بنانے شروع کر دیتے ہیں۔ کل کی سوچ کو غلط سمجھ کر انسان آج کی سوچ پر ناز کرتا ہے — آنے والے کل میں یہ سوچ بھی غلط ہو سکتی ہے۔ بس تذبذب کے اِس مقام کو ہی آدھا رستہ کہتے ہیں — واپس جانا ناممکن ہوتا ہے — آگے جانے کی ہمت نہیں ہوتی — یہی زوالِ ملّت ہے کہ مقصد ہی بھول جائے اور مقصد نہ رہے تو سفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — انسانی عقل راستوں میں رہ جاتی ہے۔ منزل پر پہنچانے والی کوئی اور سوچ ہے — وہ دانشِ نورانی ہے — وہ علمِ آسمانی ہے — وہ فیصلہ کسی اور طرف سے آتا ہے۔

انسانی سوچ کو تذبذب سے بچانے کے لیے پیغمبرؑ تشریف لائے اور لوگوں کو بتایا کہ یہ

عارضی اور فانی سوچیں ہیں — اصل بات خدا کی بات ہے — اور اصل سفر اطاعت کا سفر ہے جسے منزل نصیب ہوتی ہے۔ ابلیس نے اطاعت نہ کی — اُس نے غرور کیا، تکبّر کیا۔ اُس نے سوچا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مٹی سے بنے ہوئے آدمؑ کو سجدہ کیا جائے، جبکہ وہ نار سے پیدا ہوا — یہی سوچ کا زوال ہے۔ آدھے رستے کا مسافر ابلیس تھا — مقرب تھا، معتوب ہو گیا، رجیم ہو گیا۔ جب سوچنے کے بعد کوئی فیصلہ کر لیا جائے تو اللہ پر بھروسہ کر کے منزل پر ہی ڈیرے ڈالنے چاہییں — یہی کامیابی ہے۔ بد نصیب ہیں وہ مسافر جو آدھے سفر کے بعد ذوقِ سفر سے محروم ہو جائیں۔ مقصد فراموش قومیں اور افراد آدھے رستے پر رُک جاتے ہیں۔

بعض اوقات ہم اکثریت کے فیصلے پر سفر اختیار کرتے ہیں۔ یہ سفر بھی مشکوک ہوتا ہے۔ اکثریت متلوّن ہو سکتی ہے، بے خبر ہو سکتی ہے، بے علم ہو سکتی ہے، غافل ہو سکتی ہے، آرام پرست اور آرام طلب ہو سکتی ہے۔ جہاں اکثریت کاذب ہو، وہاں صداقت کا سفر کیسے ہو سکتا ہے! اگر فیصلہ منافقین کی اکثریت کے حوالے کر دیا جائے، تو بھی فیصلہ غلط ہو گا۔ اللہ نے بیان فرمایا: "جب منافقین رسول ﷺ کے پاس آکر کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، تو بے شک اللہ جانتا ہے کہ آپؐ اُس کے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا کہ یہ منافقین ضرور جھوٹے ہیں"۔ یعنی جھوٹے لوگ سچ بولیں تو بھی جھوٹ ہے، وہ کوئی صحیح فیصلہ کریں تو بھی غلط ہے — وہ کسی صحیح منزل کی نشاندہی کریں تو بھی نتیجہ غلط ہو گا — سچ وہ، جو سچے گروہ کا فیصلہ ہو۔ سچی اقلیت کاذب اکثریت سے بہت بہتر ہے۔ محض اکثریت پر مبنی سب فیصلے قابلِ غور ہیں۔ جب تک سچے لوگوں کی اکثریت نہیں ہوتی، جمہوری فیصلے غلط ہیں۔ سربراہ، امیر المومنین ہونا چاہیے — امیر الکاذبین اور امیر المنافقین، ملّت پر عذاب کے نزول کا باعث ہو سکتے ہیں۔ جھوٹے کے مقدّر میں آدھا رستہ ہے — جھوٹے راہی کی منزل آدھا رستہ ہے۔ صداقت کی منزلیں صادقوں کے لیے ہیں۔ بعض اوقات "امیر" کی صداقت قوم میں صداقتِ فکر پیدا کر دیتی ہے۔

قائداعظمؒ کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ صادق تھے — صداقت ہی اُن کی خودی تھی۔ اُن کا اپنا کردار قوم میں وحدتِ کردار پیدا کر گیا—لوگ اُن کے حکم پر مر مٹے — وطن سے بے وطن ہوئے — مہاجرین بن گئے — سب کچھ لُٹا کے بھی خوش بختی کا احساس رہا— ایک عظیم مقصد کے لیے جان اور آن کی پرواہ کیے بغیر لوگ آمادۂ سفر ہوئے — بات بہت دُور تک نکل جاتی، اگر قائد کچھ دیر اور زندہ رہتے۔ وحدت کا تصوّر دینے والا مر گیا اور قوم میں انتشار سا پیدا ہو گیا۔ قائد کی بے وقت رحلت نے سفر کی رفتار کم کر دی — سفر کا رُخ وہ نہ رہا۔ اُن کی بنائی ہوئی صادق اکثریت بے مقصد ہجوم میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اکثریت کو صداقت آشنا کیا جائے، اس میں حق گوئی اور بیباکی پیدا کی جائے — یہ مرحلہ طے ہو جائے تو جمہوریت سے بہتر کیا ہو سکتا ہے — ورنہ وہی بات کہ بس آدھا سفر — آدھا راستہ — خدانخواستہ —!

انسان فطری طور پر انقلاب پسند ہے، اِسے یکسانیت پسند نہیں۔ یہ ورائٹی چاہتا ہے، یہ بدلتا رہتا ہے — انسان لباس بدلتا ہے، لہجے بدلتا ہے، دوست بدلتا ہے، جماعتیں بدلتا ہے، پارٹیاں بدلتا ہے، ہارس ٹریڈنگ کرتا ہے۔ یہ محسن فراموشیاں کرتا ہے، رِشتے بدلتا ہے اور مقصد بھی بدل دیتا ہے — اِس کے پاس ہر کام کا جواز ہے — پرانے فیصلے کا اِس کے پاس قوی جواز تھا، آج نئے فیصلوں کا جواز ہے — غالباً یہی انقلاب کا باعث ہے۔

آدمؑ کو بہشت میں رہنا اِس لیے بھی راس نہ آیا کہ وہاں کوئی ہنگامہ نہیں تھا، کوئی انقلاب نہیں تھا، بولنے کے لیے کوئی فورم نہیں تھا — انہوں نے ایک ترکیب سوچی — شجرِ ممنوعہ کا ذائقہ چکھ لیا — بس انقلاب آ گیا — ہنگامہ بپا ہو گیا — اگر اخبار ہوتے تو شہ سُرخیاں چھپ جاتیں۔ بہشت اُن کے ہاتھ سے نکل گیا — انقلاب کامیاب ہو گیا اور زندگی ناکام۔ اللہ نے آدمؑ کے لیے شیطان کو نکال دیا اور آدمؑ نے شیطان کے لیے اللہ کے اَمر کو چھوڑ دیا۔ بہشت کا سفر آدھے رستے ہی میں ختم ہو گیا — پھر زمین کا سفر — زمین کے مقاصد، عزائم اور عمل — سب نامکمل! حضورِ اکرم ﷺ کی معراج کے علاوہ ابھی سب کچھ راستے میں ہی ہے

—ابھی آدھا رستہ ہی طے ہوا ہے۔ ابھی تو ملّتِ آدمؑ تفریق ہوئی ہے —یہ سفر مکمل ہو گا وحدتِ آدمؑ پر۔ ستاروں کی وحدت کہکشاں پیدا کرتی ہے۔ ننھے چراغوں کی وحدت سے چراغاں پیدا ہوتے ہیں۔ قطروں کی وحدت سے قلزم اور دریا کے جلوے پیدا ہوتے ہیں۔

آدھے رستے کے مسافروں کو جگایا جائے، انہیں پھر سے آمادہ کیا جائے —اُن میں باہمی احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے تا کہ کارواں پھر سے رواں ہو جائے —منزلیں انتظار کر رہی ہیں اور مسافر ہیں کہ آدھے رستے میں سوئے پڑے ہیں۔

ذوقِ سفر پیدا کرنا قیادت کا فرض ہے۔ قائد کو چاہیے کہ وہ قوم میں بیداری کی روح پھونک دے۔ ذوقِ سفر عطائے رحمانی ہے۔ رحمتِ حق کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے کہ اے مہرباں اللہ! دے ہمیں کوئی حُدی خواں، جو زندگی پیدا کر دے اِس قوم میں۔ مطلب پرستی جمود پیدا کر رہی ہے، وطن پرستی تحریک پیدا کرے گی۔ —اور یہ قوم—

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ

غریبوں کو نان و نفقہ کے مسائل اور مراحل سے آزاد کروایا جائے —اُن کی زندگی میں اُمّید کی شمع روشن ہونی چاہیے —اُنہیں مایوسی کی تاریکی سے نکالنا چاہیے تا کہ وہ بھی وطن پرستی کے عظیم مقصد اور سفر میں شامل ہوں۔ اَمیروں سے پیسے کی محبّت نکال لی جائے —اُنہیں مال کی نمائش کا موقع نہ دیا جائے —اُن کی شادیوں کو اسلامی رنگ میں ڈھالا جائے —اُنہیں ایک سادہ زندگی کا شعور دیا جائے تا کہ وہ بیچارے بھی حصولِ منزلِ ملّت کے عمل میں شریک ہو سکیں —ورنہ آدھے راستے کی بدقسمتی سے بچنا مشکل ہو گا۔ یہ سب کا سفر ہے، سب کے لیے— یہ سب کا مقصد ہے، سب کے لیے —یہ سب کا ملک ہے، سب کے لیے —یہ سب کے وسائل ہیں، سب کے لیے —غور کِیا جائے۔ اللہ آسانیاں پیدا کرے گا۔ جس مقصد کے لیے یہ ملک بنایا تھا —یاد تو ہے؟ اگر یاد ہے —تو حاصل کرنے میں کیا دیر ہے!!

کیا اب اکثریت سے پوچھا جائے گا کہ اِسلام کیا ہوتا ہے؟ —اِسے کیسے حقیقی معنوں

میں نافذ کیا جا سکتا ہے؟ یہ بات خدا سے پوچھی جائے، قرآن سے معلوم کیا جائے، اللہ کے رسول ﷺ کے فرامین سے روشنی حاصل کی جائے، گردشِ لیل و نہار پر نگاہ رکھنے والے بیدار رُوح اِنسانوں سے رجوع کیا جائے — وحدتِ عمل اور وحدتِ کردار کا پھر سے پیدا ہونا مشکل نہیں ہے۔ صاحبانِ اقتدار صادق ہو جائیں، ہر طرف صداقت ہی صداقت ہو جائے گی۔ شکر ہے کہ بہت کچھ ہو رہا ہے لیکن ابھی اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ قافلہ آدھے رستے میں ہی تھک کر سستا رہا ہے — جاگو اور جگاؤ —!! وقت انتظار نہیں کرتا — مواقع اپنے آپ کو دہراتے نہیں۔ مرتبے اور آسائشیں ملتی ہیں کہ اپنے آپ کو خوش نصیب بنایا جائے۔ خوش نصیب بننے والا سب کو خوش نصیبی عطا کرے۔ قافلہ بددل ہو گیا ہے — اِس کی تکالیف کا اَزالہ کیا جائے، اِسے گلے اور تقاضوں سے نجات دی جائے۔ یہ قوم جاگ گئی تو قوموں کی اِمامت کا فریضہ اِسی کو سونپا جائے گا۔ حال کی خوشحالی میں مست ہو کر مستقبل کے فرائض فراموش نہ ہوں۔ وہ وقت قریب آ پہنچا ہے جب اقبالؒ کے خواب کی تعبیر میسّر ہو — قائداعظمؒ کی محنت کا صلہ حاصل ہو — قوم کے لیے شہید ہونے والوں کی روحوں کو قرار نصیب ہو — ہم منزل فراموش نہ ہوں تو آنے والی نسلیں ہمیں عزت سے یاد کریں گی۔

اپنی لاڈلی اَولاد کے لیے پیسہ جمع کرنا ہی مقصد نہیں ہے۔ اگر اَولاد نے مفت حاصل ہونے والا مال گناہ میں لگایا تو اِس گناہ کی سزا پیسہ مہیا کرنے والوں کو بھی ملے گی۔ اگر اَولاد کو تصوّرِ پاکستان سے متعارف نہ کروایا گیا، شعورِ عظمتِ اسلام کی تعلیم نہ دی گئی تو خدا نہ کرے ہمارے لیے "آدھے رستے کے مسافروں" کا طعنہ ہو گا۔ خدا ہمیں اس عذاب سے بچائے — ہم عظیم قوم ہیں — ہمیں عظیم تر ہونا چاہیے — یہ ملک خدا کا ہے — خدا کے رسول ﷺ کا ہے — اُنہی کی منشا کے مطابق چلنا چاہیے!!

❖❖❖

سنگتیں

خیال ایک ایسا پرندہ ہے کہ جب چاہے، جہاں چاہے، جیسے چاہے — آ سکتا ہے۔ جب آنے پہ آتا ہے، تو آتا ہی چلا جاتا ہے — اور جب نہ آنا چاہے، اسے لاکھ بلاؤ، نہیں آتا — قطعاً نہیں۔ اگر انسان اپنے ذہن میں آنے والے خیالات کو ساتھ ساتھ بیان کرنا شروع کرے، تو ایک عجیب سلسلہ چل نکلے گا۔ خیال میں خیال آتا چلا جائے گا اور بیان سے بیان ہوتا رہے گا — نہ اِس کی انتہا، نہ اُس کی حد —!

کبھی کبھی تو خیال میں خیال یوں ہوتا ہے جیسے خواب میں خواب دیکھنا۔ ہم سب خواب میں ہی خواب دیکھتے ہیں۔ یہ زندگی خود ایک خواب ہے اور اس میں ہمارے عزائم اور منصوبے اور ارادے سب خواب ہیں۔ پورے ہو جائیں تو بھی خواب — ادھورے رہ جائیں، تو بھی خواب۔ خواب نہ چھوڑے جاسکتے ہیں، نہ پورے کیے جاسکتے ہیں — بس دیکھے جاسکتے ہیں۔ کبھی کبھی بیان بھی کیے جاسکتے ہیں۔ بس ایسے ایک بار اتفاق ہوا — ایک لمحے کے لیے خیال آیا اور خیال چلا گیا، لیکن اس ایک لمحے میں زمانے بدل گئے — تصورات تبدیل ہو گئے —!

دیکھتا ہوں — یا ممکن ہے سوچتا ہی ہوں کہ قیامت شروع ہے۔ آہستہ آہستہ آتی چلی جاتی ہے۔ دھماکے — کڑک — گرج — چمک — چنگھاڑ — اور زلزلے اور پھر ایک ایک کر کے رخصت ہوتے رہے، سب گردو پیش کے انسان، اپنے بیگانے، قریبی اور دُور کے لوگ چلتے گئے، نہ واپس آنے والی منزلوں کی طرف۔ مجھے خواب میں ہی، یا ممکن ہے خیال میں ہی

خوشی بھی ہوئی کہ میں زندہ ہوں — میں محسوس کر سکتا تھا کہ میں زندہ ہوں — میں چھو سکتا تھا — میں چھوا جا سکتا تھا — تیزی سے ہر طرف آنے والی موت کے درمیان میں زندہ تھا۔ میں خوش تھا کہ مجھے موت نہیں آئی — عمل جاری رہا، حتیٰ کہ ہنگامۂ قیامت ختم ہو گیا اور پھر سکوت ہی سکوت، مکمل سناٹا، نہ کوئی راز رہا، نہ محرمِ راز۔ میں اکیلا، مجبور اور فانی انسان، واحد — حسرت — اور کوئی میرے جیسا نہ تھا۔ اب خوشی نہیں تھی — غم تھا، خوف تھا بلکہ ایک شدید کرب تھا — کہ اے میرے خدا! — یہ زندگی، زندگی نہیں — میں اس حالت میں بھی سوچ رہا تھا۔ خیال تھا کہ آتا ہی چلا جا رہا تھا۔ غور کے بعد معلوم ہوا — نکتہ کھلا کہ مرنے والے تو خدا جانے کہاں گئے۔ دراصل زندہ رہنے والا واحد انسان ہی مر گیا — میں، میرے جیسوں کے بغیر کیا ہوں — ایسی زندگی جو کسی اور ذی جان کے بغیر ہو، کیا زندگی ہے — نہ کوئی آواز، نہ کوئی صورت — بس تنہائی اور سکوتِ مرگ — مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں، مَیں نہیں رہا — مَیں کہیں سے ٹوٹ گیا ہوں — کہیں سے کٹ گیا ہوں — کہیں سے گر گیا ہوں — مَیں اپنوں میں تھا خواہ بیگانوں میں تھا، مَیں، مَیں تھا — اب مَیں، مَیں نہیں ہوں — بس مَیں سوچتا چلا گیا — مَیں بظاہر ایک اکائی ہوں، لیکن مَیں ہی دُور تک پھیلا ہوا سلسلہ ہوں۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات نہیں کہ سب ختم ہو جائیں — اور مَیں ہی زندہ رہوں — یہ اپنی موت کی ایک شکل ہے — یہ اپنی تباہی کی ایک داستان ہے کہ سب تباہ ہو جائیں۔ یہی تو اپنے نہ ہونے کا اصل جواز ہے کہ کوئی بھی نہ ہو — تلاش مر جائے تو متلاشی مر جاتا ہے۔ دشمن بھی مر گیا، دوست بھی مر گئے — تو ہم ہی مر گئے۔ بزرگ مر گئے — ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے — اَولاد رخصت ہو گئی — ہم فریاد بن گئے! واحد فریاد — نہ کوئی ہمدرد، نہ داد خواہ۔ ہم غم بن گئے — غم خوار بغیر — نہ ختم ہونے والا غم۔ یہ زمانہ میری ضیافت ہے۔ دُور تک پھیلا ہوا سلسلہ میرا ہی سلسلہ ہے۔ مَیں جہاں ہوں، وہاں بھی مَیں ہوں اور مَیں جہاں نہیں ہوں، وہاں بھی مَیں ہی ہوں۔ یہ دنیا میری ہی تکمیل کا سلسلہ ہے — یہی ہے میرے ماضی کی خانقاہ اور یہی ہے میرے مستقبل کا مقبرہ —!

اِس دنیا میں سب لوگوں کی موجودگی میں مجھ پر کئی زمانے بیت چکے ہیں۔ ایک ایک لمحے میں مجھ پر صدیاں گزر گئیں، کتنے جگ بیت گئے۔ مجھے جو کچھ ملا سب کے دَم سے ملا۔ سب ہیں تو ہم ہیں۔ میری آج کی دُعاؤں کے الفاظ کسی اور کی زبان سے اَدا ہوتے ہوتے میرے پاس آئے ہیں۔ میری آج کی سوچ بھی کتنے اذہان کا سفر کرتے کرتے مجھ تک آئی ہے۔ سب سلامت رہیں تو مَیں سلامت ہوں۔ وہ جنّت جس میں اپنے علاوہ کوئی نہ ہو، وہ دوزخ سے بدتر ہے۔ جنّت سب کی خوشی کا نام ہے۔ سب کی عافیت کا نام ہے۔ مَیں جس چیز کو ''مَیں'' کہتا ہوں، وہ شاید مَیں نہیں۔ ''مَیں'' اپنے علاوہ بہت سی چیزوں کا نام ہے۔ سچ پوچھو تو جنّت میری عافیت کا نام ہے، احباب میری تکمیل کا اور دشمن بھی میرے ہی عزائم کا — یہ سب نام ہیں میرے ہی — مختلف روپ ہیں — اور کعبہ بھی اپنے ہی دل کا نام ہے۔ عبادت اپنی پیشانی کا نام ہے۔ یہی پیشانی جھکتی ہے تو انسان ساجد ہو جاتا ہے۔ اپنی جبینِ نیاز ہی سجدوں سے سرفراز ہوتی رہتی ہے۔ قرأتِ کلامِ الٰہی کے لیے بھی انسان ہی کی زبان درکار ہے — اور سننے کے لیے انسان کے کان کی ضرورت ہے — اور خشیتِ الٰہی کے لیے انسانی دل کا ہونا لازمی ہے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میرا ہونا نہ ہو — سفر میرے دَم سے، قیام میرے دَم سے، حج میرے ہی دَم سے — دُعا کے لیے انسانی ہاتھ کا اُٹھنا ضروری ہے — اللہ انسان سے مانوس ہے اور انسان اللہ کا محتاج ہے —!

زندگی کے سب ہنگامے، سب رعنائیاں، سب سلسلے، سب ہجوم، سب تنہائیاں، سارے غم اور ساری خوشیاں میرے ہی لیے ہیں — اندازہ کیجیے، علی الصبح میری میز پر ایک رنگ برنگے سجے سجائے اخبار کی خاطر دنیا کتنے حادثات سے گزر جاتی ہے — سچ جھوٹ مل کر میرے پاس آجاتا ہے اور یوں میری مصروفیت کا اہتمام ہوتا ہے — فون آتے ہیں، فون جاتے ہیں اور پھر بل — میرے ہی نام — میرے ہی لیے — میری کمائیاں ختم ہوتی ہیں اور شروع ہوتی ہیں — اور آہستہ آہستہ میں اور میرا حاصل ختم ہو جاتے ہیں — لیکن نہیں — مَیں اپنے وجود سے نکل کر اپنے احباب کے دل میں جابستا ہوں۔ وہ جو میرے دل میں ہوتے ہیں، مَیں اُن

کے دل میں رہتا ہوں اور یوں میں ہمیشہ رہتا ہوں — میرے دوست رہتے ہیں — میں رہتا ہوں — میری کتابیں رہتی ہیں — میں رہتا ہوں — جب تک میرے تذکرے ہیں، مَیں ہوں — اور میرے تذکرے کبھی ختم نہیں ہوتے — یہ عجیب بات ہے کہ ہمیشہ رہنے والی کتاب میں اُن کے تذکرے بھی ہیں جو ہمیشہ نہیں رہے — یہ کیسے ہے؟ جب تک زندہ کتاب ہے، وہ زندہ ہیں — اور زندہ کتاب ہمیشہ ہی زندہ ہے — مارنے والے نے مرنے والوں کو ذکر میں زندہ رکھا — اور مارنے والے نے مر جانے والوں کو — قربانی دینے والوں کو مُردہ کہلانے سے بچائے رکھا — حکم ہوا کہ میری راہ میں مرنے والوں کو کوئی مَرا ہوا نہ کہے — کیونکہ وہ تو زندہ ہیں — بس انسانوں کو شعور ہی نہیں ہے — اِن شہدا کو اللہ کے پاس سے رزق ملتا ہے — بس شان والے کی شان ہے — جو چاہے کرے — مالک ہے — لیکن ایک چھوٹی سی بات یہ ہے کہ اسی کَوکب کی تابانی سے اُس کا جہاں روشن ہے —!

اِنسان کا ہونا بہت ضروری تھا اور انسانوں کے دیس میں اپنے قدم بہت ہی ضروری تھے — شہر آباد کیے گئے — صدیوں سے تزئینِ گلستان ہوتی رہی — اور بالآخر اِس گلشنِ ہستی میں اپنی آمد ضروری تھی — ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والے پھولوں کو ہمارے دَم سے قرار ملا — کہ ہم اُن کو دیکھ دیکھ کر مست ہو گئے — کیا بات ہے — باغ میں پھول اور پھولوں میں باغ —!! آنکھوں میں جلوے اور جلووں میں آنکھیں — خوشبو میں رنگ اور رنگ میں خوشبو — ہر چیز ہر دوسری شے کے خیال میں محو — محو کرنے والا اور محو ہونے والا — سب ایک ہی محویت کا حصہ ہیں — مَیں وصول بھی کرتا ہوں اور مَیں ہی ارسال بھی کرتا ہوں — چہرے بھی میرے ہیں اور آنکھیں بھی میری ہیں — میرے ہی خیال کی زد میں ہیں، سب فاصلے — سب دُوریاں پاس ہی رہتی ہیں — بس ایک نگاہ کی بات ہے — اتفاقاً ہی اٹھ گئی تو وقت بدل جائے گا — انقلابات بپا ہو جائیں گے — جو نہیں ہے، ہو جائے گا — اور جو ہے، نہیں رہے گا — حاضر غیب ہو جائے گا اور غیب حاضر — ناممکنات کو ممکنات بنانے والی نگاہ کسی وقت بھی اٹھ

سکتی ہے — اور پھر حجابات اٹھ جائیں گے — سکوت سے کلام کا پہلو نکل آئے گا — صدیاں سمٹنا شروع ہو جائیں گی اور لمحے پھیلنے شروع ہو جائیں گے — بطون سے ظہور کا سفر ایک نگاہ کا سفر ہے — ظلمات سے نُور کا سفر ایک نگاہ کا سفر ہے — بیگانے کو اپنا بننے کے لیے صرف ایک نظر کافی ہے۔ جان لینے کے ارادے سے آنے والا، جان نثار کرنے لگا — یہی اعجازِ نگاہ ہے — اپنا مقدّر بس وہی نگاہ ہے — ورنہ دامنِ عمل تو خالی ہے — !!

میرے لیے چشمِ رحمت کُشا ہوتی ہے — میرے لیے عبادت بنتی ہے — اور میرے لیے توبہ کے دروازے کھلے رکھے گئے۔ میرے لیے وہ دل بنایا گیا — جس میں اُس کا سودا ہے — وہ دِل جو کرشمے تلاش کرتا ہے، دلبری کے — جو سرِّ دلبری سے آشنائی کا دَم بھرتا ہے — یہ اپنا ہی تو دل ہے جو ناکام ہو، تب بھی برے وقت میں کام آتا ہے — یہی ہے وہ مقام جہاں وقت کے فاصلے سمٹ جاتے ہیں — جہاں دُور کا جلوہ پاس نظر آتا ہے۔ اِسی دل کو عرشُ اللہ کہا گیا — اِسی سے منزلیں طے ہوتی ہیں — یہی دل بارگاہِ صمدیت میں قبول کرواتا ہے — اِسی دل کی بدولت زمین پر سجدہ ہو، تو آسمان سے منظوری آتی ہے — سب جلوے اسی کے ہیں — سب رعنائیاں اسی کی ہیں — سب نغمے اسی کے — سب اَلاپ اسی کے — سب کرشمے اسی کے — سب فریادیں اسی کی اور سب قبولیت اسی کی — دل سلامت ہے تو سب سلامت، نہیں تو کچھ بھی نہیں — میں کب سے ہوں اِس جہانِ اجنبی میں — ؟ کس کے لیے ہوں — ؟ اور کب تک ہوں؟ میں کس کے انتظار میں ہوں — ؟ کیا پیدا ہونے سے پہلے بھی میرا کوئی کردار تھا — ؟ کیا یہ سب فریادیں جدائی کے قصے ہیں — ؟

کیا یہ داستان، داستانِ فراق ہے — ؟ کیا یہ لباس بدلنے کے بعد ہم اپنے اصل سے ملنے والے ہیں — ؟ کیا اُسے بھی انتظار ہے؟ کیا یہ سب یک طرفہ ہے؟ نہیں! ایسے نہیں ہو سکتا — یہ بڑا گہرا راز ہے — میری خوشی کسی اور کے خوش رہنے سے ہے — اور کوئی شے ختم ہوتی ہے تو میرا غم بنتا ہے — مرتا وہ ہے اور روتا مَیں ہوں — بیمار وہ ہوتا ہے، پریشان مَیں ہوتا

ہوں — مفلس وہ ہوتا ہے، سخی مَیں بنا دیا جاتا ہوں — وہ شادی کرے، مَیں بارات بن جاتا ہوں — وہ سفر پر جانے لگے، مَیں الوداع کرتا ہوں — وہ آخری سفر پر چلا جائے، مَیں ماتم کرنے میں سوگوار ہو جاتا ہوں — مَیں بدلتا رہتا ہوں، لیکن مَیں قائم رہتا ہوں — کیا تبدیل ہوتے رہنا ہی میرا کردار ہے؟ کیا مَیں اپنا نصیب ہوں —؟ کیا مَیں کسی اور کا نصیب ہوں —؟ کیا میں خوش نصیب ہوں —؟ کیا میں بدنصیب ہوں —؟ میں بہر حال اپنے نصیب پر خوش ہوں — میں اپنے حال پر راضی ہوں۔ میرا مستقبل مجھے راضی رکھے گا — جو آج خوش نصیب ہے، وہ کل بھی خوش نصیب ہو گا — دوستی سلامت رہے تو زمانہ سلامت رہتا ہے — دنیا بہتر ہو تو آخرت بھی بہتر ہو جاتی ہے — ہر شے کا ہونا ہی بہتر ہے — ستم کے زمانے ہوں تو لذّتِ ستم کو قائم رکھو — کرم کے زمانے ہوں تو بھی آنکھ کو خشک نہ ہونے دو — تر آنکھ ہی ضمانت ہے بخشش کی — آنکھ میں موتی ہوں تو دامن میں گوہرِ مراد ہوتا ہے — اور اگر آنکھ خشک ہو تو دامنِ مراد — خالی ہو گا —!!

بس یہی راز ہے کہ مَیں اور میرا گرد و پیش اِس لیے متعلّق ہیں کہ میری آنکھ میں نمی رہے — اور یہی آنسو مجھے وابستہ رکھتے ہیں — اپنے آپ سے، اپنے ماحول سے، اپنے ماضی سے، اپنے مستقبل سے — اپنے اصل سے — اپنے محبوب سے — اپنے مقام سے — اپنے مالک و معبود سے —!

خدایا! میری یہ تمنّا ضرور پوری فرمانا کہ میرے آنسو خشک نہ ہوں اور میرے آنسو رائیگاں نہ ہوں — اِن قطروں میں کئی قلزم پنہاں ہیں — یہ آنسو عہدِ گزشتہ کی نجات ہو سکتے ہیں اور انہی کے دَم سے عہدِ آئندہ — سب کے لیے — ہر ایک کے لیے — بد اور نیک کے لیے — باعثِ رحمت ہو سکتا ہے —!

خدایا! یہ آرزو ہے کہ مَیں سلامت رہوں اور سب کی سلامتی کے ساتھ — کیونکہ میرا ہونا دراصل میرے وابستگان کا ہونا ہے۔ جنّت میں ہونا سب کے ساتھ ہونا چاہیے — جنّت

ہے ہی بس وہی مقام، جہاں کوئی بُری خبر نہ آئے — کوئی یہ نہ بتائے کہ فلاں عزیز دوزخ میں چلا گیا—!

خدایا! اپنے ماننے والوں کو— اپنے محبوب ﷺ سے محبّت کرنے والوں کو— سب کو معاف فرما— اُمّتِ رسولِ عربی ﷺ پر رحم فرما میرے مولا!— سب، سب کے ساتھ سلامت رہیں — یہاں بھی مل کر — وہاں بھی مل کر — زندگی سب کی زندگی ہے اور جنّت سب کی جنّت ہے—! یہی پیغام دے گیا وہ ایک لمحہ جو آیا اور اس کے آتے ہی زمانے بدل گئے — سب سلامت تو ہم سلامت!!

وسعتیں

یوں تو ہمارے گرد انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی چند انسانوں میں بسر ہو جاتی ہے۔ چند اپنے اور چند ہی بیگانے —یہی ہے ہماری کل کائنات۔ کُل اثاثہ یہی چند نفوس ہیں۔ اگر صرف دیکھیں تو ایک وسیع ہجوم ہے لیکن اگر غور کریں تو ہمارا دائرۂ واقفیت بہت ہی مختصر ہے۔ لامحدود انسانوں میں ایک محدود دائرہ، بہت غور طلب بات ہے۔

کیا ہم سب الگ الگ رہنے کے لیے پیدا ہوئے؟ کیا یہ مجبوری اور بیگانگی ہمارا مقدّر ہے؟ کیا یہ ہماری ناکامی ہے؟ یہ سب کیا ہے؟ ہم ایک زندگی میں کتنے انسانوں کو نام سے پکار سکتے ہیں؟ کتنے انسان ہمیں نام لے کر بلا سکتے ہیں؟ اگر تعلّق اتنا محدود ہے تو یہ وسیع لاتعلّقی کیا ہے؟ یہ اجنبی منظر میرے کس کام کا —یہ اخبار، یہ خبریں —ہمارے کس کام کی —کون ہے وہ جس کے بارے میں مجھے بتایا جا رہا ہے۔ کون ہیں وہ جو میرے لیے خبریں بن رہے ہیں —میرے لیے تعلّق نہیں بنتے، بس خبریں بنتے ہیں —ہر خبر میرا اِحساس نہیں، ہر واقعہ میرے متعلّق نہیں — ہر اہم چیز میرے لیے اہم نہیں —مجھے شناسائی کے ایک مختصر دائرے میں جکڑ کے رکھ دیا ہے اور میرے سامنے ہوتا ہے، شب و روز تماشا —!

مجھ پر اپنے متعلقین اور وابستگان کے فرائض پورا کرنے کی ذمہ داری ہے۔ باقی منظر صرف دیکھنا ہی تو ہے —ہر انسان اپنے اپنے مدار میں چل رہا ہے۔ اپنے مخصوص مقناطیسی فیلڈ

میں بے بس و پابند ہے — یہ بے بسی شاید زندگی کی اساس ہے۔ ہم اپنے شب و روز کا تجزیہ کرنے میں اور شب و روز کے بارے میں ایک فیصلہ کُن بیان دینے میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ اور ہمارا فیصلہ ہماری مجبوری سے متاثر ہوتا ہے اور یوں اسی شغل میں زندگی تمام ہو جاتی ہے —!

ہم پر اِس وسیع ہجوم کی ذمہ داری نہیں — ہم جواب دہ ہیں صرف اُس دائرے میں جو ہمارا ہے — اُس زندگی کے بارے میں جو ہماری ہے۔ اس عمل کے بارے میں جس کی ہمیں مہلت دی جاتی ہے۔ اِس لامحدود وقت سے صرف چند گنتی کی ساعتیں ہمارے حصے میں آئیں۔ ہمیں وہیں تک ہی رہنا پڑتا ہے۔ وہ ساعتیں کٹ جائیں تو ہماری زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ وقت کا قافلہ چلتا رہتا ہے۔ ہم ہی اس قافلے سے بچھڑ جاتے ہیں۔ وسعتیں ہماری تنہائی کو مزید تنہا کر دیتی ہیں۔

ہماری زندگی ہمارے سورج اور ہمارے چاند سے وابستہ ہے۔ ہم سورج سے پرے وسعتیں جاننے کا شوق رکھتے ہیں۔ اِن وسعتوں کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ اگر انسان تقریباً دو لاکھ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ایک سیّارے سے دوسرے سیّارے تک سفر طے کرے تو کبھی کبھی یہ فاصلے لاکھوں سال تک بھی ختم نہیں ہوتے۔ وسعتیں بڑھتی جاتی ہیں — خلائیں گہری ہوتی جاتی ہیں — یہ کسی اور مخلوق کا فاصلہ ہے جو انسان طے کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کے مختصر ایام خلاؤں میں بھٹکتے ہی گزر جاتے ہیں اور آخر ہماری خاک اِس خاکدان میں واپس چلی جاتی ہے۔ وسعتیں ختم نہیں ہوتیں، صرف زندگی ختم ہوتی ہے —!

بنانے والے نے ہر طرف لامحدود مناظر بنائے ہیں — ہر انسان کو ہر جلوہ نظر نہیں آتا اور جنہیں کچھ نظر آتا ہے، انہیں بھی بس ایک حد تک آشنائی ہوتی ہے۔ انسان اپنی حدِّ نگاہ کے اندر ہی دیکھنے پر مجبور ہے اور یہ دیکھنا، ضروری نہیں کہ صحیح ہو — اصل جلوہ، نظر آنے والے جلوے کے برعکس بھی ہو سکتا ہے — نظر آنے والے ستارے، یوں محسوس ہوتے ہیں کہ

ننھے ننھے ٹمٹماتے ہوئے دیے ہیں۔ روشن فانوس، ہوا میں معلّق، ہماری چھت کو سجانے کے لیے کاریگری کا کمال ہے — لیکن یہ کمال، اُس کمال کے مقابلے میں کچھ نہیں جو ستاروں کی اصل کو جاننے میں ہے۔ جتنے ستارے ہیں اگر اتنی زمینیں اکٹھی کر دی جائیں تو شاید ایک ستارے کے اصل وجود کے برابر ہو — وسعت کا اندازہ خوف پیدا کرتا ہے —!

صرف یہی نہیں۔ کچھ ستارے شدید گرم اور کچھ یخ ٹھنڈے — قدرت ہے، قادرِ مطلق کی — اِس وسعت کا آخر ہمارے ساتھ کیا تعلّق — نہ ہم اس کو طے کر سکتے ہیں، نہ ہم اسے پوری طرح محسوس کر کے خوش ہو سکتے ہیں۔ بے تعلّق وسعتیں اور بے تعلّق فاصلے اِنسان کے لیے کیا پیغام رکھتے ہیں۔ ہم "زمینی مخلوق" آخر آسمانی وسعتوں سے کیا حاصل کریں گے۔ ہمیں اپنے جامے میں رہنے سے ہی عافیت نصیب ہو سکتی ہے۔ آسمانوں پر جھنڈے لگانے سے کیا مسئلہ حل ہوا! زندگی تاریک تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں دُور کی چمک لے ڈوبی — پاس ہی کراہنے والی زندگی ہمارے لیے اہمیّت کھو چکی ہے — ہماری بینائی ہی ہماری راہ میں حائل ہو چکی ہے — ہماری دُور بینی دراصل فرائض سے فرار ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں یہ فرار آسانی سے ممکن ہے — انسان پر بم گرانے والے، انسانوں کو تباہ کرنے والے، کون سے سفر پر روانہ ہیں — کون سی وسعت کو جاننے کے درپے ہیں!

وسعتیں اور فاصلے ختم نہیں ہو سکتے۔ نظارے لامحدود ہیں اور زندگی محدود — ہماری صلاحیتیں تو ہماری زندگی سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ ہم مناظر دیکھنے کے لیے تیاری کر رہے ہوتے ہیں کہ ہماری بینائی ناراض ہو جاتی ہے۔ ہم بہت زیادہ علم بلکہ علوم اپنے ذہن میں محفوظ کرتے ہیں۔ ادیب، اسکالر اور محقق کہلاتے ہیں لیکن اچانک یادداشت جواب دے جاتی ہے — خدا اُس وقت سے بچائے۔

وسعتیں انسان کو مزید محدود بنا رہی ہیں۔ لائبریریاں علم سے محبّت کی بجائے علم کی ہیبت طاری کر رہی ہیں — کتابوں کے سمندر سے کیا حاصل کیا جائے — کہاں سے شروع کی

جائے اور کہاں ختم ہو گی یہ داستان۔ زندگی کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے لیے کتابیں پڑھنا پڑتی ہیں اور یہ سب کتابیں، بے شمار کتابیں، اتنے متضاد فارمولے بتاتی ہیں کہ زندگی پھر تلاش میں ہی رہتی ہے — یہ تضاد بھی بہت وسعت کا مالک ہے۔ ہم کتابوں میں گم ہو جاتے ہیں اور زندگی ہمارے پاس سے رخصت ہو جاتی ہے — ہم دیکھتے رہ جاتے ہیں — ہمارے اپنے، ہمارے پاس نہیں ہوتے —!

اور، پھر ہم زندگی کی اس عظیم وسعت سے نکل کر موت کی عظیم تر وسعت میں داخل کر دیے جاتے ہیں۔ نہ آنے پر اختیار، نہ جانے پر اختیار۔ کہنے کو ہم بڑے بااختیار ہیں — موت کے بعد کیا ہو گا — لیکن کون ہو گا — بلکہ کیوں ہو گا — اس سوال کے جواب سے ہمیں مذہب ہی آشنا کرتا ہے — مذہب ایک اور وسعت ہے — لامحدود کائنات — واحد و قہّار اللہ کی حکومت، موت کے بعد — جب رحم اور رعایت کا دَور ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک عظیم نفسا نفسی، ایک خوف کہ ہم نے وہ نہ کیا جو ہمیں کرنا تھا اور ہم تو بس وسعتوں کے چکر میں گم رہے — اور ہم سے جواب مانگا جائے گا، حقوق العباد کے بارے میں، حقوق اللہ کے بارے میں —!!

سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ کائنات کے خالق نے یہ سب عظیم فاصلے اور عظیم وسعتیں تخلیق فرمائی ہیں — اِن کے علاوہ بھی بڑی وسعتیں ہیں۔ مخلوقات کی اتنی اقسام ہیں کہ اِس وسعت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں نازل ہونے والی زبانیں — ایک وسیع و عظیم علم ہے — پہاڑ — سمندر — صحرا — بے کراں وسعتیں ہیں — ایٹم کے اندر کرشمہ سازی کے عجوبے — حیرت پیدا کر دینے والی وسعت — ایک بیج میں بے شمار درخت اور ہر درخت میں بے شمار بیج، حیرت ہے — وسعت ہی وسعت ہے۔ زندگی سے موت اور موت سے زندگی پیدا کرنے کا عمل، سیپ کے باطن میں موتی کا بننا، مٹی کی تاریکی میں بیج کا پلنا، سب وسعتوں کی اطراف ہیں — لیکن سب سے بڑا عجوبہ، سب سے بڑی وسعت، انسان کی تخلیق ہے — یہ اشرف المخلوقات — وسعتوں کا مالک ہے — کائنات میں اور کوئی مخلوق نہیں جو یہ دعویٰ

کرے کہ وہ وسعتوں کی مالک ہے۔

انسان کے لیے وسعتیں ہیں — انسان کے دن منوّر کرنے کے لیے سورج دہک رہا ہے، جل رہا ہے۔ انسان کی راتوں کو سکون بخشنے والا چاند روشنی رکھتا ہے —ستارے اپنی ذاتی وسعتوں کے باوجود انسان کے آسمان کو ایک حسن و جمال کا منظر عطا کرتے ہیں۔ انسان کی خوراک کے لیے اہتمام کر دیا گیا ہے —زمین سے اگنے والے پودے، سبزیاں، پھل انسان کے دستر خوان کی زینت بنتے ہیں اور پھر چراگاہوں میں چرنے والے ریوڑ، ہوا میں اُڑنے والے پرندے اور پانی میں تیرنے والی مچھلیاں انسان کے لیے دودھ، گوشت، گھی، مکھن، پنیر، کیا کچھ نہیں دیتے —وجود کے لیے خوراک اور لباس کے لیے اُون —!

انسان ایک بے پناہ اور بے انتہا وسعت ہے —اِس کے اندر وسعت ہے —خیال کی وسعت، احساس کی وسعت، شعور و آگہی کی وسعتیں انسان ہی کے لیے تو ہیں —خالق نے اپنے اظہار کے لیے انسان ہی کو منتخب کیا —اپنی محبّت کے لیے انسان ہی کا دل چنا گیا —!

یہ چناؤ بھی بڑا عظیم اور وسیع ہے —انسان کے علاوہ اور کوئی مخلوق یا وسعت اِس امانت کی اہل نہ پائی گئی —یہ جہالت ہی سہی، اپنی جان پر ظلم ہی سہی، لیکن ہے یہی سب سے بڑی بات، عظیم وسعت کہ ایک عظیم ترین خالق، وسعتوں کا خالق، اگر آیا تو اِسی انسان کے دل میں آیا —اُس نے اپنا اظہار کیا تو اِسی انسان کی زبان سے —یہی وارث ہے کائنات کا —اور یہی وارث ہے اُس کی محبّت کا —سوز و گداز صرف انسان کے پاس ہے۔ فرشتوں اور جنّات کے پاس عبادت تو ہے لیکن محبّت اور عشق کی مستی انسان کا نصیب ہے —!

ستاروں کی گزر گاہیں ماپنے کے بجائے ہم اُس احسان کا جائزہ لیں جو ہم پر کیا گیا — اُس وسعت کا احساس کریں جو ہمیں عطا ہوئی —اُس تعلق کا شکر ادا کریں جو ہمیں نصیب ہوا — انوکھا، نرالا، وسیع تعلق —اصل وسعت، یہی وسعت ہے۔ اپنی ہستی اور اُس کا مدّعا سمجھنا — اپنے خالق کو پہچاننا، اپنے رازق سے باخبر رہنا —اپنے ہونے سے آشنا ہونا، اور اپنے نہ ہونے سے

قبل اَز وقت آ گاہ ہونا — باقی سب وسعتیں حجاب ہیں۔ قابلِ دریافت اور قابلِ عزت صرف وسعتِ انسان ہے — وسعتِ قلب ہے — وسعتِ زمین و افلاک اپنی جگہ، لیکن وسعتِ دل — کیا بات ہے — جس میں وسعتیں پیدا کرنے والے، وسیع عرش و کرسی رکھنے والے، خالقِ کُل کا وسیع جلوہ سما سکتا ہے — دلِ بینا پر باقی سب وسعتیں اور فاصلے نثار! — یہی ہے حاصلِ ہستی اور یہی ہے مدّعائے حیات!!

عظیم لوگ

تاریخِ عالم اور تہذیبِ آدم کا بغور مطالعہ کرتے وقت ہمیں دو قسم کے لوگ نظر آتے ہیں — گمنام اور ناموَر۔ اپنی سادگی اور سادہ دلی میں مست رہنے والے گمنام لوگ معاشرے، نسلیں، قومیں اور ملّتیں بنتے رہے ہیں۔ یہی لوگ ناموَروں کو پیدا کرتے ہیں اور خود کسی ناموَری کے ذوق سے یکسر بے نیاز، اپنی دنیا میں مصروف و سرشار رہتے ہیں۔ یہ عظیم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوش رہتے ہیں۔ اُن کے تذکرے پڑھ کر خوش رہتے ہیں، اُن کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ بغیر کسی شور و غوغا کے زندگی بسر کرتے ہیں اور کسی کو بہت بڑا جنازہ بنانے کی تکلیف دیے بغیر خاموشی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

یہ لوگ کب آئے، کب گئے، کسی کو خبر نہیں۔ یہ لوگ اپنے ماحول کے ظالم حصار میں رہے۔ اپنے گھروں میں، اپنے شب و روز میں مبتلا، اپنے آپ میں مست، اپنی غریبی اور غریب الوطنی میں مجبور، اپنے محدود دائرے میں مقیّد، کسی شہرت و عظمت کے تصوّر سے آزاد، کسی تاریخ میں داخل ہونے کے جذبے سے یکسر لاتعلّق، ناموَری کے حصول کے جذبوں سے عاری، زندگی کے تھپیڑے کھاتے ہوئے آئے اور تھپیڑے کھاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ انہیں اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیوں اور کب غلام ہوئے اور کیوں اور کیسے آزاد ہوئے۔ یہ لوگ ضرورتیں پوری کرتے کرتے پورے ہو گئے۔ اپنے بعد کوئی بہت بڑی یادگاریں نہیں چھوڑ گئے، کوئی بڑے کارنامے سرانجام نہیں دے گئے۔ عوام النّاس کا یہ ہجوم ایک الگ راز ہے، اس کی ایک الگ اہمیت ہے۔ انہیں خالق نے الگ کام کے لیے تخلیق کیا۔

دوسرا گروہ ناموَروں کا ہے۔ عظیم انسان، اپنی ذات کو نمایاں اور روشن کرنے والے یہ لوگ، وقت کے چہرے پر اپنے نام کی مہریں ثبت کرتے رہے۔ یہ فتوحات کرتے تھے۔ علم و ادب، فلسفہ، تاریخ و تہذیب، عمرانیات و عرفانیات، ریاضیات و معاشیات میں مقامات حاصل کرنے والے یہ عظیم لوگ ایک الگ طرح کی زندگی رکھتے تھے۔ یہ درد کے صحراؤں میں بیٹھ کر دنیا کو نخلستانوں کی خبر دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنے اشکوں سے چراغاں پیدا کرتے رہے۔ یہ بے بسی میں رہ کر بھی دنیا کے لیے نویدِ حیات کے نسخے بناتے رہے۔ اِن کی تشنگی دوسروں کے لیے آبِ حیات سے کم نہ تھی۔ دنیا کو سیراب کرنے والے خود اپنی پیاس لے کر خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ عظمت کا سفر، کرب کا سفر ہوتا ہے۔ جب لوگ سوتے ہیں، یہ لوگ جاگتے ہیں۔ اِن کے فارمولے جدا، اِن کے جذبے الگ، اِن کے آغاز، اِن کے انجام سب نرالے تھے۔

فطرت نے یوں تو ہر ایک کو یکساں انداز سے پیدا کیا ہے، ہر ایک کو یکساں صفات عطا کی ہیں، ہر بچہ ایک ہی بچہ ہوتا ہے اور ہر مرنے والا ایک ہی میّت، لیکن غور والی بات یہ ہے کہ قدرت نے کچھ بچوں کو بچپن سے ہی علیحدہ بنایا۔ کسی کا چہرہ خوبصورت اور بہت زیادہ خوبصورت بنا دیا گیا، اب اِس چہرے کی وجہ سے وہ شخص زندگی میں باقیوں سے ممتاز رہے گا۔ اُس کی صفات الگ ہوں گی اور وہ ایسے مقامات حاصل کرے گا جو عام انسانوں کو نصیب نہیں ہوتے۔ حُسن کامیابیوں کے میدان میں اپنا سفر طے کرتا ہے اور یہ سفر انسان کو عظمتوں کے علاقے میں لے جاتا ہے۔

کچھ لوگ پروانہ صفت پیدا ہوتے ہیں۔ وہ محبّت کے پرستار اپنے وجود میں ایک نئی اُمنگ موجود پاتے ہیں، اور علم اور تعلیم کے بغیر عشق کے عجائبات سر کرتے ہیں۔ شوق والا دل عطا ہے، یہ فطرت کا عطیہ ہے اور یہیں سے انسان کی عظمت کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اِس میں کسی کے ناراض ہونے کی بات نہیں۔

یہ بات سمجھنے کے لیے مشاہدے کی ضرورت ہے کہ جو آدمی عظمت میں نمایاں ہو،

اُس کو اگرچہ عام انسانوں کی طرح پیدا کیا گیا لیکن اُس کی صلاحیتوں میں کوئی ایک صلاحیت ایسی رکھ دی گئی جس نے ہر صورت کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے۔ پارہ چین سے نہیں بیٹھتا، آگ روشن ہو کر رہتی ہے، دریا آخر روانہ ہو کر رہے گا۔

ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ ریاض کرنے سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہمارا اپنا کمال ہے لیکن جن لوگوں کو ریاض کے بغیر ریاض کا نتیجہ حاصل ہو، انہیں کیا کہا جائے! ہزار محنت کی جائے، ہزار اُستاد رکھے جائیں، شعر اُس وقت تک موزوں نہیں ہوگا جب تک انسان کے باطن میں شعریت اور نغمگی نہ ہو۔ یہ صفات کیسے پیدا ہوتی ہیں، اِس کا کوئی جواب نہیں۔ اسے اللہ کا فضل کہتے ہیں۔

عظمت گہوارے میں عظمت ہوتی ہے۔ یہ کسی سکول کی تعلیم کا نتیجہ نہیں۔ یہ قدرت کے دیے ہوئے علم کا نتیجہ ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ بڑے مصنّفوں سے فیض حاصل کریں، غزالیؒ کو پڑھنا بہت ضروری ہے لیکن یہ سوچنا بھی فرض ہے کہ غزالیؒ کو کس نے غزالیؒ بنایا۔ عظمت کی شاہراہیں بننے سے پہلے بھی عظیم لوگوں کا وجود ہوتا ہے۔ یہ لوگ فطرت کے انعام یافتہ ہوتے ہیں۔ دنیا کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم کرنا مشکل نہیں کہ انسانوں میں یکساں صفات کے باوجود، الگ الگ مزاج بنے ہیں۔ ایک مسجد میں مل کر باجماعت نمازیں ادا کرنے والے کئی سالوں کی رفاقت کے بعد بھی مختلف المزاج نظر آتے ہیں۔

قدرت نے کچھ ایسا انتظام کیا ہے کہ ایک انسان جو بظاہر قابلِ توجہ نہیں، اُس کو بھی پسند کرنے والے بلکہ پرستش کرنے والے مل جاتے ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرنے والا اپنی پسند کا انسان دیکھتا ہے اور دونوں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لیلیٰ ایک لڑکی، عام فہم، مجنوں بھی اپنی جگہ پر ایک انسان، لیکن دونوں کے درمیان محبّت کے ناتے اِس طور پر طے ہوئے کہ دونوں نمایاں ہوتے گئے اور اِن کی داستان کتنے شعراء کے لیے ایک نمایاں بلکہ عظیم کلام کا باعث بنی۔ لیلیٰ مجنوں تو چلو عورت اور مرد تھے، مجاز ہوگا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عشقِ حقیقی ہے لیکن ہم سے زیادہ جاننے والے یعنی حضرت مولانا جامیؒ اور امیر خسروؒ اِس داستان

کو داستانِ عشقِ حقیقی کہتے ہیں۔

یہ کیا راز ہے کہ کوئی صحرا میں عظیم بن رہا ہے، کوئی پہاڑوں پر عظیم ہو رہا ہے، کوئی فتوحات میں اور کچھ لوگ شکست میں عظیم ہو گئے۔ روم نے یونان کو فتح کر لیا، اور یونانیوں کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اُن کے شاگرد ہو گئے، اُن سے سیکھنے لگ گئے۔ فاتح ہونے کے بعد اُن کے غلام ہو گئے۔ یزید "فاتح" ہوا، لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باعثِ ندامت —!

بہر حال عظیم لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پیدا ہوتے ہی عظیم ہوتے ہیں۔ اُن کی پیدائش پر فطرت کی طرف سے نشانیاں نازل ہوتی ہیں، چرند پرند کو باخبر کیا جاتا ہے کہ آ گیا وہ، جسے بھیجا گیا عظمت کا تاج پہننے کے لیے۔ چھوٹے دل والے لوگ اِس میں حسد نہ کریں، یہ اُس سماج کی بہت عزت ہے جس میں منتخب اور مقدس نفوس کو بھیجا جائے۔ چھوٹا آدمی جھگڑتا ہے، لڑتا ہے، کہ اُس نے عظیم ہونا تھا۔ وہ پروں کے بغیر پرواز کرنا چاہتا ہے۔ وہ صلاحیتوں کے بغیر مرتبہ چاہتا ہے۔ وہ حق کے بغیر حصہ لینا چاہتا ہے۔ اُس کے نصیب میں محرومی لکھی جا چکی۔ فطرت کے کام دیکھتے جاؤ، اس نے کوّا بنایا اور مور بنایا۔ یہ بظاہر فرق ہے لیکن دونوں ایک ہی جلوے کے حصے ہیں۔ رات دن کا حصہ ہے، دن رات کا حصہ ہے۔ زندگی موت کا حصہ ہے، موت زندگی کا حصہ ہے۔ اِس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔

دوسری قسم کے عظیم لوگ وہ ہیں جو محنت کو کرامت بناتے ہیں۔ وہ اپنے عمل میں تواتر قائم کرتے ہیں، اپنی لگن میں استقامت قائم کرتے ہیں، اپنے سفر میں یکسوئی حاصل کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ چل کر آخر ایک دن وقت کی بلند چوٹیاں سر کر لیتے ہیں۔ یہ کام بھی ہر ایک کے بس کا نہیں ہے۔ چھوٹے ظرف کے لوگ اگر یہ عزم کر لیں کہ کسی درخت کے پتے گن کر دَم لیں گے تو آدھا کام کرنے کے بعد وہ بالعموم یہ کہیں گے: "چھوڑو! یہ کیا کام ہے، ہم کوئی اور بڑا کام کریں گے" — اور اس طرح مقاصد بدلتے بدلتے بے مقصدیت پیدا کر کے گمنامیوں کی وادیوں میں چلے جاتے ہیں۔

تیسری قسم کے عظیم لوگ وہ انسان ہیں جنہیں کوئی لمحہ، کوئی خوش نصیب لمحہ، کوئی

انسان، کوئی نصیب ساز انسان، کوئی واقعہ، کوئی خوشگوار واقعہ اچانک اُن کے پاس سے گزرتا ہوا اُنہیں عظیم بنا جاتا ہے۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو رات کو گمنامی کی نیند سوئے اور صبح ناموری کی روشنی میں بیدار ہوئے۔ یہ تو عام فہم بات ہے۔ کسی خاموش شاعر کا کلام چھپنے سے پہلے عظیم نہیں ہوتا اور کلام چھپ جائے تو ناموری عطا ہو جاتی ہے۔ ایک انسان اپنے شب و روز میں میانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اُس کے سامنے ایک چیلنج آتا ہے، وہ اُس چیلنج کو قبول کرتا ہے اور ایک خوش بخت عمل کر گزرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ عظیم غازی علم الدین شہیدؒ بن جاتا ہے۔ اس طرح بے شمار مثالیں ہیں اُن لوگوں کی، جنہیں واقعات نے عظیم بنایا۔

یہاں تک تو بات واضح ہے کہ عظیم لوگ آتے رہتے ہیں، اپنی عظمتوں کو فیض بناتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی عظمتوں کو ایک جھنڈا بنا کر کسی سرزمین پر گاڑ جاتے ہیں۔ آنے والی نسلیں انہیں دُعائیں دیتی ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ مذہب کے حوالے سے عظیم لوگوں کے ساتھ وابستگی اُس وقت تک خطرناک ہو سکتی ہے جب تک وہ عظیم لوگ ایک مذہبی زندگی نہ گزار رہے ہوں۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے عظیم لوگوں کو باعثِ عزت سمجھتے ہوئے اپنے لیے اُولی الامر مان لیں تو اُولی الامر کا، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے تابع ہونا ضروری ہے، ورنہ اُس کی اطاعت کی بجائے اُس کے خلاف جہاد لازمی ہے۔ یہ بات ہمارا ذہن قبول نہیں کر سکے گا۔ ہم کسی ایک صفت میں حاصل ہونے والی عظمت کے نتیجے میں بننے والے عظیم آدمی کو باعثِ تقلید مان لیتے ہیں اور یہاں سے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

ایک عظیم وکیل ضروری نہیں کہ عظیم امام مسجد ہو۔ بس عظیم کو اُسی شعبے تک عظیم سمجھنا چاہیے جس میں اُس نے عظمت حاصل کی ہو۔ اس شعبے میں اس کی تقلید بھی جائز ہے لیکن اُس کو اُس کے شعبے سے نکال کر دوسرے شعبے میں باعثِ عظمت ثابت کرنا دھوکا ہے۔ مثلاً لارڈ رَسَل کا فلسفہ صحیح ہے، خوبصورت ہے لیکن اُس کی زندگی کی تقلید کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ اُس کا فلسفہ سند، لیکن اُس کی زندگی مومن کے لیے غیر مستند ہے۔

اپنے ہاں بھی جو لوگ عظیم ہیں، اُن کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ جس شعبے میں

اور جس مقام پر وہ عظیم ہیں، اُن کو سلام پیش کیا جائے اور جہاں اُن کی زندگی معذرت سے گزر رہی ہے، وہاں سے گریز کیا جائے۔ ہمارے ہاں دِقّت یہ ہے کہ جو علماء صاحبان ہیں، وقت کے تقاضوں کی عظمتوں سے بے خبر ہیں، اور جو لوگ عظیم ہیں وہ احکامِ شریعت سے غافل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم جب کسی ہیرو کی تقلید کرتی ہے تو دین سے بے راہ ہو جاتی ہے اور اگر دینی طور پر پابند زندگی گزارے تو وقت کے تقاضے نظر انداز سے ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں تک متعصّب ہیں کہ کسی بڑے آدمی کا اس طرح نام بھی نہیں سننا چاہتے کہ وہ دینی معاملات میں کمزور تھا۔ ہم اُس کی خوبی کے پرستار ہیں اور عظمت کی پرستش کے دوران میں اُس کی زندگی کے غافل حصے کی بھی تقلید کر جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی عظیم مفکر، قوم کو عظمتوں سے آشنا کرنے والا، دین کے کسی فرض کی ادائیگی میں ذرا کمزور ہو تو اتنا کہنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی کہ یہاں وہ صحیح ہے، یہاں وہ صحیح نہیں۔

ہماری قوم ایک مثالی عظمت اور عظیم آدمی کی تلاش میں ہے، اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہم لوگ سمجھ نہیں سکتے کہ دنیا کے عظیم انسانوں میں صرف ایک یا چند صفات کی عظمت ہے۔ واحد عظیم ہستی حضورِ اکرم ﷺ کی ہے جن کی زندگی کا ہر شعبہ مثالی، ہر عمل بے مثال، جن کی ہر صفت، جن کی نشست و برخاست، جاگنا سونا اور بولنا سننا باعثِ تقلید ہے، جن کے نقشِ قدم پر چلنا ہی فلاح کی راہ ہے۔ باقی تمام عظیم ہستیوں کا اُن کی اُس صفت کے مطابق جائزہ لینا چاہیے جس میں وہ عظیم ہیں۔ ہر آدمی، خواہ کتنا ہی عظیم ہو، تقلید کے قابل نہیں۔ اگر ہم ہر ایک کو قابلِ تقلید رہنما بناتے رہے تو قوم ایک بے جہت اور بے سمت سفر میں گم ہو سکتی ہے۔ اکابرینِ ملّت کو آفتابِ رسالت ﷺ کی کرنیں ہی مانا جائے۔ بس نور ظہور سب حضور ﷺ کا ہے۔ باقی سب عظمتیں صرف دیکھنے کے لیے ہیں، تقلید کے لیے نہیں۔ تقلید صرف اُس ذات کی، جسے اللہ کی تائید حاصل ہے۔

اَمیر غریب

اِس دنیا میں نہ کوئی اَمیر ہے، نہ کوئی غریب۔ یہ سب اپنا اپنا خیال ہے۔ خیال غریب ہو جائے تو انسان غریب ہو جاتا ہے۔ خیال اَمیر ہے تو انسان اَمیر ہے۔ جس طرح قول ہے کہ یتیم وہ نہیں جس کا باپ فوت ہو جائے، بلکہ یتیم وہ ہے جو علم و ادب سے محروم ہو جائے۔ اسی طرح جس آدمی کی جیب میں مال نہ ہو، وہ غریب نہیں، بلکہ جس کے پاس کوئی خیال نہ ہو، وہ غریب ہے۔ پھر بھی اِن الفاظ کے کچھ تو معانی ہیں۔ اِن کی کوئی نہ کوئی تو رینج ہو گی، ہر چند کہ اس رینج کا فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہو تا ہے۔

انسان کی ضروریات پوری ہوتی جائیں اور محض پوری ہو سکیں تو اُسے متموّل کہا جا سکتا ہے۔ جس آدمی کے پاس ضروریات سے زیادہ مال ہو، اسے امیر کہا جا سکتا ہے، اور جس کے پاس ضرورت سے کم ہو، اسے غریب ہی کہا جائے گا، بشر طیکہ لفظ "ضرورت" کی کوئی جامع تعریف ہو جائے۔ ایک انسان کے لیے آسائش اور سامانِ تعیش ضرورت بن کے رہ جاتے ہیں اور دوسرے کے لیے رشتۂ جاں اور تارِ حیات کی بقا سے زیادہ کوئی اہم ضرورت نہیں ہوتی۔ اِس فرق کی وضاحت ناممکن ہے۔ انسان حریص ہے، انسان ناشکر گزار ہے، انسان ظالم ہے، انسان مسافر خانوں میں ہمیشہ آباد رہنا چاہتا ہے۔ قبرستان میں کھڑے ہو کر اپنے ہمیشہ رہنے کا بے بنیاد دعویٰ کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اِس دنیا میں جو آیا، اسے واپس جانا پڑتا ہے۔ پھر دعویٰ کیا؟ قیام کیا؟ اور ضرورت کیا؟ اگر ٹھہرنا مقدّم ہو تو رخصت کی کیا ضرورت، اور اگر جانا

ضرورت ہو تو ٹھہرنے کے پروگرام بے معنی ہیں۔ اگر ظاہری مرتبے قائم بھی رہ جائیں تو انسان اندر سے قائم نہیں رہتا۔ باہر سے خطرہ نہ ہو، تو بدن کی چار دیواری اندر سے گلنا شروع ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے بوجھ تلے آپ ہی دب کے رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خواہشات کے پتھروں میں چنواتا رہتا ہے اور جب آخری پتھر اُس کی سانس روکنے لگتا ہے تو پھر وہ شور مچاتا ہے کہ اے دنیا والو! کثرتِ خواہشات سے بچو، سہولت طلبیوں سے گریز کرو، مال کی محبّت سے پرہیز کرو، کثرتِ مال بقولِ ارشادِ باری تعالیٰ تمہیں غافل کر دے گی، حتیٰ کہ تم قبروں میں جا گرو گے اور پھر زندگی کو اَز سرِ نو شروع کرنے کا کوئی موقع نہیں ہو گا، نہ آپ کو اِس کی اجازت دی جائے گی۔

دولت جمع کرنے کی خواہش اور اسے گننے کا مشغلہ ہی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ یہی دوزخ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنی جائز اور فطری ضروریات بھی ترک کر دے۔ دولت مند یا غریب ہونا سمجھ میں تو آتا ہے اور یہ الفاظ ہم استعمال کرتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص اَمیر ہے، فلاں شخص غریب ہے، لیکن اِس بات کی آج تک سمجھ نہیں آ سکی کہ ایک شخص کیوں اَمیر ہے اور دوسرا شخص کیوں غریب ہے۔ بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات ہم اَمیر ہونے کے نسخے بناتے رہتے ہیں، لیکن اِن نسخوں اور اصولوں کے باوجود اِن پر عمل کرنے والے بے شمار انسانوں کے لیے نتیجہ برعکس نکلتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ محنت خوشحال ہو گی لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ محنتیں بدحال ہیں، پریشان ہیں۔ بے شمار لوگ محنت کی چکی میں پسے جا رہے ہیں اور کوئی چکی اُن کے لیے آٹا نہیں پیستی۔ ہر اصول اپنی ضد میں مرتا جا رہا ہے، شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اَمیر ہونے کے لیے تمام اصولوں کے باوجود کوئی اصول نہیں اور غریب ہونے کے لیے تمام احتیاطوں کے باوجود کوئی احتیاط کارگر نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی متموّل ہو اور کچھ ہی دیر میں بغیر مال کے ضائع کیے، اپنی حالت میں مکمل طور پر قائم رہ کر وہ غریب ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے گرد آپ سے کم درجے کے لوگ ہیں تو آپ متموّل ہیں اور اگر

آپ کے سامنے زیادہ متموّل لوگ آجائیں تو آپ اپنے آپ میں غریب ہو جاتے ہیں، بلکہ کمتر ہو جاتے ہیں اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیے جاتے ہیں۔ جب تک انسان کو یہ معلوم نہ ہو کہ کون سی طاقت ہے جو غریب کو غریب بناتی ہے اور اَمیر کو اَمیر — کون سی ذات ہے جو ایک بے جان سیپ میں موتیوں کو پالتی ہے — کون ہے جو زمین کے اندر سے خزانے نکالتا ہے — کون ہے جو آسمانوں سے مال برساتا ہے — کون سی طاقت ہے جو ہم کو خوشیاں عطا فرماتی ہے اور کون سی تقدیر ہے جو مبتلائے غمِ دوراں کر دیتی ہے۔ ہم جن لوگوں کے لیے، جن محبوبوں کے لیے مال اکٹھا کرتے ہیں، اگر وہی نہ رہیں تو مال کس کام کا —! مطلب یہ کہ ہونا، دراصل کسی کام کے لیے ہونا ہے۔ خالی ہونا، نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو شخص صرف جمع کرتا ہے اور وہ پیسہ اُس کے کام آتا ہے، نہ کسی اور کے کام آتا ہے، وہ آدمی پرایا مال جمع کرتا ہے — وہ صرف نگران ہے، کسی اور کے مال کا — جس طرح ایک اژدہا کسی کے مال کی حفاظت کرتے کرتے عمر بسر کر دیتا ہے۔ اگر انسان کی دولت لوگوں کے مصرف میں آنے کے لیے اکٹھی کی جائے تو واضح بات ہے کہ یہ دولت جمع نہ رہے گی اور پھر انسان برابر ہو جائیں گے — اور پھر یا سب اَمیر ہوں گے یا سب غریب۔ اگر سب برابر ہو جائیں تو کوئی گلہ نہیں رہے گا — لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگر جیب برابر ہو جائے تو ذہن برابر نہیں ہو گا، خیال برابر نہیں ہو گا اور حُسن و جمال تو کبھی برابر نہیں ہو گا۔ ایک آدمی اپنی غریبی کے باوجود سراہا جا سکتا ہے، چاہا جا سکتا ہے، پسند کیا جا سکتا ہے — اور دوسرا آدمی دولت اور کثرت کے باوجود ناپسندیدہ شخصیت ہو سکتا ہے، ناپسند کیا جا سکتا ہے بلکہ نفرت کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بڑے غور کی ہے کہ انسان اَمیر تو ہونا چاہتا ہے لیکن وہ اَمیروں سے نفرت کرتا ہے — جس طرح لوگ، تمام لوگ، حکمران بننا چاہتے ہیں لیکن بنے ہوئے حکمرانوں کے خلاف نفرت رکھتے ہیں۔ یہ کیسی بات ہے کہ ہم جس کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں، وہی بننا چاہتے ہیں —!!

پھر بھی اَمیر غریب ہوتے ہیں۔ اگر حاصل آرزو سے کم رہ جائے تو انسان غریب ہو

گیا، اور اگر آرزو حاصل سے کم ہو یا حاصل آرزو سے زیادہ ہو تو اِنسان اَمیر ہو گیا۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ عید کی خوشیاں منانے والے ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ غریب کے چہرے کی مسکراہٹ اُس کی غریبی کے باوجود اتنی ہی دل پذیر ہوتی ہے جتنی اَمیر کے چہرے پر — بلکہ اَمیر کی خوشی اور خوش طبعی نقلی، بناوٹی اور غیر فطری پروپیگنڈہ ہو سکتی ہے، اور غریب کی خوشی اُس کی روح سے پھوٹ سکتی ہے۔ دراصل عید کی خوشی کسی مال سے پیدا نہیں ہوتی — یہ تو روزہ رکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جس انسان نے روزہ نہ رکھا ہو، اُس کے لیے عید کی خوشی بے معنی ہے — ایک سماجی اور سیاسی ضرورت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اُس خوشی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جو صرف روزہ دار کو روحانی شگفتگی اور قربِ حق سے نصیب ہوتی ہے۔ اگر قربِ حق کو ہی دولت سمجھ لیا جائے تو ظاہر ہے اِس کا دنیاوی مال سے کوئی تعلق نہیں، قطعاً نہیں۔

مال و دولت کے سہارے حکومتیں کرنے والے آخر کار ندامتوں اور رسوائیوں کے حوالے کر دیے گئے۔ دولت عزت پیدا نہیں کرتی، دولت خوف پیدا کرتی ہے اور خوف پیدا کرنے والا انسان معزز نہیں ہو سکتا۔ غریبی محتاج رہنے کی وجہ سے خالق کے دَر پر سرِنگوں رہتی ہے اور یوں غریبی قربِ حق کا ایک قوی ذریعہ ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان غریب ہو جائے یا اسے غریب ہی رہنے دیا جائے۔ ایک سماج میں اَمیر اور غریب کے درمیان جتنا فاصلہ بڑھتا جائے گا، اتنی ہی اس سماج میں کرپشن بڑھے گی۔ وہ معاشرہ تباہ ہو جائے گا جہاں غریب کو نظر انداز کر دیا گیا۔ غریب ہی اَمیر کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ غریب سائل ہے اور اَمیر سخی نہ ہوا تو اُسے بخیل ہونے کی سزا دی جائے گی۔ غریب حق دار ہے اور اگر اُس کو اُس کا حق نہ ملا تو حق سے زیادہ لینے والوں کو عذاب میں گرفتار کر دیا جائے گا — اور عذاب کی انتہائی شکل یہ ہے کہ ان لوگوں کے دل سے دولتِ تسکین نکال لی جائے گی اور یوں ایک اَمیر انسان پیسے کی فراوانی کے باوجود پیسے کی ضرورت کی شدت میں مبتلا ہو کر ایک اذیّت ناک زندگی گزارنے پر

مجبور ہو گا۔ اَمیر آدمی کا خوف غریب کے خوف سے بہت زیادہ ہے۔ غریب کے پاس تو پھر بھی اچھے زمانے کے آنے کی اُمّید ہو سکتی ہے لیکن اَمیر کے لیے بُرے زمانے کے آ جانے کا خوف ہمیشہ سر پر تلوار بن کر لٹکتا رہتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انسان کے پاس مال ہونے کے باوجود اُس کی زبان پر تنگیٔ حالات کا شکوہ رہتا ہے۔ زیادہ کی تمنا انسان کو اپنے موجود حاصل سے غافل کر دیتی ہے اور وہ مال پر خوش ہونے کی بجائے اُس حسرت کے لیے اُداس ہو جاتا ہے جو صرف ایک خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اُس کے پاس کثرت ہو، زیادہ سے زیادہ — بس بڑھتا ہی جائے اُس کا مال اور پھیلتا ہی جائے اُس کا اختیار۔ مال اور اختیار کی حقیقت سے ناآشنا اور اُس کے عبرتناک انجام سے بے خبر انسان تاریخ پر نظر نہیں دوڑاتا۔ فرعون مال اور حکومت کے باوجود دین اور دنیا میں برباد ہو جاتا ہے۔ موسیٰؑ مال اور اختیار کی کمی کے باوجود اللہ کے قرب سے نوازے گئے۔ اَمیر کون ہے؟ فرعون یا موسیٰؑ؟ اِس سوال کا جواب کئی مرتبہ دیا جا چکا ہے۔ زندگی فرعون کی اپنی جگہ، لیکن انجام موسیٰؑ کا چاہیے تو اِس زندگی سے گریز کرنا پڑے گا۔ فرعون کی زندگی فرعون کا انجام پائے گی، موسیٰؑ کی زندگی موسیٰؑ کا انجام پائے گی۔ اِس میں کوئی مبالغہ نہیں، کوئی استثناء نہیں!!

ہم دیکھتے ہیں کہ پیسہ نہیں بچا سکتا، بدنامیوں سے، بے عزتیوں سے، دشمنوں سے، موت سے۔ پھر پیسہ کیا کرتا ہے؟ — صرف نگاہ کو آسودہ کرتا ہے اور یہ آسودگی دِل کو مردہ کر دیتی ہے، بے حس بنا دیتی ہے اور آدمی کثرتِ مال کے باوجود تنگیٔ خیال میں مبتلا ہو کر اذیت ناک انجام سے دوچار ہو جاتا ہے۔

پھر بھی آج کل کے زمانے میں غریبی اور اَمیری پر بحث ہو رہی ہے کہ یہ دو طبقے کیوں ہیں؟ کیا یہ استحصال ہے؟ کیا یہ ظلم ہے؟ کیا یہ مقدّر ہے؟ کیا یہ حکمرانوں کے لیے ایک عذاب ہے؟ کیا غریبی غریب کے لیے باغی ہونے کا لائسنس ہے؟ کیا امیر کو وقت کے عبرت

کدے میں من مانیاں کرنے کی عام اجازت ہے؟ کیا غریب کے لیے سسکنے اور کراہنے کے علاوہ اور کوئی مقدّر نہیں؟ یہ بحث بجا، لیکن اِس تمام بحث کا حل آج تک جو سوچا گیا، اُس کا انجام بھی ہم نے دیکھ لیا۔ یہ گیا سوشلزم، وہ گیا کمیونزم — اور وہ جارہا ہے کیپٹل ازم۔ اِس مسئلے کا واحد حل مذہب نے دیا ہے کہ وہ غریب جو مایوس ہو گیا اور باغی ہو گیا، وہ دوہرے عذاب میں مبتلا ہوا۔ ایک تو دنیاوی عذاب اور دوسرا اچھی آخرت سے محروم۔ اسی طرح وہ اَمیر جو پیسے کو ظلم پھیلانے میں اور لوگوں کو اذیّت دینے میں استعمال کرتا ہے، وہ اِس پیسے کی وجہ سے ایک بہت دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا۔ پھر بھی بات کا سمجھنا مشکل ہی ہے کہ اَمیر کیا ہے اور غریب کیا ہے۔

جیسا پہلے کہا گیا کہ یہ دو مزاج ہیں، یہ دو اندازہائے نظر ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی کے پاس مال نہ ہو اور وہ خوشحال ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے پاس مال ہو اور وہ بدحال ہو۔ دراصل حکم ہے بنانے والے کا، انسان کو پیدا کرنے والے کا، زندگی اور موت پیدا کرنے والے کا — کہ اُس نے انسان کا مقدّر مقرر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ محنتوں کے باوجود فاقہ دیکھا گیا اور کچھ لوگوں کے لیے پیدا ہوتے ہی فراوانیاں موجود تھیں۔ اگر اِس بات سے خالق کو نکال دیا جائے تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اَمیر نے غریب کا استحصال کیا، اُس کے حصے کا مال کھایا۔ اگر انسان کے خیال کے مطابق مال کی مساوی تقسیم کر دی جائے تو کیا امیر غریب نہیں رہیں گے؟ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر مال برابر بھی ہو جائے تو بھی امیر غریب کی تقسیم قائم رہے گی، گلہ موجود رہے گا — بغاوت کی کوششیں جاری رہیں گی۔ لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ اُس کے پاس مال زیادہ ہے، کیونکہ مال تو برابر ہو گا۔ لوگ یہ کہیں گے کہ اُس کو دانائی زیادہ ملی اور مجھے ایک احمق دماغ ملا۔ اب یہ بھی برابر ہونا چاہیے۔ چلو، قصّہ تمام ہو گیا۔ دنیا میں دانائی اور نادانی برابر مقدار میں تقسیم ہو جائے گی اور سماج کا نقشہ اور سماج کا حشر کم اَز کم آپ اندازہ تو کر سکتے ہیں کہ کیا ہو گا۔ اگر مال اور ذہن برابر بھی ہو جائے تو یہ گلہ کبھی دُور نہیں ہو گا کہ فلاں شخص زیادہ

خوبصورت ہے۔ اُس کے پاس حُسن کا مال زیادہ ہے اور ہم خوبصورتی میں کنگال ہیں — حُسن و جمال بھی برابر تقسیم ہونا چاہیے۔ چلو بفرضِ محال یہ بھی برابر تقسیم ہو جائے تو کسی انسان کے پاس خوبصورت گلا ہو گا اور وہ گانا گائے گا۔ سننے والے، بے سُر سامعین اِس کا بھی گلہ کر سکتے ہیں۔ چلو یہ بھی مان لیا جائے کہ سب کو ایک سُریلی اور رسیلی آواز مل جائے گی یا سب سے رس بھری آواز چھین لی جائے گی۔ نتیجہ دس دفعہ واضح ہو سکتا ہے، یعنی برابری کے نام پر بربادی کا دَور شروع ہو جائے گا۔ دنیا کی رنگینی اور نیرنگی اِسی بات میں ہے کہ کہیں روشنی ہو اور کہیں اندھیرا۔ کہیں سورج چمک رہا ہو اور کہیں ستارے جگمگا رہے ہوں۔ کہیں شیر دھاڑ رہا ہو، کہیں بکری ڈر رہی ہو۔ باز کی زندگی کبوتر کے گوشت میں ہے۔ اس میں کوئی استحصال نہیں، کوئی ظلم نہیں۔ بس اِس بات کی احتیاط رہے کہ غریب کو اُس کا حق ضرور ملنا چاہیے۔ یہ حق ہے زندگی کا، یہ حق ہے دو مسافروں کے مل کر سفر کرنے کے پروگرام کا۔ فانی کو فانی پر فوقیت کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اَمیر غریب کی مدد کرے، اُس کو زندگی کے راستوں سے آشنا کرے، اُس کے لیے وسائل کی دسترس رہنے دے — یہ نہیں کہ اُس کی زندگی کے ذرائع مفلوج کر دے۔ اگر غریب فاقے سے مر رہا ہو تو اَمیر یقیناً بدہضمی سے مرے گا اور جلد مرے گا —!!

تو، قصہ یہ ہوا کہ اَمیر غریب دو طرز ہائے حیات ہیں، دو مزاج ہیں، دو مختلف قسم کی عطائیں ہیں، دو مختلف رنگوں کے جلوے ہیں۔ انسانوں کو اَمیر غریب کی تقسیم میں پھنسایا نہیں جا سکتا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اَمیر اور غریب کی تقسیم کو یوں دیکھا جائے کہ اَمیر اچھے بھی ہوتے ہیں، برے بھی ہوتے ہیں۔ اِسی طرح غریب اچھے بھی ہوتے ہیں، برے بھی ہوتے ہیں۔ اچھا اَمیر بہت اچھا ہوتا ہے — غریبوں کا مونس ہوتا ہے، جاں نثار ہوتا ہے، اُن کا خدمت گار ہوتا ہے، سخی ہوتا ہے اور غریبوں کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ غریبوں کے مال کا اَمین ہوتا ہے۔ غریبوں سے محبّت کرتا ہے، اُن کی خدمت کرتا ہے، اُن میں خزانے تقسیم کرتا ہے، پیاسے غریبوں کو چشموں تک پہنچاتا ہے، سیراب کرتا ہے اور اُن کی خدمت پر مامور ہوتا ہے۔ اِس

کے برعکس بُرا اَمیر بہت ہی بُرا ہوتا ہے۔ وہ دولت مند ہونے کے باوجود خوف پیدا کرتا ہے اور جس نے خوف پیدا کیا، وہ خود خوف زدہ ہی رہا۔ بُرا اَمیر اپنے پیسے کے زور سے گناہ خریدتا ہے، گناہ بیچتا ہے اور پیسے کو اِس طرح استعمال کرتا ہے کہ اُس کے لیے دردناک عذاب گارنٹی کر دیا جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں تب کھلیں گی، جب وہ بند ہونے لگیں گی۔ پیسے نے اور پیسے کی محبّت نے برباد کر دیا لوگوں کو۔ بُرا اَمیر داستانِ عبرت ہے، اپنے لیے، اپنی قوم کے لیے، اپنی ملّت کے لیے۔ اُس کے لیے قارون کی عبرت ہے، فرعون کی عاقبت ہے، شدّاد کا انجام ہے۔ ایسے اَمیروں کے لیے کوئی دُعا بھی کارگر نہیں ہوتی۔

اِسی طرح غریب بھی دو طبقوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ اچھا غریب اور بُرا غریب۔ اچھا غریب وہ ہے جو اپنی غریبی کو اپنے ایمان کی قوّت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ غریبی اُس کو دَرِ عطا تک لاتی ہے۔ وہ غریب ہونے کی وجہ سے قریب ہو جاتا ہے، اُسی ذات کے جو غریبوں کو قریب کرتی ہے۔ عبادت اُس مقام تک نہیں پہنچ سکتی جس مقام تک صبر کرنے والا غریب، شکر کرنے والا غریب، راضی رہنے والا غریب پہنچ سکتا ہے۔ اچھا غریب وہی ہے جو حبیب ﷺ کے قریب ہو۔

ظاہر ہے بُرا غریب کردار کا بُرا ہے۔ وہ ایک بھوکے کُتّے کی طرح ہے جو فاقے کے باوجود اپنی برادری کو کاٹتا ہے۔ غریب کُتّا غریب کُتّوں پر حملہ کرتا ہے۔ ایسا غریب بہت بُرا غریب ہے جو رحمتِ حق سے مایوس ہوا، جو مقدّر کا منکر ہوا، جس نے زندگی کو گلے شکوے میں گزارا اور فنا کے دیس میں یہ بھول گیا کہ یہاں کس کام کے لیے آیا تھا۔

خدا بُرا اَمیر اور بُرا غریب ہونے سے بچائے۔ پھر بھی ہم یہ کہیں گے کہ حکومتِ وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ کسی طبقے کے پاس بے مصرف دولت جمع نہ ہو اور کوئی طبقہ محروم اور مظلوم نہ رہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اِس کا فیصلہ شاید ایک ایسا مستقبل دے جس پر ہمارا اختیار نہ ہو۔ خدا اُس وقت سے بچائے، جب مظلوم اور بے زبان خطرہ گویائی کے طلسمات شروع

کرے۔ یہ خطرہ ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر سکتا ہے۔ اِس سے پہلے کہ غریب آپے سے باہر ہو، اُس کی غریبی کو ٹالنے کی کوشش کی جائے۔ اُس کا خیال کیا جائے۔ بڑے بڑوں کی بڑی بڑی خدمت کرنے کی بجائے چھوٹے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ضرورت پوری کر دی جائے۔ اُن کے کچن سے بھی دھوئیں اور خوشبوئیں اُٹھیں۔ اُن کے دستر خوانوں پر بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کا موقع موجود ہونا چاہیے۔ غریب کو، خدا کے لیے، صرف نصیحت نہ دو، اُسے کلمے نہ پڑھاؤ، اُس کا دکھ بانٹو، اُس کا غم بانٹو۔ اگر غریب کو مفت دوائی نہ ملی تو تمہارے بڑے بڑے ہسپتال بیمار ہو جائیں گے۔ تمہارے خزانوں میں کیڑے پڑ جائیں گے، دیمک لگ جائے گی۔ ابھی وقت ہے کہ سوچا جائے، سمجھا جائے، ہوش کیا جائے۔ غریب قیمتی سرمایہ ہے، بشرطیکہ اُسے غریب نہ رہنے دیا جائے!!

۩۩۩

ہمہ رنگ

جن لوگوں کو اِس دنیا میں رہ کر گیان، نروان یا عرفان حاصل ہوا، اُن لوگوں کے حالات یا اُن پر گزرنے والے واقعات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہر ایک پر الگ الگ کیفیات مرتب ہوئیں۔ لوگ الگ الگ تجربات سے گزرے اور نتیجہ تقریباً یکساں تھا کہ اُس کی ذات کی پہچان انسان کے بس سے باہر ہے۔ جن لوگوں کو اُس کی معرفت ہوئی، انہوں نے یہی اعلان فرمایا کہ حقِ معرفت ادا کرنا اِنسان کے بس کی بات نہیں۔ ایک کا طریقہ دوسرے کے طریقے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک کی دریافت دوسرے کی دریافت کے برابر ہونا، ایک بڑی عجب بات ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ دریا کے اندر پانی میں رہ کر کئی سال تک تلاوتِ کلامِ پاک کرتے رہے۔ آخر ایک دن سرشار ہو کر باہر نکلے اور اپنے چاہنے والوں کے پاس جا کر اعلان کیا: ”اگر مجھے معلوم ہوتا، کہ اللہ کی پہچان اتنی آسان بات ہے تو ہم پانی میں اتنے سال کیوں کھڑے رہتے“۔ ایک بے باک طالب نے بڑھ کر کہا: ”یا شیخ—! آپ کی ہر بات صحیح، آپ کی ہر بات برحق، اب آپ کم اَز کم ہمیں تو وہ راز بتا دیں تا کہ ہم پانی میں کھڑے رہنے کی صعوبت سے بچ سکیں“۔ وہ شیخ مسکرائے اور کہا: ”میں اتنے سال کی عبادت کا حاصل تمہیں ایک سیکنڈ میں کیسے دے دوں؟“ اب نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ حاصل ہوا، وہ ریاضت کے نتیجے سے ہوا، اور اگر ریاضت کے نتیجے سے ہوا تو یہ کیوں کہا گیا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا، کہ اللہ یہ ہے تو اتنے سال

ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بس یہی راز ہے۔ جو ملتا ہے، وہ بہت آسان بات ہے، مگر یہ آسان بات بڑی مشکلات سے حاصل ہوتی ہے۔

عبادتیں اور اُن کا تقدّس، اُن کی اہمیت اپنی جگہ لیکن کسی انسان کا دل راضی کرنا—— یہ سب اہمیتوں سے زیادہ اہم ہے۔ ایک انسان جس کے پاس کچھ نہیں، اُس کا دامنِ عمل خالی ہے، بس صرف اُس کے پاس ماں کی دُعا ہے۔ نتیجہ حق شناسی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ مالک کے کام ہیں۔ کسی کو مال و دولت میں عرفان نصیب ہوا، کسی کو غریبی برداشت کرنے کی وجہ سے اپنے قریب کر لیا گیا۔ کچھ لوگ صرف سفر میں رہے اور جھوٹے لوگوں کی عاقبت دیکھتے رہے۔ اُن کھنڈرات کو دیکھنے سے جو ہیبت طاری ہوئی، اُس میں حق آگہی حاصل ہو گئی۔ کچھ لوگ کوئی نیکی نہ کر سکے لیکن جہادِ اسلام میں اُن کو شہادت نصیب ہو گئی۔ اب شہید کو جو مقام میسّر ہوا، وہ موت سے آزادی ہے، اللہ کا قرب ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، اور اللہ کا حکم ہے کہ ان کو مردہ نہ کہو، وہ تو زندہ ہیں۔

کچھ لوگ مسلسل اِستغراق میں رہے اور استغراق میں انہیں حق شناسی عطا کر دی گئی۔ کسی کو تنہائیوں میں گوہرِ مراد ملا، کسی کو محفلوں میں راز ملا۔ کسی نے قوّالی میں پایا۔ کسی نے محفلِ ذکر میں حاصل کیا، کسی کو دُعا نصیب ہوئی، کوئی حسرتوں میں سرشار کر دیا گیا، کسی کو مشاہدے میں، کسی کو مجاہدے میں —غرضیکہ اُس کے جلوے ہمہ رنگ ہیں اور جلووں کے حصول کا سلسلہ بھی اسی طرح ہمہ رنگ ہے۔ انسان خلوص کے ساتھ دین کے فرائض کا خیال رکھتے ہوئے اگر اُس کی راہ پر گامزن ہو جائے تو کسی نہ کسی شکل میں، کسی نہ کسی صورت میں اُس بے صورت کا جلوہ مل جائے گا۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اگر چمگادڑ کی زندگی پر ہی غور کیا جائے تو عرفانِ حقیقت ممکن ہی نہیں، آسان بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے مرتبے، اور ہمارا غرور، اور لالچ، اور کینہ، اور بغض، اور غصہ، اور نفس پرستی، اور نمائش اور آلائش ہی ہمارے راستے کی رکاوٹیں ہیں۔

یہ دنیا اُس دنیا کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہم صرف اِس بات کے جواب دہ ہیں، جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ ہم آسمان کے ستاروں کی چالوں کے بارے میں کبھی جواب دہ نہیں بنائے جائیں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا، ہمارے اعمال کے بارے میں۔ ہم سے پوچھا جائے گا، ہمارے معاملات کے بارے میں۔ ہم سے پوچھا جائے گا، اُن امانتوں کے بارے میں جن کے ہم اَمین تھے۔ ہم سے پوچھا جائے گا، اُن حقوق کے بارے میں جو ہم نے اَدا کرنے ہیں، اُن فرائض کے بارے میں جو ہمیں اَدا کرنے چاہییں تھے۔

ہم سے اُسی حد میں سوال ہوں گے جو ہماری حد تھی۔ ایک اپاہج انسان سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اُس کے دوڑنے کی رفتار کیا تھی؟ صاحبانِ دل سے دل کی بات ہو گی، صاحبانِ فکر سے فکر کی بات ہو گی۔ جس آدمی کو قلم کی طاقت عطا کی گئی، اُس سے یہ پوچھا جائے گا کہ اُس نے اپنی تحریر کس سمت میں استعمال کی؟ الفاظ کی نشست و برخاست اتنی اہم نہیں جتنے الفاظ کے مدعا اور معانی۔ تحریر گویائی کی طرح ایک عظیم عطیہ ہے قدرت کا، اور اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ کتابوں میں لوگوں کو نفسانی آرزوؤں کے بارے میں برانگیخت کرنے والے مصنفین جواب دہ ہوں گے اور پھر اُنہیں افسوس ہو گا کہ انہوں نے تقدیسِ الفاظ کو پامال کیا اور حرمتِ تحریر کو قائم نہ رکھا۔ الفاظ سے گمراہ کرنے والے عذاب کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔ وہ لوگ جو لذّتِ خطابت میں آکر لوگوں کو غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں، اپنے لیے مصیبت مرتّب کر رہے ہیں۔ اِسی طرح سرمایہ دار اپنے مال کو جمع کرنے میں اور اسے گننے میں وقت گزار کر اپنے لیے جو بربادی لکھ رہے ہیں، وہ آخرت میں ظاہر ہو کر رہے گی۔ دوسروں کا حق غصب کرنے والے، خواہ دنیا میں اُن کا کوئی گواہ نہ ہو، آخرت میں ظاہر کر دیے جائیں گے۔ آخرت ہوتا ہی وہ وقت ہے جب چھپا ہوا ظاہر ہو جائے اور وہ وقت بہت دُور نہیں۔

ایک آشنا کو دوسرے آشنا سے آشنائی حاصل ہونا ضروری بھی نہیں۔ ایک صاحبِ تعلّق کو دوسرے صاحبِ تعلّق کے ساتھ تعلّق حاصل ہونا لازمی نہیں۔ ایک صاحبِ اَسرار کا دوسرے

صاحبِ اَسرار سے ہمراز ہونا قطعاً ضروری نہیں — کیونکہ اُس کے جلوے ہمہ رنگ ہیں اور یہ سارا نیرنگ اُسی کے رنگ سے ہے — اور وہ جلوۂ ہفت رنگ بے رنگ جلووں میں بھی نمایاں ہے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ہونے کے باوجود سارے ہی باخبر ہو سکتے ہیں — اور یہ بات ذرا مشکل بات ہے۔

اگر ہم تاریخِ عالَم پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ایک پیغمبر کی زندگی، دوسرے پیغمبر کی زندگی سے مختلف بھی رہی ہے۔ کہیں کوئی صاحبِ تعلّق لوہے کا کام کرتا ہے اور کسی کو گلہ بانی کا شوق ہوا۔ کسی کو طبؔ اور حکمت عطا ہوئی اور کسی کو بیماری کا تحفہ ملا۔ کسی نے ساری زندگی میں بہت مختصر بیان دیا اور کسی نے فصاحت کے جلوے دکھائے۔ حضرت یوسفؑ کو دعوتِ گناہ ملی تو آپؑ نے فرمایا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ یہ اُسی کا ڈر ہے، حالانکہ اِن سات پردوں میں بند کواڑوں کے پیچھے ترغیبِ گناہ کی موجودگی میں گناہ مشکل کام نہیں، لیکن اُس اللہ پر بھروسہ ہے، جو پردوں میں دیکھتا ہے، جو خاموشی کی زبان سنتا ہے، جو دُور رہ کر بھی قریب ہوتا ہے، جو اِدراک سے پرے ہو کر شہ رگ سے قریب ہے۔ یہی نبی کی شان تھی اور یہی نبی کا عمل ہوا۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ ہر صاحبِ تعلّق کو الگ الگ زندگی کیوں عطا ہوئی؟ یہ اِس لیے کہ رازقِ مطلق نے انسانوں کو حصولِ رزق کے لیے الگ الگ پیشوں میں رکھا۔ جہاں دولت سے نقصان پہنچنے کا امکان تھا، وہاں امیروں کو ضرورت سے زیادہ پیسہ رکھنے سے منع کیا گیا۔ جہاں قومیں تلاشِ معاش میں گمراہ ہونے لگیں، اُن کو پیغمبر عطا کیے گئے۔ انہوں نے اُن کی صف بندی کی۔ انہیں ہدایت کے قریب لانے کی کوشش کی۔ آخری نبی ﷺ کے آنے کے بعد مسلمانوں پر مراحل آسان کر دیے گئے کہ وہ شریعت کی پابندی کریں، معاملات کی اصلاح کریں اور ایک جامع تنظیم کے ماتحت اُمورِ مملکت چلائیں، جذبۂ جہاد زندہ رکھیں۔

حکمرانوں کو حکومت امانت کے طور پر عطا کی گئی۔ یہ کسی کی ذاتی طاقت کے لیے

نہیں، یہ غریبوں کی سہولت کے لیے ہے۔ غریبوں کے حقوق اَدا کریں اور اُن حقوق کی نگہداشت کریں۔ حاکم اَمین ہوتا ہے اور محکوم اطاعت شعار ـــ دونوں خدا کے قریب ہیں بشرطیکہ دونوں خدا کے قریب ہوں۔ اگر غریبی سکون میں نہیں اور غریبی کے باوجود غریب پر یقین کی دولت نازل نہیں ہوتی تو وہ غریبی عذاب ہے۔ دنیاوی مال بھی نہ ملا اور سکونِ قلب کی دولت بھی نہ ملی۔ خدا پر بھروسہ بھی کیا، اپنے مستقبل سے بھی مایوسی ہوئی۔ باغی غریب دوہرے عذاب میں ہوتا ہے۔

اِسی طرح وہ اَمیر جو دولت کو باعثِ افتخار سمجھتا ہے، اُس فرعون کی طرح ہے جس کو لعین کہا گیا۔ لوگوں کا ربّ بن بیٹھنا فرعونیت ہے اور وہ لوگ جو لوگوں کے خیر خواہ بن جاتے ہیں اور اُن کو دین سے دُور لے جا کر بغاوت پر اُکساتے ہیں، اُن کے لیے بھی اچھی خبر نہیں ہے۔

اہمیت دولت اور حکومت میں نہیں، اہمیت ذات پات میں نہیں، اہمیت انگلش اور اُردو تعلیم میں نہیں، اہمیت قبیلوں اور شاخوں میں نہیں، اہمیت رنگ و روپ میں نہیں، کالے گورے میں نہیں ـــ اہمیت صرف اور صرف پرہیز گاری میں ہے۔ جو تقویٰ میں قریب، وہ بہرحال قریب۔ اَمیر ہے تب قریب، غریب ہے تب قریب، حاکم ہے تو قریب، محکوم ہے تو قریب ـــ بشرطیکہ تقویٰ ہو۔ اِس لیے ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ بھی آئے جو فقیر تھے اور سر پر تاج تھا۔ ایسے محرمِ راز بھی آئے جن کے پاس یادِ الٰہی تھی اور فاقہ تھا۔ ایسے لوگ بھی آئے جو اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ نثار کرتے رہے۔ جو اپنا قرضہ ادا کر کے گئے۔ ان لوگوں کا مقام بلند و بالا ہے۔ انہوں نے اپنے خون سے کربلائیں سیراب کیں۔ انہوں نے کسمپرسیوں میں نبی ﷺ کی ذات پر سلام بھیجا۔ سلام تو وہ ہے کہ "اے بادِ صبا! آج خراماں خراماں چلو، آج ارضِ حرم میں جاؤ اور زین العابدینؑ کا اُس روضے پر سلام کہو جس میں نبی محترم ﷺ ہیں"۔ سلام کا یہ انداز بس اُنھی کا حصہ ہے۔ ان لوگوں کی قربانیاں حصولِ ولایت کے لیے نہیں تھیں، وہ تسلیم و رضا کے لوگ، تسلیم و رضا ہی کے لیے رہے اور تسلیم و رضا ہی کے لیے رخصت ہوئے۔

اِس دنیا میں حق کا سفر کتنا آسان ہے، اِس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بس صرف حق کو باطل کا لباس نہیں پہنانا اور جہاں حق بات کرنے کا وقت آجائے، وہاں حق بات کو چھپانا نہیں۔ جو چیز اپنے لیے پسند کرتے ہو، وہی تمہارے بھائی کی ضرورت ہے، اُسے دو۔ بھائی کو تکلیف میں چھوڑ کر راحت کدے آباد کرنے والے اندازہ لگائیں اُس آدمی کی نادانیوں کا، جو اپنے بھائیوں کو دوزخ میں پہنچا کر جنّت میں جشن منانا چاہتا ہے۔ ایسی جنت سے تو بہتر تھا کہ وہ بھائیوں کے پاس ہی رہتے یا انہیں اپنے پاس بلاتے۔

اللہ اپنے حبیب ﷺ کی اُمّت پر عذاب تو نہیں ڈالے گا، لیکن درجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی اِس بات کا خیال رکھے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی اُمّت کا کوئی فرد پریشان نہ رہے۔ انسانوں کو خوش کرنے کی بجائے اپنے مولا کو خوش کیا جائے۔ صداقتِ فکر کا ہونا بہت ضروری ہے، صداقتِ عمل کے لیے۔ ہر انسان اپنے اپنے ماحول میں صادق ہو جائے تو حق کا جلوہ صداقت کے روپ میں ہر طرف جلوہ گر ہو جائے گا۔ کچھ کمی ہم ہی میں ہے ورنہ وہ جلوہ تو قدم قدم ظاہر اور عیاں ہے۔

تکلیف دینا چھوڑ دو۔ بخش دو سب کو۔ اپنی بخشش طلب کرو۔ اُس کو پانے کے، ایک دین میں ہزاروں انداز ہو سکتے ہیں، اَدب شرط ہے۔ توبہ کر لی جائے تو ایک اچھے وقت کا آغاز ہو سکتا ہے۔ عمر سو کے گزاری ہے، اب بقیہ کم اَز کم بیدار رہنے کی تمنّا میں گزاری جائے۔ کہتے ہیں کہ اگر صرف باوضو ہو کر انسان سو رہے تو نیند کا عرصہ بھی عبادت گنا جائے گا۔ اُس کی تلاش میں پہلا قدم ہی آخری قدم ہے۔ کعبے کا ایک نام انسان کی پیشانی بھی ہے اور خدا کا ایک نام عاجز مسکین کا آنسو بھی ہے۔ بے بس کی آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو کتنی عبادتوں پر فوقیت لے جاتا ہے۔ اپنا خدا اپنی ایمانداری سے آپ حاصل کرو۔ اپنے مالک کو اپنی صداقت سے اپنے دل میں پاؤ۔ اُس نے کہہ دیا ہے کہ میں تمہاری سانسوں میں ہوں۔ تم جہاں ہو، میں وہاں ہوں۔ اپنے آئینے میں جھانکو، یعنی اپنے دل میں جھانکو، میں وہاں ہوں گا — اور جس طرح آئینے کے سامنے جانے

سے یہ معلوم ہو گا کہ جب ہم سامنے ہوں تو وہ عکس بن کر سامنے آ جاتا ہے، ہم آگے ہوں، وہ آگے آ جاتا ہے، ہم پیچھے ہٹ جائیں، وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے، ہم سامنے سے ہٹ جائیں تو وہ سامنے نہیں رہتا۔ اب یہاں یہ غور طلب بات ہے کہ جب ہم اُس کے قریب ہوتے ہیں — وہ اور قریب ہوتا ہے۔ ہم کیوں نہ اُس کے قریب تر ہو جائیں۔ اِس مقام پر ذاکر اور مذکور، ذکر میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ دونوں قریب اور دونوں جدا۔ وہ کہاں اور ہم کہاں! یہی مقام ہے اُس کو پانے کا—!!

اُس کی یاد میں اپنے آپ کو بھول جاؤ۔ اُس کی تلاش میں اِرد گرد سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اُس کے حصول کی راہ میں کسی دشواری کو دشوار نہ کہو۔ وہ دُور ہے، لیکن وہ بڑا قریب ہے—بس ایسے ہی جیسے سورج، جو بہت دُور ہے لیکن دھوپ ہمارے بہت قریب ہے۔ اُس کا جلوہ ہی تو درکار ہے۔ ذات سے ذات کا وصال اِمکان سے باہر ہے۔ جلوے سے تلاش کا وصال ہو سکتا ہے۔ تم تلاش بنتے جاؤ—جلوہ خود ہی حاصلِ تلاش بن جائے گا۔

عدل

حق والے کو اُس کا صحیح حق مل جانا ہی عدل ہے۔ مجرم کو اُس کے جُرم کے مطابق سزا مل جائے تو عدل قائم ہو جاتا ہے۔ کسی ترازو تولنے والے کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دونوں پلڑے کس طرح ہم وزن کیے جاتے ہیں۔ اِسی ہم وزن کرنے کو عدل کرنا کہتے ہیں۔ ترازو کو ڈنڈی نہ مارنا چاہیے۔ کم تولنا، کم وزن کے اوزان استعمال کرنا عدل نہیں، ظلم ہے۔ ملاوٹ کر کے وزن برابر کر دینا بھی اِسی ظلم کا حصّہ ہے۔

عدل کا میدان بڑا وسیع ہے۔ یہ اِنسان کی تنہائی سے شروع ہو کر میدانِ حشر تک پھیلا ہوا ہے۔ جو شخص اپنی تنہائی سے عدل نہیں کرتا، وہ زندگی میں کیا عدل کرے گا؟ یعنی خیال عادل نہ ہو تو عمل عادل نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں۔ ظاہر و باطن میں فرق رکھنے والا ہی ظالم ہے۔ ایک سے زیادہ زندگیاں گزارنے والا عادل نہیں ہو سکتا۔ عادل ہمہ حال عادل ہے۔ اُس کی بات عدالت، اُس کی خاموشی عدالت، اُس کی گواہی عدالت، اُس کے فیصلے عدالت، اُس کی زندگی عدالت اور اُس کی موت بھی ایک بہت بڑی عدالت!!

حکم ہے کہ میزان کو ڈنڈی نہ مارو۔ حق کو باطل کا لباس نہ پہناؤ۔ حق بات کا برملا اظہار کرنے سے قطعاً نہ ہچکچاؤ۔ حق، حق ہے، اسے بیان ہونا چاہیے۔ حق پر پردہ ڈالنے والے کب تک کتمان کریں گے؟ آخر سُورج نے نکل آنا ہے۔ زمین میں چھپے ہوئے راز تک ظاہر ہو جائیں گے۔ نِگلا ہُوا اُگلنا پڑے گا۔ یہ امانت گاہ ہے، یہاں سے صرف عادل ہو کر گزرنا ہے۔ سچ کو سچ کہو اور جھوٹ کو جھوٹ۔ دُودھ کو دُودھ اور پانی کو پانی۔ دِن کو دِن، رات کو رات۔ سچ اور جھوٹ کو

ملا کر بولنے والا، بڑے دروازوں اور خوبصورت مکانوں کے اندر عذاب کی زندگی بسر کرتا ہے۔ لوگ اُسے خوش سمجھتے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ خوشی نام کی کوئی چیز اُس کے پاس نہیں آسکتی۔ البتہ وہ شعورِ ضبطِ غم کو خوشی کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہے۔

عدل کرنا صرف خوفِ خدا اور فضلِ خدا سے ممکن ہے۔ ورنہ یہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ عادلانہ زندگی ہی پُل صراط ہے۔ عادل بننے کے لیے یہ بنیادی شرط ہے کہ اِنسان پہلے یہ سوچے کہ کون سا دِین عدل و مساوات کے لیے صحیح ماحول پیدا کرتا ہے۔ یہ سوال ہے جس کا جواب عدل کی دُنیا میں داخل ہونے سے پہلے دریافت کرنا پڑتا ہے اور جس نے اِس سوال کا جواب غلط دیا، وہ عادل نہیں ہوتا۔ ایک کافر اگر صحیح لین دین کرتا ہوا پایا جائے، تو اُسے عادل سمجھنے سے پہلے سوچنا چاہیے —اور سوچنے کے بعد اِسی نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ وہ عادل نہیں ہو سکتا۔ عمل سے پہلے خیال کا عادل ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر خیال عادل ہو اور عمل نہ ہو تو ایسا شخص سند نہیں ہو سکتا۔ اسے عادل نہیں کہا جا سکتا۔ سیرت پر کتابیں لکھنے والے غیر مسلم کبھی عادل نہیں کہلا سکتے۔ عادل علم و عمل کا عادل ہے۔

عدل اِنسان کی زندگی کے ہر حصّے میں ضروری ہے۔ عدل اِنسانی وجود کے اِستعمال میں توازن کا نام ہے۔ ایک حصّہ دوسرے حصّوں کو کھاتا چلا جائے تو عدل نہ ہوا۔ وجود کو موجود رہنا چاہیے، لیکن عدل کے ساتھ۔

اِنسان کے لیے یہ قابلِ غور بات ہے کہ اُس کے خیال کا عدل کیا ہے۔ عمل نیّت سے پہچانا جاتا ہے لیکن نیّت عمل کرنے والے کو معلوم ہے۔ اگر عمل سے نیّت کو پہچانا جاتا تو آج کچھ بھی نہ پہچانا جا سکتا۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہو سکتا ہے کہ وہ عمل سے نیّت کو پہچان سکتے ہیں۔ اِسی بے بنیاد دعویٰ کی قطعی نفی کے لیے تو ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ اعمال نیّت سے ہیں۔

خیال کی اصل پہچان تو خیال دینے والے کو ہو سکتی ہے۔ خیال کی تخلیق وہی ذات فرماتی ہے جو اِنسان کو پیدا کرتی ہے۔ خیال اِنسانوں کی طرح پیدا ہوتے رہتے ہیں، اچھے بُرے، لیکن تربیت اور نصیب سے یہ ممکن ہے کہ ہم اچھے خیال حاصل کریں اور اُن کو عمل کی تقویّت

دے کر اُن کے ساتھ اور اپنے ساتھ عدل کریں۔ عادل کے لیے اپنے خیال کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ وہ اپنے دِل کے دروازے پر دربان بن کر بیٹھ جائے تاکہ خیالات کے آنے اور جانے کا علم ہو، اور یہی عدل کا تقاضا ہے۔

اپنی پاکیزہ لائبریری میں غیر پاکیزہ کتاب کا نہ رکھنا ہی عدل ہے، اور دوستوں کی فہرست میں کوئی ایسا نام نہ آنے پائے جو کسی طرح بھی عدل کی راہ میں رکاوٹ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خیال کے عادل کے لیے ضروری ہے کہ وہ نگاہ کا عادل بھی ہو۔ اُس شخص کی نظر عادل ہو سکتی ہے جو حقوق اور حدود سے آشنا ہو۔ اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اپنا کیا ہے اور پرایا کیا ہے؟ اُس کے پاس پہچان ہونی چاہیے کہ جو چیزیں گھر میں استعمال ہو رہی ہیں، وہ کہیں دفتر کی تو نہیں۔ جو پیسہ وہ استعمال کر رہا ہے، وہ کسی دوسرے اِنسان سے غلط بیانی کر کے تو حاصل نہیں کیا گیا۔ نگاہ کا عدل بڑا قوی ہے۔ نگاہ کا عادل وہ ہے جسے دوسرے کی بیٹی میں اپنی بیٹی نظر آئے، اور جسے اپنے حق سے زیادہ لینے والے بیٹے سے پہلے، دوسروں کے حق سے محروم بیٹوں کا خیال آئے۔ صاحبانِ اقتدار کے لیے نگاہ کا اِنصاف بہت مشکل ہے اور اگر کہیں نگاہ عادل ہو جائے تو بس پھر بیڑہ ہی پار ہو جائے۔

زبان کا عدل بھی بہت ضروری ہے۔ ہم کیا کہہ رہے ہیں، کیوں کہہ رہے ہیں، کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں، کس سے کہہ رہے ہیں، یہ جاننا ضروری ہے۔ کلام کے پیچھے کلیم کی شخصیت ہوتی ہے۔ اللہ کا کلام کسی اور کے کلام کے مقابلے میں اُتنا ہی بڑا ہے، جتنا اللہ تعالیٰ خود۔ اِسی طرح پیغمبر ﷺ کی بات کو باتوں کی پیغمبر سمجھو۔ عدل یہ ہے کہ کلام کو کلیم کی عظمتوں کے حوالے سے سمجھو، ورنہ یہ تو عام مشاہدہ ہے کہ میٹھی زبانوں میں تقریر کرنے والے سماجی زندگی کی شریانوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ عجب بات ہے کہ لوگ سیاست میں معمولی مقام حاصل کرنے کے لیے قرآن بولتے ہیں، حدیث بولتے ہیں، اقبالؒ اور رومیؒ بولتے ہیں، فصاحت و بلاغت بولتے ہیں اور مقصد؟ ___ ووٹ! عدل کیا ہے؟ ___ قابلِ غور ہے!!

فصیح البیان نظر آنے والا مرتبے کا لالچی اِنسان دراصل فصیح البیان نہیں۔ یہ آدمی

عادل نہیں۔ یہ دوسروں کے مضامین یاد کر کے اپنے بنا کر پیش کرتا ہے اور یہی بات عدل کے خلاف ہے۔ اِس سے زیادہ عدل دشمنی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی دوسروں کے لکھے ہوئے الفاظ اپنی کتاب، اپنے ڈرامے اور اپنی تقریر میں ایسے استعمال کرتا ہے جیسے یہ اُس کا پیدائشی حق ہے یا جیسے وہ چوری نہیں کر رہا، عزت افزائی کر رہا ہے۔ تعلق کی اور بات ہے۔ اپنوں کی چیزیں اپنی ہی ہوتی ہیں۔

بہر حال ہمیشہ سچ بولنے والی زبان ہی مشکل کے لمحات میں سچ بولے گی۔ ہمیشہ عدل کرنے والے، گفتگو میں عدل قائم رکھنے والے، اپنے فیصلوں میں ضرور عدل کریں گے۔ منصف کے لیے عدل کسی فیصلے کا نام نہیں، عدل زندگی کا نام ہے۔ اُس کی زبان ہمیشہ عدل بولتی ہے۔ گھر ہو یا عدالت، وہ ضرور عدل کرتا ہے۔

اگر سیاست میں عدل آ جائے تو یہ ملک کہاں سے کہاں ترقی کر جائے۔ سیاسی بزرگ عدل کے بزرگ نہیں ہوتے۔ سیاست میں سب کچھ جائز ہے اور یہی بات عدل میں ناجائز ہے۔ ہم اپنے نظامِ عدل کو خدائی نظامِ عدل کے مطابق بنائیں، نہ کہ خدائی نظامِ عدل کو اپنے تقاضوں کے مطابق!!

عدل اور میزان کا صحیح میدان تو میدانِ حشر ہی ہو گا، لیکن اس میدان میں اُترنے سے پہلے ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ عدل کا حکم دینے والی ذات، عدل کے علاوہ بھی مسائل کے حل کا ایک انداز عطا فرماتی ہے۔ عدل کرو، بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر فضل کرو تو بہت ہی اچھا۔ اللہ ہی کا ارشاد ہے کہ میری رحمت میرے غضب سے زیادہ وسیع ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ اِنسان کو اُس کے عمل کی عبرت کے حوالے کر دیا جائے، لیکن فضل کہتا ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ رحمت ہوتی ہی ہے، اعمال کی عبرت سے بچانے کے لیے۔ اگر اعمال کے ساتھ صرف انصاف ہی ہونا ہے تو پھر رحمت کیا ہے؟

اِنصاف یہ ہے کہ جب معاشرہ باغی اور مجرم ہو جائے تو اُسے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ پرانی اُمتیں اِسی طرح نیست و نابود ہو گئیں۔ کسی کو آواز نے آلیا، کوئی آندھی کی زَد میں آ گیا،

کسی کو رعد، کسی کو برق کا عذاب دیا گیا، کسی کو زمین نگل گئی اور کسی کو آسمان کھا گیا، لیکن عرب کا معاشرہ اسلام سے قبل تمام خامیوں کے باوجود تباہ نہیں کیا گیا۔ اللہ مالک ہے عدل کا، فضل کا۔ اُس نے خیال کیا، چلو اِس معاشرے پر رحم بھیج دیا جائے، بلکہ اِن پر رحمۃ للعالمین ﷺ کو بھیج دیا جائے۔ پس وہ معتوب معاشرہ مقبول معاشرہ بنا دیا گیا، بلکہ کائنات کا افضل ترین معاشرہ۔

ہمارے قانون میں مجرم کے لیے سزا رکھی گئی ہے۔ یہی عدل کا تقاضا ہے، لیکن مذہب نے گنہگار کے لیے استغفار کا موڑ رکھا ہوا ہے۔ کوئی خوش نصیب چاہے تو توبہ کر کے واپس لوٹ سکتا ہے۔ یہی ہے فضل کا اظہار، رحمت کی دلیل اور اِنسان کی خوش نصیبی کے اِمکانات۔ ہر خطرہ خطرناک نہیں ہوتا۔ ہر سانپ ڈستا نہیں ہے۔ خطرات کے باوجود زندگی کو امن وامان سے چلانے والے نے فضل اور رحم کے لنگر جاری رکھے ہیں۔ اپنی نیک اعمالیوں پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔ اُس سے عدل کی بجائے فضل مانگتے رہنا چاہیے، کیونکہ وہ بقول میاں محمد بخشؒ:

؎ عدل کرے تے تھر تھر کنبن اُچیاں شاناں والے
فضل کرے تے بخشے جاون میں جئے منہ کالے

یعنی اگر اللہ عدل کرے تو بڑے بڑے جہاندار اور جہانگیر لوگ اُس کے آگے کانپتے رہیں گے، اور وہ فضل کرے تو شاعر جیسا بد اعمال بھی بخشش سے مالا مال کر دیا جائے گا۔

عدل کرنا چاہیے، فضل ہونا چاہیے۔ غصّہ ختم ہونا چاہیے۔ جرم کی معافی ہونی چاہیے اور اگر ممکن ہو تو لوگوں کے ساتھ احسان ہونا چاہیے۔ ہمارا سارا سلوک لوگوں کے ساتھ ہی تو ہے — نیکی بدی سب لوگوں کے ساتھ، گناہ ثواب لوگوں کے ساتھ۔ لوگوں کے ساتھ ہمارا سلوک ہی اللہ سے سلوک ہے۔ یہاں عدل کرو، وہاں عدل مل جائے گا اور یہاں فضل کرو گے تو وہاں فضل ملے گا۔ بس رحم کرنا ہی رحم حاصل کرنا ہے۔ رحم کر کے رحم حاصل کر لینا چاہیے۔ عدل فضل کے تابع ہونا چاہیے۔ اِس میں سیخ پا ہونے کی کوئی بات نہیں۔

حقوق

کسی انسان کا کسی انسان پر یا سماج پر یا ملک و قوم پر کتنا حق ہے، اِس کے لیے کوئی قانون نہ بھی ہو، تب بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جس شے کی جتنی افادیت ہو گی، اُتنی ہی قیمت ہو گی — اُتنا ہی حق ہو گا۔

حقوق کا تعیّن، حقوق کا احترام اور حقوق کی ادائیگی کو توازن کہتے ہیں۔ حقوق کی حفاظت میزان ہے۔ حقوق کا لحاظ کرنے والا معاشرہ ایک متوازن اور فلاحی معاشرہ کہلاتا ہے۔

زندگی حقوق سے باہر نکل جائے تو سرکش و باغی ہو جاتی ہے۔ اِس کی تمام قدریں پامال ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اِس کا تمام جمال ختم ہو جاتا ہے۔ اگر زندگی حقوق سے محروم ہو جائے تو ایک بے بس، محکوم شے بن کے رہ جاتی ہے۔

کامیاب معاشرہ وہی ہے کہ چپکے سے فرائض ادا ہوتے رہیں اور چپکے سے ہی حقوق اَدا ہوتے رہیں۔ جس دَور میں انسان کو حقوق کے حصول کے لیے جہاد کرنا پڑے، اُسے جبر کا دَور کہتے ہیں اور اگر حقوق کے حصول کے لیے صرف دُعا کا سہارا ہی باقی رہ جائے تو اُسے ظلم کا زمانہ کہتے ہیں — اور وہ زمانہ جس میں کچھ لوگ حق سے محروم ہوں اور کچھ لوگ حق سے زیادہ حاصل کریں، اُسے افراتفری کا زمانہ کہتے ہیں۔ جہاں ہر شے، ہر جنس ایک ہی دام فروخت ہونے لگے، اُسے اندھیر نگری کہا جائے گا۔

حقوق اور حقوق کی اہمیت کا لحاظ ہی معاشروں کو ترقی کی منازل عطا کرتا ہے۔ ایک

دوسرے کے حقوق کے احترام سے ہی سماج میں قیام پیدا ہوتا ہے۔ دوسروں کے حقوق کا احترام کیے بغیر اگر اُن پر اختیار جتلایا جائے تو ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد جتلانے کے لیے اختیار ہی نہ رہے۔ حقوق کی ادائیگی محبّت پیدا کرتی ہے اور حقوق کی پامالی نفرت۔ محبّت اطاعت پیدا کرتی ہے اور نفرت بغاوت۔ طاقتور حقوق اَدا کرتا رہے تو طاقتور ہی رہے گا۔ حقوق نہ ادا کرنے والا ظالم کہلائے گا اور ظالم سے طاقت چھن جائے گی۔ یہ قدرت کا اصول ہے۔

انسان پر ایک زندگی میں کئی حقوق واجب الادا ہیں۔ تفصیل بیان کرنا ناممکن ہے۔ سب سے زیادہ اہم تین قسم کے حقوق ہیں، یعنی سماج کے حقوق، اپنی ذات کے حقوق اور اپنے خالق کے حقوق۔ سماج کے حقوق میں قوم کے حقوق، مُلک کے حقوق، حکومت کے حقوق، پاس رہنے والوں کے حقوق اور اُن لوگوں کے حقوق جہاں انسان مؤثر ہوتا ہے۔ قوم کے حقوق میں سب سے مقدّم حق یہ ہے کہ ہم قوم کو قوموں کی برادری میں معزز مقام دلانے کے لیے سعی کریں۔ قومیں اَفراد کی محنت سے سربلند ہوتی ہیں۔ ہم اپنے مفاد کو قوم کے مفاد پر قربان کرنا سیکھ لیں تو قوم ترقی کرنا شروع کر دے گی۔ اگر افراد قومی منفعت کو ذاتی مفادات پر نثار کرتے ہیں تو نتیجہ مناسب نہیں ہو سکتا۔

ہم لوگ قبیلے، ذاتیں، فرقے اور صوبائی اور مذہبی عصبیتیں ترک کر کے ایک قوم بنے ہیں۔ اگر پھر عصبیتیں لوٹ آئیں تو قوم ختم ہو جائے گی۔ ہم جب پاکستانی ہیں تو یہ ذات کیا اور وہ ذات کیا؟ سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی، کیا معنی؟ ہماری قومی شناخت پاکستان کے دَم سے ہے۔ ہم پاکستانی ہیں۔ ہمیں پاکستانی ہی رہنا چاہیے۔ یہ قوم کا حق ہے کہ ہم انفرادی تشخص کی بجائے اجتماعی تشخص کے حصول کے لیے کوشاں رہیں۔

ہم پر ملک کے حقوق اَدا کرنا ضروری ہیں۔ ہم وطن پرست رہیں۔ ہم مفادِ وطن عزیز رکھیں۔ ہم وطن کی آبرو پر آنچ نہ آنے دیں۔ ہم ملکی وحدت اور سلامتی کا خیال رکھیں۔ ہم سب ملک کے محافظ ہیں۔ ہم ہی ملک کا سرمایہ ہیں۔ ملک نے ہمیں ایک قوم بنایا، ایک وحدت

بنایا۔ اِس ملک کے حصول کے لیے بڑا خون قربان کیا گیا۔ بڑے کٹھن مراحل سے قافلہ گزرا ہے۔ بڑے مشکل زمانے آئے ہیں اِس قوم پر۔ بڑے طوفانوں سے گزرا ہے ہمارا ملک۔ ہمارے چھوٹے سے سفر میں ایک بڑا سا حادثہ بھی رُونما ہو چکا ہے۔ ابھی ہم اپنے ملک کے حقوق کا مکمل خیال نہیں رکھتے۔ چھن جانے کے بعد بہشت کی قدر ہوتی ہے۔ کہیں خدانخواستہ یہ ملک ہمیں نامنظور نہ کر دے۔ ابھی وقت ہے۔ ملک کے حقوق اَدا کرنا ضروری ہے۔ ہمیں گھر کی بات گھر تک رکھنا چاہیے۔ ہم اِس ملک کے اَمین ہیں۔ یہ ملک ہمارا محافظ ہے۔ ملک سلامت ہے تو ہم سلامت ہیں۔ یہ نہیں تو ہم کہاں —؟

ملکی زندگی میں ہر شخص کو شامل کیا جائے، ہر شخص کی زندگی میں ملک کو شامل کیا جائے، حقوق ادا ہو جائیں گے۔ ہمارے ذاتی اختلافات ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ہماری ذاتی اَنا ملک کے مفاد میں نہیں۔

ملک حکومتوں کی ذمہ داری ہوتے ہیں، لیکن عوام کے بغیر مُلک صرف جغرافیہ ہی تو ہے، صرف مٹی۔ حکومت اور عوام مل کر وطن کی تعمیر کریں تو ترقی ہو گی۔

عوام کا حق ہے کہ اُنہیں پُرسکون زندگی ملے۔ اُن کی نیندیں پُرسکون ہوں — دِن پُرسکون، راتیں پُرسکون، سرحدیں محفوظ، جان و مال محفوظ، مستقبل و حال محفوظ — غرضیکہ زندگی اپنی تمام رعنائیوں سمیت سلامت رہے — اور اگر خدانخواستہ ملک پر کوئی اُفتاد پڑے تو ہر زندگی ملک پر نثار ہونے کے لیے بے قرار ہو۔

اِنسان پر اُس کی اپنی ذات کے بڑے حقوق واجب الادا ہیں، اپنے ظاہر کے حقوق، اپنے باطن کے حقوق۔ ظاہر کے حقوق یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو ایک باعزت شہری بننے کے لیے تیار رکھیں۔ اپنے دَور کی رائج تعلیم کا حصول فرض ہے۔ ہمارا ہم پر حق ہے کہ ہم اپنے آپ کو گردوپیش سے باخبر رکھیں۔ اپنے ماحول سے آگاہ رہیں۔ ہم اپنے مشاہدات و تجربات سے دوسروں کو آگاہ کریں۔ چراغ سے چراغ روشن ہو اور یوں اَوہام پرستی سے نجات ملے۔ اپنی

شناخت قائم کرنا ہمارا فرض ہے۔ اپنا تشخص قائم کرنا ضروری ہے۔ اپنا لباس، اپنی زبان، اپنا لہجہ، اپنی جلوت و خلوت کا خاص خیال رکھنا ہمارا ہم پر حق ہے۔

ہمارے باطن کے حقوق میں سب سے بڑا حق یہ ہے کہ ہم احساس کی دُنیا زندہ رکھیں۔ ہم اپنے دِل کو محسوس کرنے والا بنائیں۔ سوچنے والا ذہن اور محسوس کرنے والا دِل نصیب والوں کو عطا ہوتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اپنے مذہب سے علمی اور عملی طور پر آشنا رکھیں تو حقوق ادا ہوں گے۔ مذہب صرف تعلیم نہیں، مذہب صرف عمل نہیں، مشین کی طرح — ہمیں اپنے مذہب کے ساتھ ایک شعوری لگن ہونی چاہیے۔ دین اور دُنیا کی فلاح کا حصول ہمارا مُدعا ہونا چاہیے۔ ہماری مساجد ہمارے لیے فلاحی مراکز بن جائیں تو ایک خوبصورت انقلاب آجائے۔

حقوق و فرائض کا خیال رکھنے والا معاشرہ ہمیشہ فلاحی ہوتا ہے۔ اِسلام سے بہتر کون سا دین ہو سکتا ہے اوراِس کے اصولوں سے زیادہ بہتر کوئی اصول نہیں ہو سکتا۔ اسلامی فلاحی معاشرہ دُنیاکے تمام معاشروں سے بہتر ہے۔ اسے قائم کیا جائے۔ اسلامی فلاحی معاشرہ حکم اور جبر سے قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ محبّت اور شوق سے قائم ہو گا۔ ہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں، معاشرہ بن جائے گا۔ جب تک انسان اپنی رُوح کو بیدار نہیں کرتا، وہ کوئی فلاحی کام نہیں کر سکتا۔

ایک روشن روحانی زندگی کا حصول بھی ہم پر فرض ہے۔ یہ ہمارا حق بھی ہے کہ ہم کسی روحانی تجربے سے گزریں اور اگر ممکن نہ ہو تو کم اَز کم کسی رُوحانی بزرگ سے آشنائی تو ہونی چاہیے۔ رُوح زندہ تو انسان زندہ، نہیں تو نہیں۔

اِنسان کا سوچنا بھی عمل ہے اور محسوس کرنا بھی ایک عمل ہے۔ ایک اِنسان کسی کھیت، کھلیان، فیکٹری، دفتر میں کام کر رہا ہو، اُسے مصروف کہیں گے۔ وہ کام کر رہا ہے۔ ایک کرسی پر خاموشی سے آنکھیں بند کیے سوچنے والا اِنسان بظاہر بے کار بیٹھا ہے لیکن یہ بہت بڑا کام

کر رہا ہے۔ فکر کے سمندروں میں غوطہ لگانے والے، گوہرِ مراد نکالنے والے لوگ محسنین کہلاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی فکر ہی اُن کا عمل ہے۔ صاحبِ فکر ہونا بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمارا یہ حق مقدم ہے کہ ہم خود کو صاحبِ خیال بنائیں، صاحبِ فکر بنائیں۔ قوم کو نئی منزلوں سے آشنا کروانے والوں کا احترام سب پر فرض ہے۔ اُن کا حق ہے کہ اُن کی حفاظت کی جائے، اُن کا خیال رکھا جائے۔

اِنسان پر سب سے اہم حق خدا کا ہے۔ زندگی دینے والا چاہتا ہے کہ زندگی اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چلائی جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے محبوب ﷺ کا راستہ ہی محبوب راستہ ہو۔ اللہ کریم انسانی زندگی کو اپنی طرف گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اِنسان اُس کی طرف رجوع رکھے۔ اُس کی طرف سفر کرے۔ اُس کی طرف گامزن رہے۔ خدا سے غافل رہنے والی زندگی حجابات میں کھو جاتی ہے۔ خالق کے خیال کو چھوڑ کر مخلوق کے خیال میں گم ہونے والا انسان دین و دُنیا کے خسارے میں رہتا ہے۔ اللہ ہمیں ایک ہمیشہ رہنے والی سرشاری کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اِس عارضی زندگی کو ایسے اصولوں کے مطابق بسر کریں کہ اَبدی حیات حاصل کر سکیں۔ وہ ہمیں حقیقی خوشی اور سَرخوشی سے تعارف کرواتا ہے۔ وہ اپنے محبوب ﷺ کی محبّت سے نوازتا ہے۔ وہ ہمیں ایک کامیاب زندگی سے تعارف کرواتا ہے۔ ہم پر فرض ہے کہ اُس کی اطاعت کریں۔ یہ اُس کا حق ہے، سب حقوق سے مقدّم حق، جو ہمیں ادا کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی ادائیگی ہے جس میں کوئی معذوری، کوئی مجبوری آڑے نہیں آسکتی۔ یہ وہ فرض ہے جس کے اَدا نہ کرسکنے کا کوئی جواز معقول نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے بھی لوگوں کے حقوق کی ادائیگی فرض کر دی ہے۔ مثلاً اللہ نے فرمایا کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ یہاں تک کہ اُن کے آگے اُف بھی نہ کہو، اور اگر والدین بڑھاپے میں پہنچ جائیں تو اُن کے لیے اپنے بازو رحمت و شفقت کے بازو بنا دو اور دُعا کرو کہ اے اللہ! میرے والدین پر ایسے رحم فرما جیسے انہوں نے بچپن میں مجھ پر رحم

فرمایا۔ ماں باپ کی اطاعت حقوق العباد میں شامل ہے، لیکن حقوق العباد اللہ ہی کے مقرر کیے ہوئے ہیں — یعنی حقوق العباد بھی حقوق اللہ ہی ہیں۔

اللہ نے فرض کر رکھا ہے کہ لوگ اللہ کے محبوب ﷺ کی اطاعت کریں۔ حضور ﷺ کی آواز سے اونچی آواز تک نہ نکالیں۔ حضور ﷺ کے فرمان سے زیادہ معتبر کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ حضور ﷺ کے بتائے ہوئے راستے کے علاوہ کوئی بھی راہ اِس قابل نہیں کہ اُس پر چلا جائے۔

اِنسان اللہ کے بتائے ہوئے حقوق ادا کرتا چلا جائے تو فلاح یقینی ہے۔ رہا اِنسان کا اپنا حق اللہ پر، وہ تو اِنسان نے پیدا ہوتے ہی حاصل کر رکھا ہے۔ اُس کے پیدا ہونے سے پہلے خوراک کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اُس کی پرورش کرنے کے لیے والدین موجود تھے۔ اُس کے استقبال کے لیے پوری دُنیا موجود تھی۔ اُسے آنکھیں عطا کر دی گئیں اور دیکھنے کے لیے ایک خوبصورت کائنات موجود تھی۔ یہاں تک کہ عبادت کے لیے مسجد تک موجود تھی۔ اِس کے باوجود اللہ کا ارشاد کہ اے بندے! مجھ سے مانگ! اللہ دُعائیں سنتا ہے، قبول کرتا ہے۔ اُس نے موسموں کو حکم دے رکھا ہے کہ اِنسان کے لیے مناسب ہوا اور خوراک کا انتظام کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اطاعت کرنے والے اِنسان کو اشرف بنا دیا۔ زمین و آسمان مسخر کرنے والا اِنسان صِرف اپنے رَبّ کے سامنے جھکنے کا فرض ادا کرے، اُسے ہر چیز کو جھکانے کا حق ہے۔ سب کو نِگوں کرنے والا، اپنے مالک کے سامنے سرنِگوں ہو جائے — یہ حق ہے۔ اللہ ہمیں حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۞۞۞

مقصد

ہم کسی ایک زمانے میں کسی آنے والے زمانے کے لیے، اپنے لیے ایک مقصد بناتے ہیں تا کہ وہ آنے والا زمانہ آسانی سے گزرے، لیکن جب وہ زمانہ آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جسے آنا تھا، وہ نہیں آیا، بلکہ کچھ اور ہی آگیا، یا وہ گزرا ہوا زمانہ جس میں ہم مقصد بنا رہے تھے، وہ اِس قابل ہی نہیں تھا کہ ہم نئے زمانے کو پرانے زمانے کی نگاہ سے سمجھ سکتے۔ اِس طرح مقصد کا حصول ایک بے معنی کھیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اِس میں کوئی ابہام نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عین عالمِ شباب میں ایک آسان بڑھاپا گزارنے کے لیے ہم محفوظ ترین راستہ یعنی سرکاری ملازمت کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جب وہ بڑھاپا آتا ہے تو ہمارے ساتھ ہونے والا سلوک وہ نہیں ہوتا جس کی توقع اور انتظار میں ہم نے جوانیاں گزاریں۔ ریٹائرمنٹ کا دَور بس ہر لحاظ سے معزولی کا دَور ہوتا ہے۔ سرکاری مکان سے ایسے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے جیسے ہمارا اُس کے ساتھ کبھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ سرکاری نظام ایک سنگین ڈسپلن کے طور پر ہمیں کچل کر رکھ دیتا ہے۔ ہمارے اعضاء شل ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہماری توانائیاں، رعنائیاں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ پنشن سے گزر نہیں ہوتی اور ہم ایک تنگ گلی سے گزر کر بند گلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نیا مکان بنا نہیں سکتے، پرانے میں رہ نہیں سکتے کیونکہ وہ سرکاری تھا۔ بچوں کے مسائل بدستور حل ہونے والے رہتے ہیں اور ہم سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہم نے کیا مقصد بنایا تھا۔ ہم نے کیا سوچا تھا، ہم نے کیا پایا! وہ جو دُور سے خوبصورت نظر

آرہا تھا، قریب سے اِتنا بھیانک نکلا، جیسے ہمارا چاند — دُور سے چاندنی دیتا ہے اور قریب جاؤ تو تاریک ہو جاتا ہے۔ عجب بات ہے۔ ایسے جیسے سایہ دار درخت ہمیں دعوتِ سفر دیں اور جب دھوپ سَر پر آ جائے تو وہی درخت آنکھیں چُرا لیں اور اپنے پتے چھپا لیں۔ ہم نہ آگے جاسکتے ہیں، نہ پیچھے۔ اب مواقع نہیں ہوتے کہ ہم دوبارہ کوئی مقصد بنالیں، دوبارہ کوئی نیا راستہ بنالیں۔ بس اُمّیدیں حسرتیں بن جاتی ہیں۔ سرکاری درجات ہمارے لیے ایک بے مقصد اور بے معنی لفظ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہماری اَنا بدستور افسرانہ رہتی ہے اور ہمارے حالات غریبانہ۔ ہم خود کو بدستور عالی مرتبت سمجھتے ہیں لیکن مرتبے خواب ہو چکے ہوتے ہیں۔

ہم مقصد پر بہت زور دیتے ہیں کہ زندگی کا ایک مقصد ہونا چاہیے، زندگی کا ایک مفہوم ہونا چاہیے اور زندگی کسی ٹارگٹ کی طرف رواں ہونی چاہیے، لیکن ٹارگٹ تک پہنچنا اور ٹارگٹ سے وہ سکون حاصل کرنا، جس کے لیے ٹارگٹ بنایا ہے، یہ ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔ نتیجہ وہی پریشانی — حیرانی!!

ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنی بھی چاہیے۔ ہم انجینئر بننا چاہتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔ ہم اور بہت کچھ بننا چاہتے ہیں، لیکن جب ہم ایم بی بی ایس کر لیتے ہیں تو ہماری اُمّیدیں بہت وسیع ہوتی ہیں اور ہمارے لیے راستے بہت محدود۔ یہ کیا غضب ہے کہ ایک ڈاکٹر سروس کی تلاش میں اُسی طرح سرگرداں پھرتا ہے جیسے انجینئر۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ڈگری لینا تو آسان ہے لیکن نوکری لینا بہت مشکل ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ نوکری کے لیے رشوت ضروری ہے، یعنی پیسہ کمانے کے لیے پیسہ لگانا بہت ضروری ہے اور جس آدمی کے پاس لگانے کے لیے پیسہ نہ ہو، اُسے مزید کمانے کا حق بھی نہیں، اور اِس طرح بے شمار ڈاکٹر نفسیاتی مریض ہو کر رہ جاتے ہیں۔ شہروں میں تعلیم حاصل کرنے والے ایسے گاؤں میں تعینات کر دیے جاتے ہیں (اور یہ تعیناتی ایک الگ داستان ہے)، جس گاؤں میں سڑک تک نہیں جاتی اور بعض جگہ تو بجلی بھی نہیں ہوتی۔ وہاں ائیر کنڈیشنر میں رہنے والے ڈاکٹر ہاتھ میں

پنکھا لیے اپنے دیہاتی بھائیوں کی خدمت کے لیے بھیج دیے جاتے ہیں اور کچھ عرصے بعد اُن میں سے اکثر دماغی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ نوکری کے لیے سفارش ضروری ہے۔ غریب ڈاکٹر جس کے ماں باپ نے قرض لے کر اپنی اولاد کو پڑھایا ہو اور اُن کو ایم بی بی ایس کروایا ہو، وہ ایسی مشکل اور بے بسی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ! ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ایک نیا امتحان ضروری ہوتا ہے، یعنی پبلک سروس کمیشن — بس اِس کے بعد حاصل کیے ہوئے مقصد کی بے مقصدیت واضح ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ فارسیاں بھول جاتی ہیں اور ایم بی بی ایس کا حصول بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی نہیں، ہر پیشے میں کچھ ایسے ہی واقعات ہوتے ہیں۔ البتہ چند خوش قسمت یعنی خوش تعلق لوگ ایسے بھی ہیں جو کبھی ریٹائر ہی نہیں ہوتے۔ ہر بار اُن بے چاروں کو کوئی نہ کوئی معقول وجہ اپنی سروس جاری رکھنے پر مجبور کر دیتی ہے اور اُن کے لیے صرف حال ہی مستقبل کا زمانہ بن جاتا ہے۔ وہ کبھی ریٹائر نہیں ہوتے — بس اللہ کی مرضی!!

دراصل مقصد بنانا اپنی آزادی کا ایک اعلان ہے کہ ہم جو چاہیں بن سکتے ہیں، جو چاہیں کر سکتے ہیں، ہم آزاد ہیں، جو چاہیں راستہ اختیار کر سکتے ہیں لیکن راستہ بنانے والوں نے راستے ہی کچھ اس طرح سے بنا رکھے ہوتے ہیں کہ وہ آزاد راستے پابند منزل تک ہی پہنچے ہیں۔ انسان کی آزادی صرف انسان کا اپنا احساس ہے — خوش فہمی ہے یا غلط فہمی۔ ہم بہت کچھ کرتے ہیں لیکن ہم ایک کام نہیں کر سکتے — زندگی کو ناگہانی سے نہیں بچا سکتے۔ خوبصورت شہر بنا سکتے ہیں، شفاف سڑکیں بنا سکتے ہیں، کارخانے لگا سکتے ہیں، مِلّیں چلا سکتے ہیں، لیکن ایک بات — کہ بڑے بڑے شہروں میں بھی قبرستان کے لیے جگہ مقرر کر دیتے ہیں اور ہمیں وہاں پہنچنا ہوتا ہے، نہ جانے کب کس کو بلا لیا جائے اور یوں آزاد مقصد ایک مجبور انجام میں ختم کر دیا جائے۔ قبروں پر کتبے پڑھنے سے عجیب بات دریافت ہوتی ہے کہ لکھا ہوتا ہے، جناب چودھری فلک شیر حکیم حاذق، دستِ شفا، اور ساتھ ہی بے شمار ایسے مزار ہوتے ہیں جن پر کوئی کتبہ نہیں ہوتا، اور وہ بڑے

آسودہ حال ہوتے ہیں۔ یہ تو کوئی مقصد نہ ہوا کہ حاذق بھی مر جائیں اور مریض بھی مر جائیں— دستِ شفا بھی ختم ہو جائے، دستِ عطا بھی ختم ہو جائے—اور دستِ سوال بھی ختم ہو جائے۔

مقصد پر اور مقصد کے انتخاب پر اتنے ہنگامے کا کیا فائدہ؟ یہ نظام ہے کسی اور کا، یہ پروگرام ہے کسی اور کا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم پروگرام بنانے والے ہیں۔ ہم خوش رہنا چاہتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہم ہنستے ہنستے رونے لگ جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ تو کچھ نہیں ہوا— ہمارے کسی عزیز کے ساتھ کچھ ہو گیا۔ مرا تو وہ—بس ہمیں غم مِل گیا، بغیر قصور کے سزا مل گئی۔ مقصد کیا ہے؟—خوشی کیا ہے؟ — حاصل کیا ہے؟ — محرومی کیا ہے؟—یہ سب کیا ہے؟—ہمیں سوچنا پڑے گا۔

مقصد کا تعین کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ ہماری زندگی کس حد تک ہماری اپنی ہے؟ اِس میں ہمارا سماج شامل ہے اور ہمارا سماج "ہم" نہیں ہوتے۔ اِس میں ہمارا دِین شامل ہے اور ہمارا دِین ہم نے نہیں مقرر کیا۔ یہ عطا ہے کسی اور ذات کی۔ ہماری زندگی میں ہماری صلاحیتیں شامل ہیں اور ہماری صلاحیتیں محدود ہیں— کافی حد تک مسدود ہیں۔ ہم ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ ہم نیند کے حصار میں ہیں۔ ہم بھوک کے غلبے میں ہیں۔ ہم مجبوریوں کو دُور کرنے میں لگے رہتے ہیں اور مجبوریوں سے نئی مجبوریاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ زندگی ریاضی کا ایک سوال نہیں، جس کا جواب معلوم ہو سکے۔ یہ معمہ ہے جسے کسی فارمولے میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ہم سماج میں مرتبہ چاہتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صاحبانِ مرتبہ کا کردار کبھی کبھی وہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے—سیاست کا میدان ایک مختلف نوعیت کا ہوتا ہے— تعلیم کی دنیا ایک الگ مزاج کی دنیا ہے— کاروباری انداز کسی اور عمل کا متقاضی ہے۔ انسان کیا مقصد بنائے! جب ہم مقصد تک پہنچتے ہیں اور ہمیں وہ نتیجہ نہیں ملتا جو دُور سے نظر آ رہا تھا تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انجینئر لوگوں کے پاس مال کی فراوانی ہے لیکن قریب

جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ اِن بے چاروں کی تنخواہ تو تھوڑی ہوتی ہے۔ پھر کیا چیز ہے جو اُن کو ایک اچھے معیار کی زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہے اور وہ کس خفیہ خزانے تک رسائی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، اور اُن کی آمدن کس حد تک جائز اور حلال ہے؟ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ رشوت لیتے ہیں اور کچھ لوگ یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں کہ انجینئر قسم کے لوگ رشوت لیتے ہیں۔

رشوت تو اسلام میں منع ہے اور پاکستان میں سب لوگ مسلمان ہیں۔ یہاں کون رشوت لے سکتا ہے؟—ہم اِس بات کو ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ یہ رشوت دینے والے ہی پاگل ہوتے ہیں، بس فٹافٹ ہی پیسے نکال کر میز پر رکھ دیتے ہیں— آخر اِنسان مجبور تو ہو جاتا ہو گا۔ بس یہی وجہ ہو سکتی ہے رشوت کی۔ بہر حال اگر مقصد پیسہ ہے تو پھر کسی قسم کی بھی تعلیم ہو، اُس میں کیا ہنگامہ ہے؟ اور یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ کیا تعلیم حاصل کرنے کے بعد پیسہ ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دکاندار مثلاً سبزی فروش کسی لمبے چوڑے علم کے بغیر لمبا چوڑا مال کماتا ہے۔ سیاست دان—اللہ اُن پر رحم کرے—اگر مقصد دیانت داری ہے، تو نتیجہ دُشواری بھی ہو سکتا ہے۔ اگر مقصد دولت ہے، تو رستہ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اِس مقام پر لوگ گمراہ ہوتے ہیں—ڈاکے ڈالتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کچھ کرتے ہیں۔

جس آدمی نے حصولِ زَر کو مقصدِ حیات بنایا، اُس کے لیے کسی اور قسم کی بندش اور پابندی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے، اور یہاں وہ تعلیم یافتہ لوگ بھی پریشان ہو جاتے ہیں جو محنتیں کر کے ڈگریاں لیتے ہیں۔ اگر حصولِ مقصد دولت کو مان بھی لیا جائے تو ہم سے زیادہ مغرب اور مغربی تہذیب اِس مقصد میں کامیاب ہیں۔ اُن کے پاس خزانے ہیں اور خزانے حاصل کرنے کا علم بھی ہے اور طاقت بھی—صرف دِین نہیں ہے، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے—دِین کا ذکر ہے، پیسے کی تمنا ہے، دلوں میں خوف ہے اور تلاشِ معاش میں سرگرداں رہنا ہمارا مستقل عمل ہے۔ ہمیں غور کرنا پڑے گا، سوچنا پڑے گا کہ مقصد کیا ہوتا ہے؟ انفرادی مقصد کسے کہتے

ہیں؟ اور ملّی اور قومی مقصد کیا ہوتا ہے؟

انسان کا مقصد اللہ کے بنائے ہوئے مقصد سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اللہ فرماتے ہیں: ''مَیں نے جِنّوں اور اِنسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا'' —اور اگر ہم صرف عبادت میں مصروف ہو جائیں تو ہمارے پاس عبادت کے لیے بھی وسائل نہیں رہیں گے۔ وسائل حاصل کریں تب بھی مشکلات میں آجائیں گے۔

صبح سے شام تک ہم دیکھتے ہیں کہ ہم کن راستوں سے گزرتے ہیں۔ صبح اکثر لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ اِس میں دِین کی کوئی بات نہیں۔ تلاوت کرنے والے زمانے اب پرانے زمانے ہو گئے۔ ہم مختلف ذرائع سے اپنے اپنے کاروبار تک جاتے ہیں۔ اِن ذرائع میں کوئی دینی حوالہ نہیں ہوتا، مثلاً کسی کی گاڑی خراب ہو تو وہ کسی مقامی خانقاہ میں نہیں جائے گا بلکہ مکینک کے پاس جائے گا۔ موٹر مکینک اسلام سے ناآشنا بھی ہو سکتا ہے —اور یہی نہیں، کاریں بنانے والے کافر بھی ہو سکتے ہیں، یہودی بھی ہو سکتے ہیں۔ ہم یہودیوں کی گاڑی میں بسم اللہ پڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس اتنا ہی ہمارا اسلامی فرض ہے۔ ہم نے اِس سے آگے کبھی سوچا ہی نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس بھی یہودیوں کا بنا ہوا اسلحہ ہے۔ اب ایسا اسلحہ لے کر اسلامی جہاد اور عالمی جہاد کس حد تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ کیا طاقت مقصدِ حیات ہے؟ طاقت تو پھر اور لوگوں کے پاس ہے۔ دِین اور صرف دِین سے انسان کی ضروریات پوری ہونا ذرا مشکل سا نظر آتا ہے۔

دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے والے نوجوان مبلغ کسی مسجد کے امام بنا دیے جاتے ہیں اور ایچی سن کالج کے فارغ التحصیل نوجوان عام طور پر انتظامیہ کے سربراہ بنا دیے جاتے ہیں۔ ایسا فرق؟ —اِس ملک میں—؟ کیسی بات!! کیا ایسا ممکن نہیں کہ شاہی مسجد کا امام گورنر بھی ہو، یا گورنر شاہی مسجد کی اِمامت کے فرائض ادا کرے۔ ہم جس کا حکم مانیں، اُس کے پیچھے نماز بھی پڑھیں اور جو جتنا بڑا حاکم ہو، اُتنا بڑا مفتی بھی ہو—پھر بات بنتی ہے۔ یعنی سربراہ

کو دونوں لحاظ سے سربراہ ہونا چاہیے۔ دُنیاوی اور دِینی دونوں طرح سے، اور اِس طرح مقصدِ تخلیقِ پاکستان آسانی سے واضح ہو سکتا ہے۔

ہمارا ذاتی مقصد ایک ذاتی زندگی کی آسودگی ہو سکتا ہے لیکن اجتماعی مقصد، ذاتی سفر کی کامیابی کے علاوہ ایک مِلّی سفر کے سرانجام دینے کا نام ہے۔ اگر ذاتی مقصد مِلّی مقصد سے متصادم ہو تو بھی بے معنی، اور دینی مقصد سے مختلف ہو تو بھی بے مقصد۔ لٰہذا مقصد تجویز کرنے والے بڑے فکر اور تدبر سے کام لیں کہ طالب علموں کے لیے ایک کامیاب زندگی کا حصول بھی ممکن ہو اور کامیاب قوم کا حصول بھی، ورنہ ذاتی کامیابیاں ہی اجتماعی ناکامی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اگر ذاتی مقصد کا حصول یہی ہے کہ اِس ملک کو اپنے لیے استعمال کیا جائے تو وہ آدمی کہاں سے آئیں گے جو اِس ملک کے لیے استعمال ہوں۔

پروفیشن ایک وبا ہے جو ملک کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ہر آدمی الگ کامیاب ہے۔ لوگ مال جمع کرتے ہیں، گنتے رہتے ہیں اور اُن کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ واضح ہے کہ یہ لوگ کہاں پہنچا دیے جائیں گے — ایک کھولتی ہوئی آگ —!

اگر ملک کو ایک درخت سمجھ لیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ہر بامقصد انسان اپنی سہولت کے لیے اس کی ایک آدھ شاخ کاٹ لیتا ہے اور اب کوئی انسان نظر نہیں آتا جو اپنے آپ کو قربان کر کے اِس درخت کی خدمت کرے۔ جو شخص صرف مال اکٹھا کر رہا ہے، اُس کے لیے سکون کی دولت ناممکن کر دی جاتی ہے۔ ملک قربانیوں سے بنتے ہیں۔ ملک آسائش حاصل کرنے والوں کے ذریعے سے مضبوط نہیں ہو سکتا۔ ملکوں کی ترقی کے لیے مضبوط کردار، ایک بامقصد قوم اور ایک لگن درکار ہے، جس میں اللہ کے فرمان بھی پورے ہوں اور ہمیں اِس دُنیا کے معیار کے مطابق ترقی بھی حاصل ہو۔ ابھی وقت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم صرف بحث کرنے والی قوم بن کر رہ جائیں۔ سماج میں بے شمار برائیاں بیان کی جاتی ہیں لیکن کوئی شخص آگے بڑھ کر انہیں دُور کرنے کا اِرادہ تک بیان کرنے کو تیار نہیں ہے۔

کوئی شخص اپنی دولت سے اپنی خوشی کے ساتھ اپنے غریب بھائی کی مدد نہیں کر سکتا۔ ابھی تک کسی شخص نے اعلان نہیں کیا کہ وہ نہ کبھی رشوت لے گا اور نہ کبھی رشوت دے گا۔ ملک کی خدمت جلسے جلوس میں نہیں ہے۔ یہ مسلسل بیداری سے حاصل ہوتی ہے — مسلسل سوچ کے ساتھ اور قوم کو ایک وحدت میں پرونے کے ساتھ۔ جب تک وحدتِ کردار حاصل نہ ہو، وحدتِ مقصد حاصل نہیں ہو سکتی۔

خالی ترقی ایک ایسے جہاز کی طرح ہے جو پانی پر تیرتا ہے، ڈوبتا نہیں ہے — چل رہا ہے لیکن اُسے یہ معلوم نہیں ہے کہ جانا کہاں ہے؟ بے سمت ترقی اور بے جہت مسافرت، بے معنی سفر ہے۔ مقصد کا انتخاب کرتے وقت صرف یہی نہیں دیکھنا کہ ہم پیسہ کیسے بنائیں گے بلکہ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہم اِس ملک کی کیسے خدمت کر سکتے ہیں اور اِس چند روزہ زندگی میں اپنے مالک کو کس طرح خوش رکھ سکتے ہیں۔ بس! ایسی زندگی گزارنی چاہیے کہ ہم بھی خوش رہیں، ملک کو بھی عروج حاصل ہو اور ہمارا اللہ بھی راضی رہے۔ یہی مقصد سب سے بہتر ہے۔

منزل

زندگی جہاں چاہے جب چاہے، شروع ہو سکتی ہے اور جہاں چاہے جب چاہے، ختم ہو سکتی ہے۔ عجب بات تو یہ ہے کہ زندگی سے پہلے بھی زندگی تھی اور زندگی کے بعد بھی زندگی رہے گی۔ ہم اپنی پیدائش سے اپنی موت تک تقریباً ساٹھ سال کے عرصے میں منزلوں کا ذکر کرتے ہیں، منزلوں کا تعین کرتے ہیں اور منزلوں کی تلاش کرتے ہیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہی تلاش اور یہی حاصل ہی کُل کائنات ہے، حالانکہ ہمارے دنیا میں آنے سے پہلے بے شمار لوگ اپنی منزلوں کو پا بھی چکے۔ اُن لوگوں نے اپنی اپنی محنتوں، کاوشوں اور تلاش کے جھنڈے گاڑ دیے اور جو مقامات وہ لوگ حاصل کر گئے، اب کسی قیمت پر بھی وہ مقامات ہم حاصل نہیں کر پاتے۔ پھر بھی ہم منزلوں کی تلاش میں رہتے ہیں، جبکہ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ ہمارے بعد بھی یہی مقصد ہو گا، یہی کارواں ہوں گے اور یہی منزلیں ہوں گی۔ پھر بھی ہم اسی خیال میں گم ماضی اور مستقبل سے بے نیاز، بلکہ حال سے بھی بے خبر، اپنے مقصد کو اپنی منزل کہتے ہوئے مسلسل بڑھتے رہتے ہیں اور کبھی مقصد پا لیا تو صاحبِ منزل کہلائے، اور اگر مقصد نہ پا سکے تو بھی صاحبِ نصیب ہی کہلائے۔

منزلوں کے راستوں میں دَم توڑ جانے والے بھی صاحبانِ منزل ہی ہوتے ہیں۔ مقصد سے حاصل تک سارا سفر تمام کیفیات، تمام آسائشوں اور تکلیفوں سمیت منزل ہی کہلاتا ہے، یعنی نیت بھی منزل، عزمِ سفر بھی منزل، سفر بھی منزل اور اگر کوئی ہم سفر مل جائے تو وہ

بھی منزل — اور اگر کوئی رہنمائے سفر مل جائے تو وہ بھی منزل — اور اگر مقصد کا قرب مل جائے تو وہ بھی منزل — اور اگر مقصد حاصل ہو جائے تو وہ بھی منزل — اور کبھی کبھی انسان مقاصد سے آگے نکل جائے تو بھی منزل — یعنی ورائے منزل بھی منزل ہی ہے — جیسے مشرق سے پرے بھی مشرق، مغرب کے پار بھی مغرب ہی ہے۔ منزلوں کے راستوں پر ایک ایک نقشِ قدم نشانِ منزل ہے اور نشانِ منزل بھی منزل ہے۔

منزل حاصل کرنے کا کوئی خاص فارمولا نہیں ہے۔ یہ منزل کا اپنا کمال ہے کہ وہ اپنے مسافروں کو اپنے حضور طلب کرتی رہتی ہے۔ خود ہی اُن میں ذوق پیدا کرتی ہے، خود ہی سفر کا انتظام کرتی ہے اور خود ہی ہم سفری کے فرائض ادا کرتی ہے — اور کسی وقت کسی نکتے پر خود ہی اپنے مسافروں کو خوش آمدید کہتی ہے، مسکراتی ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

منزل کا تصور بہت بڑا کرشمہ ہے۔ انسان زمین پر رہتے ہوئے محسوس کرتا ہے کہ آسمانوں پر رہ رہا ہے۔ وہ آبادیوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ لوگ سو رہے ہوتے ہیں، وہ جاگ رہا ہوتا ہے۔ لوگ جشن مناتے ہیں، وہ زندگی کی اُداس حقیقتوں پر عارفانہ نگاہ رکھتا ہے۔ لوگ آغاز کے نشہ آور لمحات میں مست ہوتے ہیں اور وہ اُداس انجام کی تلخیوں کے نتائج سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ صاحبِ منزل کسی خاص نقطے پر نہیں پہنچتا، بلکہ وہ حقائق کا نکتہ دان ہوتا ہے۔ یہ سب دینے والے کا احسان ہے کہ وہ کسی انسان کو کیا عطا کر دے۔ بے خبر زندگی میں باخبر ہو جانا، منزل کا احسانِ اوّلیں ہے۔

منزل، دینے والے کا احسان ہے۔ اِس کا کوئی فارمولا نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی نے دار پر چڑھ کر منزلوں سے وصال کیا — منزلوں کا جلوہ دیکھا — وصال کی لذّت سے آشنا ہوئے — منزل آئی اور زندگی گئی — کیا عجب مقام ہے!! شاید منزل کا حصول جان کے جانے سے مشروط ہے۔ کہیں راہِ فراق، واصلِ منزل ہو رہا ہے — جدائی کے زمانے محبّت کے پروان چڑھنے کے زمانے ہیں۔ یہ بڑے غور کا مقام ہے کہ کسی کو محبوب نہ ملا اور منزل مل گئی، جبکہ اُس

کے خیال میں محبوب ہی منزل تھا۔

یہ بات انسانی سمجھ سے بالا ہے کہ انسان جان ہار جائے اور مقصد جیت لے۔ اکثر ہارنے والوں نے منزلوں کو جیتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میدانِ کربلا میں جنگ ہار گئی اور مقصد جیت لیا گیا۔ اِمامؑ قربان ہوئے اور اِسلام زندہ ہوا۔ جان دینا بڑے راز کی بات ہے لیکن اس میں بہت غور اور فکر کی ضرورت ہے۔ قربانی اور خودکشی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خودکشی کرنے والے برباد ہو جاتے ہیں اور قربانی دینے والے شادابیٔ منزل میں پہنچا دیے جاتے ہیں۔ قربانی سے حاصل ہونے والی منزلیں ایک عجب لطف رکھتی ہیں۔ منزلوں پر پہنچنے والے بہت بڑے انتظامات کے قائل نہیں ہوتے۔ وہ ایک جذبے کے ماتحت سفر کرتے ہیں —وہ جذبہ بھی بے پناہ جذبہ! صاحبانِ منزل کے پاس جذبوں کی فراوانی ہوتی ہے۔ وہ صاحبانِ یقین ہوتے ہیں۔ راستے میں دَم توڑ جائیں، تو بھی دامنِ محبوب نہیں چھوڑتے۔

ایک صاحبِ منزل نے کچے گھڑے پر تیر کر منزلِ محبوب کی طرف سفر کیا۔ کچا گھڑا تھا، ڈوب گیا، لیکن اس ڈوبنے والے گھڑے نے وہ رنگ دکھایا کہ آج تک چناب کی لہریں اس منظر کو یاد کرتی ہیں اور دل والے اِن لوگوں کو اپنا پیشرو کہتے ہیں۔ منزل کا سفر شاید پہلے قدم کا ہی نام ہے۔ یقین کے ساتھ اٹھایا ہوا پہلا قدم جو جانبِ منزل ہو، وہی منزل ہے۔

منزل کسی جغرافیائی مقام کا نام نہیں ہے، کسی فاصلے کی لمبائی کا نام نہیں ہے، کسی قابلِ دید منظر کا نام نہیں ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے، جسے روشن نکتہ بھی کہا جاتا رہا ہے، جو انسان کے اپنے اندر موجود ہوتا ہے اور اس کا حصول، اس کا قرب، اس کا عرفان ہی حصولِ منزل کہلاتا ہے۔ کسی دُور کے نظارے کو حاصل نہیں کرنا، بلکہ اپنا اندازِ نظر ہی حاصل کرنا ہے — اور اگر قسمت ساتھ دے اور وہ اندازِ نظر مل جائے تو پھر ہر ذرّے میں کئی آفتاب موجود نظر آئیں گے۔ ہر قطرہ قلزموں کو جنم دینے والا ہو گا، اور انسان خود کو اپنی نگاہ میں کسی عظیم ماضی کا حرفِ آخر سمجھے گا اور اپنے آپ ہی کو آنے والے زمانوں کا آدم گردانے گا۔

فرد، فرد ہی ہے لیکن فرد ہی سے ملّتوں کا ظہور ہے — دیکھنے کا انداز ہے۔ میں بہت سی وجوہ کا نتیجہ ہوں اور میں ہی بہت سے نتائج کی وجہ ہوں۔ میرا ہونا، بہت کچھ ہونے کے برابر ہے اور میرا ہونا بھی کیا ہونا! میں نہ ہوتا تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا، اور اب میں ہوں تو بھی کچھ نہیں ہوں۔ یہی شعور منزلوں کی طرف گامزن کرتا ہے۔ میں ایک عظیم فنکار کا شاہکار ہوں اور میں اپنے فنکار کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ وہی میرا مقصد ہے، وہی میری منزل — اور اس کی پہچان کا صرف ایک راستہ بتایا گیا کہ خود کو پہچانو۔ اپنی ذات کی منزل طے کرو، اُس کی ذات کی رسائی ہو جائے گی — اور وہ ذات لامحدود اور لافانی — ہر جگہ موجود، ہر مقام پر حاضر، ہر شے پر وارد، ہر ہونے کا باعث، ہر نہ ہونے کی وجہ، بنانے والی ذات، زندہ کرنے والی ذات، مارنے والی ذات — ذاتِ مطلق کو تلاش کرنے کا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے!!

یہی وجہ ہے کہ کسی نے اسے آنکھ کے پردے کے اندر دیکھا، کسی نے اسے پردے سے باہر دیکھا، کسی نے صحراؤں کے اندر اپنی منزل پائی، کسی نے گلی کوچوں میں رسوائیاں حاصل کر کے اسے تلاش کیا۔ کوئی اس کی تلاش میں مارا گیا، کچھ لوگوں کو "اُس" نے خود مار دیا۔ وہ ذات اپنے چاہنے والوں کو الگ الگ مقامات پر نوازتی رہی۔ وہ دار پر بھی ملا اور سنگِ درِ یار پر بھی۔ ہر ایک نے اپنے آپ کو صاحبِ منزل ہی سمجھا۔ کچھ لوگ خاموش رہ کر مقامات پا گئے، کچھ لوگ گویائی کے چراغ جلا کر روشن چراغ ہو گئے۔ کچھ محبوب بنا دیے گئے، کچھ محبّ بنا دیے گئے — اور دونوں ہی صاحبانِ منزل ہوئے۔ یہی تو کمال ہے عطا فرمانے والے کا، کہ دل بھی اُس نے بنایا، دلبر بھی اُس نے بنایا، دِلبری بھی اُس نے پیدا فرمائی۔ جلوے بھی اُس نے عطا کیے۔ سوزِ دلِ پروانہ بھی اُس نے عطا کیا۔ درد کے نغمات اُس نے عطا فرمائے اور پھر اُس نے خود ہی نغمات سنے — اور اُن لوگوں کو منزلوں کے تحفے تقسیم کیے۔ اُس ذات کی طرف سے ملنے والی ہر شے اعجازِ منزل ہے۔

کبھی کبھی وہ اپنے مسافروں کو صاحبِ اَسرار بناتا ہے اور کبھی کبھی اُن کے ساتھ رہتے

ہوئے بھی انہیں اپنی خبر تک نہیں ہونے دیتا۔ وہ لوگ منزل پر ہوتے ہیں اور منزلوں کی تلاش میں ہوتے ہیں — جس طرح سمندر میں رہنے والی مچھلی پانی کی تلاش میں ہو — وہ پانی کو دیکھنا چاہتی ہے، دُور سے۔ اب پریشانی تو یہ ہے کہ جب تک وہ پانی میں ہے، پانی کو دیکھ نہیں سکتی اور جب پانی کو دیکھنے کے لیے پانی سے جدا کر دی جائے تو وہ زندہ نہیں رہتی۔ یہی عالَم اُن متلاشیوں کا ہے جو منزلوں پر ہیں اور منزلوں کی تلاش میں ہیں۔ منزلیں اُن کی ہم سفر ہیں اور وہ پھر بھی سفر میں ہیں۔ دراصل سفر اِلی اللہ ہی سفر مع اللہ ہے۔ منزل کسی خاص نقطے یا مقام کا نام نہیں ہے، یہ تو ایک نکتہ ہے جو وا ہو جائے تو بات بن جاتی ہے۔

وہ لوگ جنہیں ہم محرومِ منزل سمجھتے ہیں، دراصل وہ بھی محروم نہیں ہیں۔ یہ ہمارا اپنا ادراک ہے۔ کبھی ہم سمجھ سکتے ہیں، کبھی ہم نہیں سمجھ سکتے۔ بنانے والے نے یہ کھیل بنایا ہے کہ سب کچھ موجود ہے، موجود رہے گا اور موجود کی گواہی دینے والا ہی غیر موجود ہو جائے گا۔ کیا تلاش، کیا سفر اور کیا منزل!!

ہماری منزل، دینے والے کی منشا کا نام ہے۔ وہ جتنا کچھ دکھائے گا، وہی ہمارا حاصل ہے۔ اُس کے علاوہ تو شاید ہمیں معلوم ہی نہیں کہ یہاں کیا کچھ رکھا ہے۔ کتنی منزلیں، کتنے انعامات، کتنی سرفرازیاں انسان کے لیے موجود ہیں لیکن مجبوری ہے کہ انسان کے پاس لامحدود وقت نہیں ہے۔ خزانے لامحدود ہیں۔ منزلیں لامحدود ہیں۔ محدود زندگی میں ایک فانی انسان کیا منزل کا تعین کرے؟ کس سفر پر گامزن ہو؟ کہاں سے چلے اور کہاں پہنچے؟

بس یہ دن ہیں، جو ہمارا سرمایہ ہے۔ یہی زندگی ہے، جو ہم پر اُس کا احسان ہے۔ اِس احسان کو محسن کے نام پر ہی گزار دیا جائے، تو منزل حاصل ہو گئی۔ ورنہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُس کا فضل شاملِ حال ہو تو سونے والوں کو سرفراز کر دے، انہیں سب کچھ عطا کر دے اور اگر چاہے تو جاگنے والوں کو محرومِ دوعالَم کر دے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ لوگوں نے منزلیں پالیں۔ نہیں! یہ سارا کام کرنے والے کا اپنا ہی کام ہے — مسافر اُس کے، مقاصد اُس کے، مسافرت اُس

کی، منزلیں اُس کی، سرفرازیاں اُس کی اور سب احسان اُسی کے—! ہمارے ذمہ ایک ہی کام ہے کہ دینے والے کا شکر ادا کرتے جاؤ، کیا منزل اور کیا نہ منزل۔ اُس کا شکر، اُس کے آگے سرنگوں رہنا۔ وہ عطا فرمادے، اُس کا شکر۔ وہ زندگی واپس طلب فرمادے، تو کیا انکار۔ یہی منزل ہے کہ منزلِ تسلیم، منزلِ رضا، منزلِ تشکّر حاصل ہو—جو ملا، اُس کا شکریہ—جو نہ ملا، وہ ہمارا تھا ہی نہیں۔

ویسے بھی اپنے مقاصد بنانا، اپنے منصوبے بنانا، اپنی منزل کا تعین کرنا، اُس کی تلاش کرنا اپنی جگہ پر درست ہو گا لیکن پہلے یہ تو سوچ لینا چاہیے کہ ہم خود کسی اور کا پروگرام ہیں، کسی اور کا مقصد ہیں۔ کیوں نہ اُسے دریافت کیا جائے، یعنی مقصد کی تلاش کا مقصد ہی ہماری تلاش ہے۔ ہم وہی جاننا چاہتے ہیں، جو وہ چاہے—وہ ہے اور ضرور ہے—بس کہاں ہے؟ جس نے یہ راز دریافت کر لیا، اُس نے یہی کہا: ''اُس کی معرفت یہی ہے کہ اُس کی معرفت نہیں ہو سکتی''۔ اِس کا حاصل یہی ہے کہ اُس کو حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اُس کو دیکھنا ناممکن ہے، سوائے اِس کے کہ اُس کو دیکھنے والے کو دیکھا جائے۔ یہی پہچان ہے—یہی منزل ہے—اور اِسی جانب سفر ہی ہمارا مقصود اور ہماری مراد ہے۔ توفیق وہ عطا فرمائے، عازمِ سفر ہم ہیں۔ اگر یہ منزل نہ ملے تو ہر سفر باطل، ہر منزل بُولہبی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جو ہم سے پہلے بھی موجود تھی اور ہمارے بعد بھی موجود رہے گی۔

جوازِ ہستی

اگر انسان کی کوئی آرزو پوری نہ ہو، بلکہ ہر آرزو ٹوٹ چکی ہو، یہاں تک کہ آرزو پیدا کرنے والا دل بھی ٹوٹ چکا ہو، تو اُس آدمی کے لیے جینے کا کیا جواز ہے؟

اگر اِنسان کی زندگی ایک ایسی تاریک رات کی طرح ہو، جس میں دُور دُور تک کسی روشن ستارے کے دکھائی دینے کا امکان نہ ہو، جس میں چاند نام کی کوئی شے نمودار نہ ہو، حتیٰ کہ کسی جگنو کی روشنی بھی نظر نہ آئے، ایسے آدمی کے لیے جوازِ ہستی کیا ہو سکتا ہے؟

جب انسان کا راستہ چلتے چلتے اچانک بدل جائے اور اُسے اُس وقت معلوم ہو جب وہ آدھے سے زیادہ راستہ طے کر چکا ہو، اور اُسے واپس لوٹنا بھی اُتنا ہی مشکل نظر آئے جتنا آگے جانا— اُس سے نہ بھاگا جائے اور نہ ٹھہرا جائے، تو ایسا آدمی زندہ رہنے کا کیا جواز حاصل کر سکتا ہے؟

جب انسان کے دوست اور اُس کے دشمنوں میں فرق باقی نہ رہے، تو اُسے جینے اور مرنے کے درمیان کیا فرق معلوم ہو گا؟ اپنے اور بیگانے کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے، بلکہ رشتے ناتے باعثِ مسرت ہونے کی بجائے باعثِ اذیّت بنتے جائیں، تو وہ آدمی کس طرح اپنے زندہ رہنے کا جواز تلاش کرے— !!

جب انسان اِس وسیع کائنات میں اس کی وسعتوں اور آزادیوں کے باوجود اپنے آپ کو پابند و تنگ دامن محسوس کرے، اُسے بھری کائنات میں جائے پناہ نظر نہ آئے، اُسے یوں محسوس ہو کہ آسمان سر پر گرا چاہتا ہے یا زمین پاؤں تلے سے نکلا چاہتی ہے، تو وہ اپنے اِحساس کی

کسمپرسی کے عالَم میں اتنا ستم زدہ محسوس کرے گا کہ اُسے نہ جینے کا جواز ملے گا، نہ مرنے کا—!

آدمی جب سفر کرتے کرتے عمر گزار دے، صدیاں گزر جائیں، عرصے بیت جائیں اور اُسے محسوس ہو کہ چلتے چلتے عمر کٹ جانے کے بعد بھی سفر نہیں کٹا—وقت کٹ جائے اور فاصلہ نہ کٹے، تو زندہ رہنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

جب اِنسان کو معلوم ہو جائے کہ علم حاصل کرتے کرتے وہ جہالت تک پہنچ چکا ہے، تو اُسے اپنی محنتوں کو عزت سے دیکھنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے اور وہ زندہ رہنے کے استحقاق کو مذاق سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ علم حاصل نہیں ہو سکتا اور زندگی سے محروم ہونا پڑتا ہے، تو ایسی کوشش کا کیا انجام—؟

انسان حاصل کی تمنّا میں لاحاصل کے پیچھے دوڑتا ہے اُس بچے کی طرح جو تتلیاں پکڑنے کے مشغلے میں گھر سے بہت دُور نکل جاتا ہے—نہ تتلیاں ملتی ہیں، نہ واپسی کا راستہ۔ ایسی آرزو کا کیا انجام اور ایسی زندگی کا کیا جواز؟

جب اِنسان پر ایسا وقت آ جائے کہ اُسے چشمۂ آبِ حیات نظر آئے لیکن اُس کی رسائی نہ ہو، وہ بدستور پیاس میں مبتلا رہے، تو اسے سانس لینے کا کیا حق باقی رہ جاتا ہے؟ وہ جانتا ہے کہ سب کچھ موجود ہے لیکن اس کے لیے ہر اِمکان کے باوجود کچھ بھی نہیں، تو وہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی بے معنی کوشش سے کیوں تکلیف دے گا؟

جب انسان کی زندگی اُس بُڑھیا کی طرح ہو جائے جس نے محنتوں کے ساتھ سُوت کاتا اور آخر میں اُسے اُلجھا دیا، تو وہ آدمی کیا زندہ رہے گا! عمر کی کمائی اُس کے ہاتھ سے یوں نکل جائے جیسے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں، تو وہ کیا کرے؟ کمائیاں ساتھ نہ جائیں اور ساتھ لے جانے کے لیے کمائی کوئی نہ ہو، تو ایسی صورت میں زندہ رہنا بھی کیا زندہ رہنا ہے!

جب انسان کے اعضاء و جوارح اُس سے باغی ہو جائیں—اُس کے اپنے، اپنے نہ رہیں—اُس کے معاون، اُس کے اپنے معاون، اُس کے خلاف گواہ بن جائیں اور وہ دیکھتا رہ جائے—

اُسے محسوس ہو کہ اُس کا اپنا وجود بھی اُس کے اپنے کام کا نہ تھا، تو وہ کیا محسوس کرے گا؟ اُسے اِس چیز کا احساس ہو کہ جو کرنا چاہیے تھا، اُس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ کچھ اُس نے کیا، تو اَب وہ کس اُمّید پر جینے کی تمنا کرے —؟ جو کچھ حاصل کیا گیا، یہی اُس کے اپنے خلاف گواہی ہے۔ اب اپنے حاصل سے نجات پانا بھی ممکن نہیں، بھاگنا بھی ممکن نہیں، ٹھہرنا بھی ممکن نہیں — ایک ایسے انسان کی طرح جس کے وجود کے ساتھ ایک ٹائم بم بندھا ہوا ہے اور وہ خطرے سے ڈر کر بھاگتا جا رہا ہے۔ جس خطرے سے وہ نجات چاہتا ہے، وہ اُس کے ساتھ ہی بندھا ہے۔ خطرہ اندر ہو تو باہر دوڑنا کس کام کا؟ اپنے اندر کے خطرے سے اندر کی دَوڑ بچا سکتی ہے۔ اندر کی دَوڑ کیا ہے؟ اِس بات کی سمجھ نہ آئے تو جینے کا کیا جواز —؟

اگر انسان کے پاس نیکی کے نام پر اکٹھا کیا ہوا بلکہ لوٹا ہوا مال موجود ہو، اور اُس سے نیکی بھی سرزد نہ ہو سکے، اِس مال کو دیکھ کر اُسے جینے سے وحشت پیدا ہو جائے گی۔ اُس آدمی کے لیے آنے والا زمانہ گزرے ہوئے زمانے سے زیادہ خوفناک ہو گا۔ اُس کی رات تاریک سے تاریک تر ہوتی جائے گی — وہ اپنے آپ کو زندہ رہنے کے قابل کیسے سمجھے گا —؟

اگر انسان ایسی حالت میں پہنچ جائے، اگر اُسے تنگیٔ حالات اور تنگیٔ خیالات کا اِحساس ہو، اگر اُسے ہر طرف تاریکیاں نظر آئیں، اگر اُسے زندہ رہنے کا جواز نظر نہ آئے تو بھی اُسے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ہم زندہ رہنے کے لیے جو جواز تلاش کرتے ہیں، اُس کے علاوہ بھی زندگی کے جواز موجود ہیں۔ زندگی عطا فرمانے والے نے یہ انعام بے جواز نہیں عطا فرمایا۔ اُس کا کوئی عمل بے جواز نہیں۔ اُس نے کوئی تخلیق عبث نہیں فرمائی۔ اُس کی کوئی بات بے معنی نہیں ہو سکتی۔ انسان کو مایوسیوں کے گھپ اندھیروں میں بھی ایک روشنی کا چراغ، جو ہمیشہ روشن رہتا ہے، نظر آ سکتا ہے۔ یہ چراغ پیشانی کے اندر ہوتا ہے اور یہ سجدے میں نظر آتا ہے۔ بے بس انسان کا سجدہ ہی بس، بے بسی کا علاج ہے۔ یہی اندھیروں کا سورج ہے۔ یہی نشانِ منزل ہے اور یہی رفیقِ طریق ہے۔

اِرشاد ہے: ''پھر اِس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے کہ وہ پتھر ہوں، بلکہ اِن سے بھی زیادہ سخت۔ بعض پتھر تو ایسے ہیں کہ اُن سے نہریں جاری ہیں''۔ گویا پتھر بھی پتھر نہیں رہتا، اگر اُس میں سے نہر جاری ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر طرف پتھر دل انسان، پتھرائی ہوئی آنکھوں والے، پتھر کے چہروں کے ساتھ نظر آتے ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اِن پتھروں کے اندر سے نہریں جاری ہیں۔ بے فکر انسان بھی بڑے فکروں میں مبتلا ہیں۔ اپنا دل زندہ کرو، ہر طرف زندگی نظر آئے گی۔

زندگی کے جواز تلاش نہیں کیے جاتے، صرف زندہ رہا جاتا ہے۔ زندگی گزارتے چلے جاؤ، جواز مل جائے گا۔ اگر آپ کو کسی طرف سے کوئی محبّت نہیں ملی، تو مایوس نہ ہوں۔ آپ خود ہی کسی سے محبّت کرو۔ کوئی باوفا نہ ملے، تو کسی بے وفا سے ہی سہی۔ محبّت کرنے والا زندگی کو جواز عطا فرماتا ہے۔ زندگی نے آپ کو اپنا جواز نہیں دینا، بلکہ آپ نے زندگی کو زندہ رہنے کے لیے جواز دینا ہے۔ آپ کو کوئی انسان نہ نظر آئے تو کسی پودے سے پیار کرو، اُس کی پرورش کرو، اسے آندھیوں سے بچاؤ، طوفانوں سے بچاؤ، وحوش وطیور سے بچاؤ، تیز دھوپ سے بچاؤ، زیادہ بارشوں سے بچاؤ—اُس کو پالو، پروان چڑھاؤ۔ پھل کھانے والے کوئی اور ہوں، تب بھی فکر کی کوئی بات نہیں۔ کچھ بھی نہیں تو یہی درخت کسی مسافر کو دو گھڑی سایہ ہی عطا کرے گا، کچھ نہیں تو اس کی لکڑی کسی غریب کی سردی گزارنے کے کام آئے گی۔ آپ کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔ آپ کو زندہ رہنے کا جواز اور ثواب مل جائے گا۔ کچھ نہ ہو سکے تو کسی پتھر کو صیقل کرو، پالش کرو، اُس پر محنت کرو—پتھر کا آئینہ بن جائے گا۔ اِس آئینے کے اندر زندگی کا جواز لکھا ہوا ہو گا۔

اگر آپ کی نگاہ بلند ہونے سے قاصر ہے، تو اپنے پاؤں کے پاس دیکھو—کوئی نہ کوئی چیز آپ کی توجہ کی محتاج ہو گی۔ کچھ نہیں تو محبّت کا مارا ہوا کُتّا ہی آپ کے لیے زندہ رہنے کا جواز مہیا کرے گا۔

یہ کائنات آپ کی توجہ کی محتاج ہے۔ کائنات سے توجہ طلب کرنا اتنا اہم نہیں جتنا اِس کو توجہ دینا—اور یہی جینے کا جواز ہے۔ دنیا زندگی کے جواز سے مایوس ہو کر، زندگی کے جواز کی رائیگاں تلاش میں ہے۔ آپ، لوگوں کی اِس تلاش کو اپنی توجہ سے سرفراز کرو۔ دنیا توجہ مانگ رہی ہے۔ آپ کا گردوپیش، آپ کی نگاہِ توجہ کا طلب گار ہے۔

انسان پر کبھی راستہ بند نہیں ہوتا۔ یہ بات یاد رکھی جائے کہ ہر دیوار کے اندر دروازہ ہے جس میں سے مسافر گزرتے رہتے ہیں۔ مایوسیوں کی دیواروں میں اُس کی رحمت اُمّید کے دروازے کھولتی رہتی ہے۔ انتظار ترک نہ کیا جائے، رحمت ہوگی—اُمّید کا چراغ جلے گا۔ وہ وقت جس کا انتظار ہے، آئے گا، بلکہ وہ وقت آ ہی گیا۔ مایوسیوں کے بادل چھٹ جائیں گے، چراغاں ہو گا۔ انسان، انسان کے قریب آ جائے گا۔ پتھر موم ہو جائے گا۔ دل محبّت سے معمور ہو جائیں گے۔ پیشانیاں سجدوں سے سرفراز ہو جائیں گی۔ زندگی کو زندہ رہنے کا استحقاق مل جائے گا۔ انسان مایوس نہ ہو۔ کشتیاں جلا دی جائیں تو کامیابی قریب آ جاتی ہے۔ کامیابی یہی ہے کہ زندگی کو وثوق مل جائے۔ آرزوئیں پوری نہ ہوں تو بے آرزو رہنے کی آرزو پیدا کر دی جائے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ کامیابی کسی نقطے کا نام نہیں، یہ مزاج کا نام ہے۔ بڑے بڑے فاتحین جنگیں ہارنے کے بعد بھی فاتحین ہی رہے۔ ہمارے پاس مثال موجود ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے فتحِ مبین قرار دیا—کربلا کی شکست، فتح کی بشارت ہے۔ ہم جسے تاریکی سمجھ رہے ہیں، یہی صبحِ کاذب تو صبحِ صادق کا آغاز ہے۔ چلتے چلیں، منزلیں خود ہی سلام کریں گی۔ دنیا کے خلاف فریاد نہ کریں، کوشش کریں کہ کوئی آپ کے خلاف فریاد نہ کرے۔ دوسروں کو خوش کریں، خوشی خود ہی مل جائے گی—اور یہی جینے کا جواز ہے۔

سوچتے سوچتے

سوچتا ہوں اور سوچ ہی سوچ میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں — سوچتا ہوں کہ انسان کی سوچ کتنی لامحدود ہے کہ وہ ہر چیز کے بارے میں سوچ سکتا ہے، لیکن یہ سوچ کر شرمندہ ہوتا ہوں کہ انسان خود ہی محدود ہے — اُس کی سوچ بھی اتنی ہی محدود ہے، اور محدود سوچ کا شاید یہی ثبوت ہے کہ انسان اپنی سوچ کو لامحدود سمجھے۔ ہمیں تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم خود کیا ہیں؟ ہماری سوچ کیا ہے؟ یہ خیال کیا ہے؟ خیال کہاں سے آتا ہے؟ کیا خیال موجود اشیاء سے باہر بھی جا سکتا ہے؟ — اور کیا موجود کے علاوہ کوئی لاموجود اور ناموجود دنیا بھی ہے؟ اگر ہے، تو ابھی تک ناموجود کیوں ہے؟ کیا ہر دَور کے لیے ہر بشر کے لیے الگ الگ عالمِ موجودات ہے؟ کیا منظر، دیکھنے والوں کی بساط کا نام ہے؟ کیا علم، اپنی صلاحیت کا نام ہے؟ کیا تصور، اپنی حالت اور اپنے حالات سے آگے نہیں جا سکتا؟ کیا ہم، ہم کے علاوہ بھی ہیں؟ کیا اِس پردے کے پیچھے بھی کچھ ہے؟ کیا پردہ ہے بھی یا یہ محض پردہ ہی پردہ ہے؟ کیا ہم پیدا ہوتے ہیں؟ — کیا ہم واقعی مر جاتے ہیں — ؟ کیا ہم مرنے کے بعد بالکل ختم ہو جاتے ہیں؟ کیا ہم کچھ اور بھی ہیں؟ کیا ہم کسی اور شکل میں زندہ رہیں گے؟ مرنے کے بعد — موت کا منظر ہوتا ہے؟ کیا واقعی ہوتا ہے؟ کیا موت کے بعد ہمارے ساتھ وہی دکھ، وہی احساسات، وہی کیفیات رہتی ہیں؟ کیا مرنے کے بعد بھی غم اور خوشی، ہمارے غم اور خوشیاں ہوتی ہیں؟ کیا تکلیف ہوتی ہے؟ کیا سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے ہمارے ساتھ؟ اگر سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے تو مرتا کون ہے؟

زندہ کون ہے؟ قبر میں کون جاتا ہے؟ قبر کے اندر جلوے ہوتے ہیں؟ کیا اندھیرا ہوتا ہے؟ کیا روشنی ہوتی ہے؟ کیا آنکھیں ہوتی ہیں؟ کیا ہم مرنے کے بعد بھی دیکھ سکتے ہیں؟ کیا مرنے سے ہمارا سفر ختم نہیں ہوتا؟ کیا ہم ایک سفر کے بعد ایک اور سفر پر گامزن ہو جاتے ہیں؟ کیا ہر سفر کا انجام ایک تازہ سفر ہے؟ کیا منزل ایک نئے سفر کا نام ہے؟ کیا ''موت کا منظر'' نامی کتاب لکھنا بہت ضروری تھا؟ یہ مسلمان ہونے کی سزا ہے؟ کیا مُردے جلانے والوں کی بھی قبریں ہوتی ہیں؟ کیا اُن کے لیے قبر کا عذاب نہیں ہے؟ یہ عذابِ قبر، ماننے والوں کے لیے ہے؟ صرف ماننے والے، مرنے کے بعد پھر مرتے رہتے ہیں؟ کیا ہم آخری بار نہیں مرسکتے؟ کیا ہم وہم ہیں؟ کیا ہم طلسمات میں کھو گئے ہیں؟ کیا ہم حاضر دنیا میں موجود رہ کر غائب اَز نگاہ دنیا کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں؟ کیا ہماری سوچ مفلوج کر دی گئی ہے؟ کیا ہمارے مبلغ ہمیں خوفناک انجام اور خطرناک مستقبل کے عذاب سے ڈرانے کے علاوہ کوئی کام نہیں جانتے؟ کیا یہ لوگ صرف خدا کی رحمت سے مایوس کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں؟ کیا یہ لوگ کبھی مریں گے؟—کب—؟ کیا یہ ابھی نہیں مرسکتے؟ کیا اِن کے نصیب میں شفقت نہیں ہے؟ کیا ہر آدمی ہر علم جان سکتا ہے؟ کیا مجبوری بھی کوئی شے ہے؟ کیا سب لوگ رشوت کا مال اکٹھا کرسکتے ہیں؟ کیا سارے لوگ رشوت اور حرام کے مال سے حج کرسکتے ہیں؟ کیا یتیم کے مال سے کیا ہوا حج منظور ہو جاتا ہے؟ کیا اللہ ایک خاص مقام پر موجود ہے؟ اگر ایسا ہے تو ''علاوہ'' کس کا ہے؟ کون ہے جو پردے کے اندر ہے اور کون ہے جو پردے کے باہر ہے؟ کیا ایک ذات سارے کام کرتی ہے؟ کیا پیدا کرنے والا ہی مارنے والا ہے؟ مارنا ہی ہے تو پیدا کیوں کیا؟—اور اگر پیدا ہی کیا تو مارنے کی کیا ضرورت ہے؟

عجب صورتِ حال ہے، عجب شان ہے، عجب رنگ ہیں۔ وہ خود فرماتا ہے—اور اُس کا ہر فرمان ہی بجا—ہر بات ہی سچ—ہر اَدا پر ہی نثار—بندہ سوچتا ہے—اور سوچ سے بچنے کا طریقہ ہی معلوم نہ ہو تو مجبوری ہے۔ ارشاد ہے—میں سب بادشاہوں کا مالک ہوں—ملک کا

مالک — جسے چاہوں تخت عطا کروں، جسے چاہوں بخت رسا کروں اور جسے چاہوں معزول کر دوں، اور جسے چاہوں گداگر کر دوں۔ وہ مالک ہے — جب چاہے روشنی پیدا کر دے، جب چاہے تاریکی پیدا کر دے — رات سے دن اور دن سے رات پیدا کر سکتا ہے — اور کرتا ہے — جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلّت — وہ زمین و آسمان کے خزانوں کا واحد مالک ہے — وہی تو انسان کو مالا مال کرتا ہے — اور جب چاہے خود ہی انسان سے قرضے کا سوال کرتا ہے — یہ کیسے ہے — وہ ایک طرف تو خود ہی کسی کے باپ کو مار کر اُسے یتیم کر دیتا ہے اور خود ہی یتیم کی مدد کا سوال کرتا ہے — یتیم کا بہت ہی خیال کرتا ہے — اور حکم دیتا ہے کہ یتیم کا مال نہ کھاؤ — اپنے پیٹ کو آگ سے نہ بھرو — کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی کو یتیم ہی نہ کرے — کیا وہ ہمارے کہنے پر عمل کر سکتا ہے — وہ تو خود ہی مالک ہے — مرضی کا — اسے اختیار ہے، مکمل — اُس کے قبضۂ قدرت سے کسی شے کے باہر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ صرف ہماری اپنی سوچ ہی کھو جاتی ہے — ہم ہجومِ خیال میں گم ہو جاتے ہیں — ہم اپنے پیمانوں سے اُسی کو ماپتے ہیں جو ہر پیمانے سے باہر، ہر حد سے باہر ہے — ہر سوچ سے پرے — سر حدِ اِدراک سے ماورا ہے۔ اُس کا مقام عالی — اُس کا مقام، مقامات کے تعین سے آزاد ہے۔ وہ خالق ہے — مخلوق کی سوچ میں کیسے آ سکتا ہے! ہم لوگ اُلجھے ہوئے، تفکرات میں گھرے ہوئے، حصارِ وقت میں جکڑے ہوئے، تعیّنات میں پابند، کیا جانیں کہ وہ کیا ہے —!! اُس کی ذات میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں — وہ ایک ہی جلوہ ہے — وہ پیدا کرے یا مار دے، اُس کے لیے یہ ایک ہی بات ہے — وہ بہتر جانتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے — انسان کیوں ہے — کب سے ہے — کب تک ہے — کن مراحل سے گزرنا ہے انسان کو —!! وہ کبھی سر پر تاج رکھ دیتا ہے، کبھی ہاتھ میں کاسۂ گدائی تھما دیتا ہے — اُس کی ادائیں ہیں — اُس کی دلربائی ہے — اُس کی کبریائی بھی دلربائی ہے — وہ بے نیاز ہے — ہر ایک سے بے نیاز، لیکن وہ دُرود بھیجتا ہے اور بھیجتا ہی رہتا ہے اپنے محبوب ﷺ پر —!! وہ اپنے محبوب ﷺ کو عزتیں عطا فرماتا ہے، لیکن غریبی بھی —

غریب الوطنی بھی—! یہ شان ہے اُس کی — یہ ادائیں ہیں اُس کی — وہ چاہتا ہے کہ سب اُس کے محبوب ﷺ کے تابع فرمان ہو جائیں — سب دُرود و سلام بھیجیں اُس ذات ﷺ پر جو اُسے محبوب ہے۔ اُس میں صرف استقامت ہے — کوئی تضاد نہیں — وہ قہّار ہے، جبّار ہے، رحمان ہے، رحیم ہے — اور سب ایک ہی نور کے جلوے ہیں۔ وحدت میں کثرت، اور کثرت میں وحدت کے جلوے ہیں۔ اُس کو سمجھنا آسان ہے — اُسے دماغ سے نہ سمجھا جائے — اُسے ماننا چاہیے۔ وہ شفیق ہے، وہ مہربان ہے، وہ رحمان ہے، وہ رحیم ہے — وہ کہتا ہے کہ اُس کی رحمت اُس کے غضب سے زیادہ وسیع ہے۔

وہ ظلمات سے نور میں داخل کرتا ہے — وہ گناہ معاف کرتا ہے — سارے گناہ — اور وہ یہاں تک مہربان ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کر کے انہیں نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ حساب کرنے والوں کے ساتھ وہ حساب کرتا ہے، رائی رائی کا، پائی پائی کا — زیادہ عقل والوں کو اور نہ ماننے والوں کو اُن کے اعمال کے نتیجے کے حوالے کر دیتا ہے — اور عذاب تو یہ ہے کہ انسان کو اُس کے اعمال کی عبرت کے حوالے کر دیا جائے — اُس نے بتا دیا ہے کہ اپنے اعمال پر توبہ کرو — اُس کا قرب، اُس کے مقرب ﷺ کے قرب میں ہے اور اُس نے فرما دیا ہے — یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ عذاب ڈالے اُن پر جن کے درمیان وہ ذات ﷺ ہو، جس کے لیے ہمیشہ دُرود و سلام ہے۔ انسان سوچ کو سوچنا بند ہی کر دے۔ وہ سوچ سے باہر ہے۔ ہم نے یہ نہیں پوچھنا کہ اُس نے ایسے کیوں کیا بلکہ ہمیں تیاری کرنا ہے کہ ہم سے پوچھا جانے والا ہے کہ ہم نے ایسے کیوں کیا؟ ہمارے لیے یہی راہ، فلاح کی راہ ہے کہ اپنے عمل اور اپنے انجام پر نظر رہے۔ وہ جو عطا کرے، ہم راضی ہیں۔ غم بھی اس کا دیا ہوا، خوشی بھی اُس کی عطا — سوچ اُس نے عطا کی — اور سوچ کی اصلاح کرنے والے بھی اُس نے پیدا فرمائے۔ صحیح سوچ دینے والے سلامت ہی رہیں۔ عمل کی کوتاہیاں، توبہ سے پوری کی جائیں۔ اُس کی ذات سے دُوری، اُس کے سجدے سے کم کی جائے۔ اے خالق! تیرے ہر عمل پر تیرا بندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راضی ہے۔

اپنے قریب رکھ۔ اپنے محبوب ﷺ کا راستہ دکھا۔ یہی کافی ہے۔ باقی رہی تیری ذات اور تیری شان ــــ تُو بلندیوں سے زیادہ بلند ہے ــــ تُو رفعتوں سے زیادہ ارفع ہے ــــ تُو دماغ میں نہیں آ سکتا ــــ ! ہاں ! ــــ دِل میں آ ــــ ! یہ دل تیری آرزو کے علاوہ ہر آرزو سے آزاد ہے ــــ یہی تو عجب بات ہے کہ تیری محبّت ہی تیرے محبوب ﷺ کے دَر تک لاتی ہے۔ ہم بیچارے تیری تحقیق کیا کر سکتے ہیں۔ ہم تجھے تسلیم کرتے ہیں۔ ہمیں اپنا بنا لے ! ــــ رحم فرما ــــ ! ہماری سوچوں کو صحت مند رخ عطا فرما۔

جہاں مَیں ہوں

میں سوچتا ہوں کہ مَیں کہاں ہوں۔ یوں تو مَیں اپنے آپ میں، اپنے گھر میں ہوں، اپنے حالات اور مسائل میں ہوں، اپنے فکر و ذکر میں ہوں، اپنے غم اور اپنی خوشیوں میں ہوں — لیکن مَیں سوچتا ہوں کہ شاید مَیں کہیں بھی نہیں ہوں۔ مَیں اپنے نام کے پردے میں چھپا ہوا ایک راز ہوں، شاید بہت پرانا — غالباً قدیم۔ مَیں مالک کے اِرادے میں تھا، اُس کے حکم کے تابع ہوں اور اُس کے رُوبرو حاضر رہنے کے انتظار میں ہوں۔ مَیں اپنے پروگراموں میں بہت مصروف ہوں، یہاں تک کہ مَیں خود بھی بھول جاتا ہوں کہ مَیں ایک راز ہوں، لیکن یہ راز اتنا سربستہ بھی نہیں۔ مَیں اپنے اظہار میں بھی رہتا ہوں اور یہ راز کہ مَیں راز بھی ہوں اور اظہار میں بھی ہوں، میری سوچ کا باعث ہے۔ راز کس نے بنایا اور اظہار میں کون آیا؟ یہاں سے سوچ کا آغاز ہوتا ہے۔ میرے تخلیق ہونے میں میرا کوئی دخل نہیں، یہ سب اُس کی منشا اور اُس کے اِرادے اور اُس کے حکم سے ہوا۔ اس طرح میرا ہونا، میرا ہونا نہیں، یا یوں کہہ لیں کہ میرا ہونا، میرا نہ ہونا ہے۔ مَیں خود کسی کا پروگرام ہوں۔ میرا اپنا کیا پروگرام ہو سکتا ہے؟ مَیں تو بس چل رہا ہوں، جو ساتھ ہے اُس کی تلاش میں ہوں اور یہ تلاش ایک لامتناہی سفر ہے۔ اگر ہم پیدا ہوتے اور پھر مر جاتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ یہاں تو اِس سفر کے بعد ایک اور سفر، ایک اور انتظار موجود ہے۔ گویا کہ مر جانا، مر جانا نہیں۔ اگر مر جانا، مر جانا نہیں، تو پھر جینا کیا جینا ہے؟

پھر بھی جب تک ہم ہیں، ہم ہیں — اور مَیں یہ بھی سوچتا ہوں کہ مَیں، ''مَیں'' سے ''ہم'' کب ہو جاتا ہوں۔ کیا مَیں ایک فرد ہوں یا مَیں ایک بے انتہا سلسلۂ اَفراد کا مجموعہ ہوں؟ یہ سوال میرے لیے اہم ہے کہ مَیں یہاں ہوتا ہوں اور مجھے میرے وہاں ہونے کی بھی اطلاعات ملتی ہیں۔ مَیں کبھی صرف ذکر ہوں۔ ذکر کا مطلب اظہار، یعنی بیان — اور کبھی مَیں ذاکر ہوں، یعنی بیان کرنے والا — اور کبھی مَیں مذکور ہوں، مَیں بیان ہوتا ہوں۔ گویا ذکر، ذاکر اور مذکور ایک ہی ذات ہے۔ مَیں اُس ذکر کی بات کر رہا ہوں جو ذکرِ اَکبر ہے — میں تو ایک سوچ کی بات کر رہا ہوں کہ جہاں تک میرے تذکرے ہیں، مَیں وہاں تک ہوں اور جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا، وہاں مَیں کیسے ہو سکتا ہوں؟ — اور مَیں جانتا ہوں کہ مَیں اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے غم عارضی ہیں، میری خوشیاں عارضی ہیں، میرا گرد و پیش عارضی ہے۔ میری محبّت اور نفرت عارضی ہے۔ میری صحت اور بیماری عارضی ہے، اور یہ سب کچھ جاننے کے باوجود مَیں اپنے آپ کو عارضی نہیں مان سکتا۔

اتنی بڑی خوبصورت کائنات جس کو دیکھ دیکھ کر قادر کی قدرت کے جلوے میسّر آتے ہیں، مجھے عارضی نہیں ہونے دیتی۔ مَیں اپنی پسند کا منظر ہوں، بلکہ اپنی پسند کے مناظر ہوں۔ مَیں ان نظاروں میں رہتا ہوں اور یہ نظارے ہمیشہ سے ہمیشہ تک ہیں۔ اِن نظاروں کو چاہنے والا، عارضی کیسے ہو سکتا ہے۔ مَیں یوں تو ایک فردِواحد ہوں لیکن مَیں وہ ذرّہ ہوں جو صحرا میں ہے — وہ قطرہ ہوں جو قلزم میں ہے — وہ اِنسان ہوں جو انسانوں میں ہے۔ بظاہر انسان مر جاتا ہے، لیکن انسان کبھی نہیں مرتا۔ انسان زندہ چلا آرہا ہے۔ یہ خالق اور مخلوق کی بات ہے۔ انسانوں میں ہونا، یا فرد ہونا — الگ الگ مقامات ہیں۔

میں اِس راز کو حل کرنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال کیوں میرے خیال نہیں ہیں؟ مَیں حال میں ہوں لیکن میرا علم، میری دینی تعلیم، میری محبتیں ماضی میں ہیں۔ میری عقیدت ماضی سے وابستہ ہے۔ اگر ماضی یک لخت ختم ہو جائے تو میرے پاس میرا دین بھی نہیں رہ جاتا۔

میری تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔ میرے تمام قواء مفلوج ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ گویا ایک وسیع پس منظر کے آگے ایک دیوار سی بن جاتی ہے۔ میں ماضی میں رہتا ہوں — اُن لوگوں کی یاد میں رہتا ہوں جن کو مَیں نے دیکھا نہیں، جو میرے ہم عصر نہیں۔ مجھے اُن سے عقیدت ہے۔ مَیں مزار کو بھی ایک راز سمجھتا ہوں۔ ایک پردہ ہے جس کے پیچھے بہت سی تجلّیات چھپی ہوئی ہیں۔ مَیں اُن کے خیال میں رہتا ہوں، وہ میرے خیال میں رہتے ہیں۔ گویا مَیں وہاں ہوتا ہوں، جہاں مَیں نہیں ہوتا۔ میرے سامنے وہ نظارے ہیں جو میرے سامنے نہیں ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ کیسے ہو گیا کہ میں چلتے چلتے کہیں اور چلا گیا۔ میری رہائش کہیں ہے اور مَیں رہتا کہیں اور ہوں۔ مَیں مزارات کے بارے میں سوچتا ہوں، خانقاہوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔ یااللہ! یہ کون لوگ تھے کہ جن کے ہاں مر جانے کے بعد بھی میلہ لگا رہتا ہے۔ اُنھوں نے موت کو میلہ بنا دیا اور ہم ہیں کہ زندگی پر بھی سکوتِ مرگ مسلّط ہے! مَیں سوچتا ہوں کہ مَیں کس حد تک اِس بات کو سوچتا رہوں گا کہ یہ سب کیا ہے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مَیں بھی بھوک لگنے پر کھالوں اور نیند آنے پر سو جاؤں۔ اپنے آپ میں رہوں، اپنا بھلا سوچوں اور صرف اپنے لیے زندہ رہوں، اور صرف اپنے لیے مر جاؤں، لیکن یہ بات تو ممکن نہیں۔ مَیں اپنے عزیزوں میں تقسیم شدہ ہوں۔ اپنی چاہتوں میں بکھرا ہوا ہوں اور اپنے خیال کی رفعتوں تک وسیع ہوں۔ مَیں ایک سلسلہ ہوں کہ پچھلے سلسلے کی آخری کڑی ہوں اور آنے والی نسلوں کا آغاز بھی ہوں۔ مجھ پر اختتام ہے اور مجھ سے ہی آغاز ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مَیں، ابھی کچھ عرصہ ہوا، شَے مذکور نہیں تھا اور اب مَیں کہیں نہ کہیں ہوں۔ یہ مختصر سی موجودگی نہایت ہی مختصر ہے۔ ایک چنگاری ہے کہ چمکتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ آج بھی بے شمار مقامات پر ہم کسی شمار میں نہیں ہیں۔ نتیجہ پھر وہی نکلتا ہے کہ میرا ہونا، میرا نہ ہونا ہے۔ میں ایک گھونٹ چشمۂ بقا سے پیتا ہوں اور دوسرا گھونٹ بحرِ فنا سے — اور اس طرح مَیں مرتا جیتا رہتا ہوں۔

کبھی مَیں محبّت بن کر کسی کے دل میں دھڑکتا ہوں اور کبھی نفرت بن کر کسی کے

اندر آگ لگا دیتا ہوں۔ میں چلتے چلتے ٹھہر جاتا ہوں اور ٹھہرتے ٹھہرتے چل پڑتا ہوں۔ کبھی راہ سے بے راہ ہو جاتا ہوں اور کبھی گمراہی کی منزلوں میں راستوں کا نشان بنا دیا جاتا ہوں۔ مَیں کبھی نظروں میں سماتا ہوں اور اِن نظروں سے گر جانے کا عمل بھی جانتا ہوں۔

مَیں دیکھتا ہوں، میرے اندر کوئی راہنما جذبہ کارگر ہے، جس کے دَم سے مَیں چل رہا ہوں۔ مَیں اُس کی عطا کے سامنے اپنی خطا کا ذکر نہیں کرتا۔ مَیں تو ہوں ہی خطا اور وہ — سراپا عطا! بہرحال مَیں سوچتا ہوں کہ یہ راز کیا ہے اور پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ یہ راز جو کھٹک رہا ہے اپنے سینے میں اور اپنے اظہار کے لیے بے تاب — یہ راز اصل میں ہے کیا؟ کیا یہ صرف انفرادی راز ہے یا یہ "وہ" راز ہے؟ وہ — جس کا اظہار، انتظار کیا جا رہا ہے۔

یہ عجب بات ہے کہ ایک بے قرار دل غزل کہہ دے اور ہزاروں بے قرار دلوں کو قرار آ جائے۔ مصنّفین اپنی کتابوں کی شکل میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی لائبریری میں محفوظ رہتے ہیں۔ کیا انسان اپنا وجود ہے یا اپنا نام! — بس! اِس نام کے پردے میں ایک راز ہے اور اِسی راز کے بارے میں، مَیں غور کر رہا ہوں۔

ہم اپنی چاہتوں میں زندہ رہتے ہیں۔ محبوب ہماری زندگی ہے۔ محبوب کے ہونے سے ہم زندہ ہیں، محبوب کے مر جانے سے ہم مر جاتے ہیں — لیکن نہیں! — محبوب نہیں مرتا، کیونکہ محبوب کی ذات یاد بن جاتی ہے اور اپنے طالب کے دل میں رہتی ہے، گویا ہم محبوب کے دَم سے زندہ ہیں اور محبوب ہمارے دَم سے — وہ ہمارا مذکور ہے۔ وہ ہمارے اِحساس میں ہے۔ ہماری یاد میں ہے۔ ہمارے پاس ہی ہے۔

پھر مَیں سوچتا ہوں، یہ جو سب بزرگ رخصت ہو چکے ہیں۔ یہ ہماری یاد میں ہیں، ہمارے احساس میں ہیں۔ پھر یہ زندہ ہیں کیونکہ یہ زندگی میں رہتے ہیں۔ زندگی ہم ہیں اور یہ ہم میں ہیں۔ ہم جس کی محبّت میں ہیں، وہ ہم میں موجود ہے۔ یہاں مَیں یہ بھی سوچتا ہوں کہ جن لوگوں میں جتنی بڑی محبّت ہے، وہ اتنے بڑے زندہ ہیں۔

سب سے بڑی محبّت اللہ کے محبوب ﷺ سے ہو سکتی ہے۔ یہ محبّت رکھنے والا فنا و بقا سے اگلی منزل کا مسافر ہے۔ یہ وادیٔ تجلّیات کا رہبر ہے۔

بہر حال ایک عجب راز ہے کہ یہ سب راز ہے — اور مَیں اس راز کے پردے میں! اِس پردے کو اٹھانا بس کی بات نہیں۔ مَیں سوچتا ہوں کہ میری نگاہ جس چیز کو دیکھتی ہے، وہ چیز میرا علم بن جاتی ہے، میری یاد بن جاتی ہے، میری نفرت اور محبّت بن جاتی ہے — گویا مَیں دُور تک پھیلا ہوا سلسلہ ہوں۔ مَیں حاصل اور محرومیوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہوں کہ اِس راز کی چابی کیا ہے؟ یہ کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی پہلی دفعہ ملتا ہے اور ہم سوچنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اِسے پہلی بار سے پہلے بھی مل چکے ہیں اور یہ بھی عجب بات ہے کہ کچھ لوگ ہمارے قریب رہتے ہیں، ہمیں نظر آتے ہیں لیکن ہمیں محسوس نہیں ہوتے۔

میرے لیے بے شمار لوگوں کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے۔ کبھی کبھی مَیں اخبار کے اخبار پڑھ جاتا ہوں اور اِن میں کبھی کوئی خبر نظر نہیں آتی۔ مَیں جس کو سننا چاہتا ہوں وہ بولتا ہی نہیں، جسے دیکھنا چاہتا ہوں وہ نظر ہی نہیں آتا، جس کا ثبوت نہیں اُس کو مانتا ہوں، جس کو دیکھا ہی نہیں اُس کی محبّت میں سرشار ہوں۔ مَیں کہاں کہاں سے آیا ہوں؟ مَیں کن اَجزاء سے مرتّب ہوا ہوں؟ کسی اور کا عمل میرا علم بن جاتا ہے اور کسی اور کا علم میرا عمل بن جاتا ہے۔ کسی اور کی صورت میری محبّت بن جاتی ہے اور کسی اور کا چہرہ میرے لیے نفرت۔ اکثر اوقات میری کسی خطا کے بغیر میری سزا بن جاتی ہے، اور اکثر و بیشتر میری خطا مجھے دَرِ عطا پر جھکا دیتی ہے۔

یہ عجب راز ہے، کہ یہ راز ایسا ہے کہ اس کو جتنا بیان کرو، اتنا ہی بیان نہیں ہوتا۔ یہ وہ راز ہے جو تلاش کرنے والوں کو حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ یہ خود ہی تلاش ہے۔ جس کو ملتا ہے اس کو بتائے بغیر ملتا ہے کہ یہ راز ہے۔ یہ راز کئی شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ ایک سائل آتا ہے، دروازے پر دستک دیتا ہے۔ خیرات کا سوال کرتا ہے۔ انکار پر وہ کہتا ہے: ”مجھے غور سے دیکھو، میں تمہارا راز ہوں۔ میں بخیل کو سخی بنانے والا نسخہ ہوں۔ عبادت اُس منزل پر نہیں

پہنچاتی جہاں میرے دل سے نکلی ہوئی دُعا—بیٹا دُعائیں لو!—یہ نیکی ہے"۔

اِنسان خالق کا مظہر ہے۔ اِس کی قدر کرو۔ یہ تم ہی ہو۔ تمہارا بھائی، تم ہی ہو—جس طرح تمہارا ہاتھ تم ہی ہو۔ تمہاری آنکھ تمہاری ہے، لیکن نہیں—یہ جلووں کی ہے—انہوں نے تیرے پاس آنے کا یہ راستہ بنا رکھا ہے۔ اصل میں جلووں کا آنا مقصد ہے۔ تم جلووں کے لیے ہو—گویا تم جلووں میں ہو۔ جب تم ہی جلووں میں ہو تو پھر تم خود ایک جلوہ ہو۔ تمام نظاروں کی کنجی تیری آنکھ میں ہے۔ تیری آنکھ نظاروں کا ایک حصہ ہے۔ یہ نہ ہو تو نظاروں کا حُسن ختم ہو جاتا ہے—گویا نظاروں کی جان تیری آنکھ ہے۔ کبھی اپنی آنکھ کا نظارہ دیکھنے کی کوشش کرو—نہیں!—یہ راز، راز ہی رہے گا کہ آنکھ کی نظر کیا ہوتی ہے اور منظر کی آنکھ کیا؟ یہ ساتھ رہتے ہیں اور پہچان نہیں ہوتی۔

انسان خود ہی کسی کا راز ہے۔ وہ خود کیا راز دریافت کرتا ہے؟—لیکن ابھی وہ راز، اظہار کے انتظار میں ہے۔ اسے معلوم کرنے کی کوششیں صدیوں سے ہو رہی ہیں۔ اقبالؒ کو قدسیوں نے بشارت دی: "وہ راز اب آشکار ہو گا!" اِس راز کا راز یہ ہے کہ جو شخص اِس راز کو دریافت کرنے نکلتا ہے، وہ خود ہی راز کا حصہ بن جاتا ہے۔ نگاہِ یار انسان کو آشنائے راز کرتی ہے لیکن راز آشنا، راز بیان کرنے کی بجائے جلوۂ نگاہِ یار میں کھو جاتا ہے۔ اُس کے زمین و آسمان بدل جاتے ہیں۔ وہ اِس دنیا میں رہتے ہوئے کسی اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ باتیں کرتا ہے۔ سننے والے کہتے ہیں، یہ سب بہکی بہکی باتیں ہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے اور سننے والے جانتے نہیں—اور جاننے والے سنتے نہیں—اور اس طرح یہ راز گونگے کا خواب بن کر رہ گیا ہے جس کو دیکھنے والا گونگا تھا، سننے والے کیا سنتے؟ بہر نوع—اِس راز کے اندر بہت سارے سربستہ راز ہیں۔

ہو سکتا ہے، اِس راز کے اندر وقت کے فاصلے سمیٹنے والا راز بھی ہو، کہ آج کی دنیا میں رہنے والا، ہو سکتا ہے کل کی دنیا میں بھی موجود ہو۔ کل تو گزر گیا اور کل میں موجود ہونا کیا بات ہوئی؟ جس طرح آج کا طالب بیان کرے کہ وہ کسی اور محفل میں ہے—وہ محفل جس کو نظر

سے او جھل ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے آج کا طالب کل کے محبوب کے دَر پر زندہ ہو۔ اِس راز میں ہو سکتا ہے کہ ہر اِسم اپنے جسم کے ساتھ نظر آ سکے — اور جو لوگ راز آشنا ہوں، وہ روزِ اَزل اور روزِ اَبد کو ایک ہی لمحہ سمجھیں — ایک ہی لمحہ — جو پھیلے تو صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ اِس لمحے کی دریافت ہی راز کی دریافت ہے۔ اِس راز کا اظہار ابھی سربستہ راز ہے۔ یہ وہ واقعہ ہے، جو ہے — لیکن ابھی رونما نہیں ہوا۔ یہ وہ روشن سورج ہے جو طلوع ہونے والا ہے، اور یہ سورج ہمیشہ طلوع ہی ہونے والا ہوتا ہے، اور — کبھی طلوع نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے راز دریافت کیا، انہوں نے ہی راز چھپایا۔

یہ راز ایک رازِ قدیم ہوتے ہوئے ایک جدید اظہار سے گریزاں ہے۔ یہ ایک پُراَسرار گہرائی ہے، جو اِس میں اترتا ہے، وہ اترتا ہی چلا جاتا ہے۔ جو لوگ راز دریافت کرنے گئے، وہ اپنے سفر سے واپس نہیں آئے — لیکن یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ جب اُس نے انسان کو بیان کا علم دے دیا تو اَب کسی بات کو مخفی رکھنے کا کیا جواز؟ راز کو کھول دیا جائے تو بہتر ہے — لیکن راز کو راز ہی رہنے دیا جائے تو شاید اِس کا اظہار آسان ہو جائے۔ خاموشی بہت بڑا راز ہے۔ اِس راز کو سنا جا سکتا ہے۔ زبان وہ بات کہہ ہی نہیں سکتی جو سکوت سے بیان ہوتی ہے۔

جہاں مَیں ہوں، وہاں یہی کچھ ہے۔ یہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ جہاں ہونا، نہ ہونا ہوتا رہتا ہے۔ جہاں منظر بدلتے رہتے ہیں۔ یہی زندگی ہے، اور یہ زندگی موت سے دامن بچا کر نکل جاتی ہے۔ پھر بھی اِس راز کو مخفی ہی رہنا چاہیے۔ یہ راز کُھل گیا تو کوئی نیا ہی گُل کِھل جائے گا۔ انتظار میں زندہ رہنا زندگی ہے۔ مَیں زندگی میں ہوں اس لیے جہاں مَیں ہوں، وہاں زندگی ہے، حیات ہے اور راز کے اظہار کا انتظار ہے۔

ہم کیا کرتے ہیں؟

ہم عجب لوگ ہیں۔ مواقع ضائع کر دیتے ہیں۔ پھر اُن کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ جانے کے بعد کون واپس آتا ہے؟ موقع تو کبھی واپس نہیں آیا۔ جو گیا، وہ واپس نہیں آیا اور جو واپس آیا— وہ، وہ نہیں تھا جو گیا تھا۔ وہ کچھ اور ہی تھا۔ دھاگہ ٹوٹ جائے تو اسے جوڑا جا سکتا ہے، لیکن گرہ ضرور لگ جاتی ہے۔

ہم ہمیشہ حسرت میں رہتے ہیں کیونکہ وقت سے پیچھے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ہم خوابوں میں رہتے ہیں کیونکہ وقت سے آگے نکل جاتے ہیں۔ ہم وقت کے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ ہم کیا کرتے ہیں؟

ہمیں یاد ہے کہ ہم سے کیا چھن گیا ہے۔ ہمارے پاس ایک نعمت تھی جو مانگے بغیر ملی تھی— بہشت! ہم نے قدر نہ کی اُس نعمت کی، اور نتیجہ یہ کہ آج سب سے بڑی آرزو یہی ہے۔ وہ جو کبھی حاصل تھا، دوبارہ حاصل ہو جائے۔ ہم مانگتے ہیں وہ، جو ہمیں دیا جا چکا تھا۔ ہم کیا کرتے ہیں؟

بہشت شاید ایسی نعمت ہی کا نام ہے جس کو کھو دینے کے بعد اُس کی تلاش شروع ہو جائے۔ ہم اپنی اپنی بہشت سے محروم ہو کر اپنی اپنی بہشت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کیا ہم کھوئی ہوئی نعمت کے متلاشی ہیں—؟ کیا ہم چھوڑی ہوئی منزل کے مسافر ہیں—؟ کیا ہم بھولے ہوئے زمانے کی یادوں میں گم ہیں—؟ کیا ہم اپنے ادھورے خوابوں کے پورا ہونے کے منتظر

ہیں—؟ کیا ہم چِھنی ہوئی متاعِ بے بہا کے غم میں مبتلا ہیں—؟ ہمیں کچھ بھی مل جائے، ہم گلہ ضرور کرتے ہیں۔ ہم کیا کرتے ہیں—؟

شاید ہم اپنی اَنا کے بے جان گھوڑے پر سوار ہیں۔ ہم فاصلے طے کرتے رہتے ہیں لیکن سفر نہیں کٹتا۔ ہم زندگی کے طویل سفر کی صعوبتیں اُٹھاتے رہتے ہیں اور انجام کار ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کُل سفر گھر سے قبرستان تک ہی کیا ہے۔ ہم مر مر کے مرتے ہیں۔ ہم آسانی سے کیوں نہیں مرتے؟ کیا حقیقت تسلیم کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے؟ کیا یہ ہماری اَنا کی توہین ہے؟ غم کی آندھیاں درخت کو گرا دیتی ہیں، لیکن درخت کا سایہ اَنا پر اَڑا رہتا ہے۔ وہ گرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ اسے لاکھ سمجھاؤ کہ بھائی وہ درخت تو گر گیا جس کا تُو سایہ ہے۔ وہ سُنی اَن سُنی کر دیتا ہے۔ وہ شرمندہ ہونے پر بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ سلطنت چلی جائے، بُوئے سلطانی نہیں جاتی۔

ہم اپنی بات، خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو، نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم دوست کو چھوڑ دیتے ہیں، بحث کو نہیں چھوڑتے۔ ہم مباحثہ جیتنے کی تمنّا میں اپنے ساتھی ہار بیٹھتے ہیں۔ قافلہ ختم ہو جائے تو بھی ہماری سرداری ختم نہیں ہوتی۔ ہم کچھ بھی تو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم دوسروں کی حقیقت تو کسی قیمت پر تسلیم کرنے کو قطعاً تیار نہیں ہوتے۔

ہمارا باپ خواہ دَس مرتبہ مَر جائے، ہم خود کو یتیم ماننے سے انکاری ہوتے ہیں۔ ہم مرغے کی طرح اکڑتے رہتے ہیں۔ ذبح ہونے سے پہلے بھی بانگ ضرور دیتے ہیں۔ ہم اپنے ہونے کا اعلان کرتے کرتے انہونی کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ ہم ایک نامعلوم خوف میں مبتلا ہیں، لیکن ہم دوسروں کو خوفزدہ کرنے کے عمل سے باز نہیں آتے۔ جب ہم ڈرا رہے ہوتے ہیں، ہم درحقیقت ڈر رہے ہوتے ہیں۔ ہم طاقت کے ذریعے سے لوگوں کو اپنا بناتے ہیں اور لوگ کبھی بھی ہمارے نہیں ہوتے۔ ہم صرف مفادات سے محبّت کرتے ہیں۔ انسانوں سے محبّت کرنا ہمیں نہیں آتا۔ ہم نے انسانوں سے محبّت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم صرف ایک انسان

سے محبّت کرتے ہیں — اپنا آپ! ہم خود سے محبّت کرتے ہیں۔ اپنی پرستش کرتے ہیں۔ ہم صرف اپنی شکل پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ اپنے قصیدے سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لوگ سچ کہہ رہے ہیں۔ ہم خوش فہمی کی غلط فہمیوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہم خود کو بس مامور من اللہ ہی سمجھتے ہیں اور لوگوں کو اپنی رعایا ہونے کے علاوہ کوئی مقام دینے کو تیار نہیں۔ ہم خود کو تاحیات شہنشاہ بنے رہنے کا حق دے چکے ہیں۔ ہم خود کو سیّد، مغل، غزنوی، سُوری، غوری بلکہ مرہٹہ اور راجپوت نسل سے متعلق کرتے ہیں اور فخر کرتے ہیں کہ "پدرم سلطان بود —"

ہم صرف اِنسان ہونے کو قابلِ عزت نہیں سمجھتے۔ اعلیٰ کردار اور اعلیٰ اِحساس کی عدم موجودگی میں بھی اعلیٰ نسل سے وابستگی ہمارے لیے قابلِ عزت ہے۔ ہمیں قبیلے اور برادریوں پر ناز ہے۔ صرف شرفِ انسانیت ہمارے لیے بے معنی ہے۔ ہم دولت کو ضرور وقعت دیتے ہیں، بشرطیکہ ہمارے پاس ہو۔ اگر یہی دولت دوسروں کے پاس ہو تو ہم کہتے ہیں، یہ سب غریبوں کا حصہ ہے، مزدوروں کا حق ہے، یہ سب ناجائز کمائی ہے، یہ سب حرام کا مال ہے — رشوت خور، ذلیل کمینے لوگ! — عزت والے لوگ تو صرف ہم ہیں۔ کیا ہم صرف تجزیے کرتے رہتے ہیں؟ ہم کیا کرتے ہیں؟

ہم صبح ہوتے ہی گلہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ غیبت ہمارا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ہم کچھ نہ کچھ، کسی نہ کسی کے خلاف ہی بولیں گے۔ غیبت کے بارے میں اللہ کریم کا ارشاد کہ غیبت کرنے والا ایسے ہے جیسے کوئی اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے، ہم نے سُن رکھا ہے لیکن کیا کیا جائے، غیبت ہماری عادت ہے۔ گلِے، شکوے، الزام تراشی، عیب جوئی وغیرہ کا فن اور علم ہم نے اخبارات سے حاصل کیا ہے۔ میدانِ سیاست کی عنایت ہے، یہ علم!!

ہم موسم کا گلہ کرتے ہیں۔ ہم خدا کا گلہ کرتے ہیں۔ ہم وقت کی حکومت کا گلہ کرتے ہیں۔ ہم اپنے اکابرین کا گلہ کرتے ہیں۔ ہم افسروں کا گلہ کرتے ہیں۔ افسر ماتحتوں کا گلہ کرتے ہیں۔ بچے ماں باپ کا گلہ کرتے ہیں۔ والدین اپنی اولاد کا گلہ کرتے ہیں۔ کون کس کا

گلہ نہیں کرتا! اگر غیبت اور گلہ چھوڑ دیں تو شاید ہم تعمیری دَور میں داخل ہو جائیں۔ غیبت کے بارے میں ایک دفعہ کسی نے حضورِ اکرم ﷺ سے سوال کیا: ”یا رسولؐ اللہ !غیبت کیا ہے ؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کسی انسان کی عدم موجودگی میں اُس کے بارے میں وہ بات کرنا جو اُس کے منہ پر نہیں کی جا سکتی“۔ سائل نے عرض کیا کہ اگر اس کے منہ پر کہہ دیا جائے تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو یہ بے حیائی ہو گی“۔

بہرحال ہم لوگ شکوے اور شکایتیں سننے اور سنانے کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ہم صرف باتیں کرتے ہیں، کام نہیں کرتے۔ ہم کیا کرتے ہیں؟

ہم زندگی بھر زندہ رہنے کے فارمولے سیکھتے رہتے ہیں اور جب زندگی اندر سے ختم ہو جاتی ہے، ہم بے بس ہو جاتے ہیں، کیونکہ ہم نے موت کا فارمولا تو سیکھا ہی نہیں ہوتا۔ پس بغیر فارمولے کے مر جاتے ہیں۔ اسلام نے بامقصد زندگی کے ساتھ ساتھ بامقصد موت کا فارمولا بتایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مُردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں۔ صرف دیکھنے والوں کو شعور نہیں۔ ایسی موت کہ زندگی اور موت پیدا کرنے والے کا حکم ہے کہ یہ زندہ ہیں۔ موت کا یہ فارمولا ہم بھول گئے۔ ہم مرتے نہیں ہیں۔ ہم صرف مارے جاتے ہیں۔ سسکتی اور کراہتی ہوئی موت — عذاب ہے۔ ہم نے تڑپنے پھڑکنے کی توفیق مانگنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم میں دلِ مرتضیٰؓ نہیں، سوزِ صدیقؓ نہیں۔ زندگی صرف زندہ رہنے کی تمنا میں گزرے گی تو موت ایک مصیبت بن کے آئے گی، اور اگر زندگی مقصد کے لیے گزری تو موت قبولیت کی سند بن کے آئے گی — حیاتِ جاوداں لائے گی۔ ہم غور ہی نہیں کرتے۔ ہم کیا کرتے ہیں؟

ہم ہر وقت بھاگے چلے جاتے ہیں۔ افراتفری کا عالَم ہے۔ دفتر کو جانا، دفتر سے جانا۔ پچاس سال کی نوکری میں تیس سال تو مدتِ ملازمت ہے اور باقی کے سال ہم نے طاقت کے بَل پر حاصل کر رکھے ہوتے ہیں۔ ہم توسیعِ مدّتِ ملازمت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ہاں! تو پچاس سال کی نوکری میں ہم اتنا سفر کر جاتے ہیں کہ لوگ ابنِ بطوطہ اور مارکو پولو کے نام بھی

بھول جائیں — لیکن ایک کولھو کے بیل اور کنویں کے مینڈک کی طرح ہم وہیں رہتے ہیں۔ ہم چلتے رہتے ہیں لیکن فاصلے طے نہیں ہوتے۔ ہم راستے میں حائل ہونے والی ایک دیوار کو گراتے ہیں، اگلے دن ایک نئی دیوار راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ بس چل سو چل، کھیل جاری رہتا ہے۔ نہ ہم اپنے آشیانے چھوڑتے ہیں، نہ ہم کو ذوقِ پرواز عطا ہوتا ہے۔ ہم غلامی سے، پروگرام کی غلامی سے، اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ ہمیں آزادی سے ڈر لگتا ہے۔ عمر تاریکیوں میں کاٹنے کے بعد ہمیں حقیقت کے اُجالوں سے بھی ڈر لگتا ہے۔

ہم بہر حال بھاگتے رہتے ہیں۔ ہم بہت مصروف رہتے ہیں۔ غالباً ہم کسی چمکدار شے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ یہ روشن شے، لوبھ کی پَری ہے۔ ہم اس کے پیچھے دوڑتے ہیں اور پَری کا محافظ، خوف کا دیو ہمارے پیچھے ہوتا ہے — نہ ہم اُس کو چھوڑتے ہیں اور نہ وہ ہمیں چھوڑتا ہے۔ ہمیں کون بتائے کہ لالچی ہمیشہ ڈرتا رہتا ہے۔ جس نے لالچ چھوڑ دیا — وہ بس "لاخوف" اور "لا یحزنون" کی منزل میں داخل کر دیا گیا۔ ہم خود پر رحم نہیں کرسکتے — ہم کیا کرتے ہیں؟

کثرتِ مقاصد نے ہمارے لیے قلّتِ سکون پیدا کر دی ہے۔ ہم بہت سی زندگیاں گزارتے ہیں، اِس لیے ہمیں بہت سی اموات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر وحدتِ مقصد مل جائے تو کثرتِ اَموات سے بچا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں نے زندگی سے کچھ حاصل کیا یا زندگی کو کچھ عطا کیا، وہ لوگ وحدتِ مقصد والے لوگ تھے — نہ وہ خوفزدہ کیے جاسکتے تھے، نہ خریدے جاسکتے تھے — اور نتیجہ یہ کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں — بلکہ وہی تو زندہ ہیں۔ لوگ زندگی میں مر جاتے ہیں اور وہ لوگ موت میں بھی زندہ ہیں۔ کیا ہم غور نہیں کرسکتے — ہم کیا کرتے ہیں؟

بے ترتیب

زندگی، ترتیب بلکہ حُسنِ ترتیب کا نام ہے — لیکن کبھی کبھی یہ ترتیب اپنے آپ سے باہر ہو جاتی ہے، جس طرح کناروں کے اندر بہنے والا خاموش دریا کبھی نہ کبھی اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے اور پھر تمام زندگی کو بے ترتیب کر دیتا ہے۔

بے ترتیب ہونا عناصر کے پریشان ہونے کا ایک مظاہرہ ہوتا ہے، ایک وارننگ ہوتی ہے کہ محفلِ اَحباب ہمیشہ ترتیب میں قائم نہیں رہتی ہے۔ حلقۂ دشمناں بھی ترتیب سے باہر ہو جاتا ہے۔ انسان بیٹھے بیٹھے اپنی نگاہوں میں بدل سا جاتا ہے۔ کبھی جن باتوں پر افسوس ہوتا تھا، اب اُن پر افسوس نہیں ہوتا، انسان جان چکا ہوتا ہے کہ حُسنِ ترتیب عارضی ہے۔ بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں، تسبیح کے دانے بکھر جاتے ہیں اور انسان سوچتا رہ جاتا ہے کہ ضبط، بے ضبط ہو گیا — احتیاط، بے احتیاط ہو گئی — شیرازۂ حالات اور شیرازۂ خیالات منتشر ہو گیا۔

انسان چُنتا ہے، گرے ہوئے موتی، اور خیال کی تسبیح مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے — لیکن اب کہاں! بے ترتیبی انسان کو گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ روتے روتے ہنس پڑتا ہے اور ہنستے ہنستے رو پڑتا ہے۔ وہ مانوس اور مرغوب مقامات، افراد اور کیفیات سے گریزاں ہو جاتا ہے۔

جب خیال کی بندش ٹوٹ جائے تو عمل کی ترتیب بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ کبھی با قاعدگی کو کامیابی سمجھا جاتا ہے اور کبھی بے قاعدگی کو پسند کیا جانے لگتا ہے۔

جب خیال بے ترتیب اور منتشر ہو جائے تو اظہار، بیان اور تحریر میں ربط ختم ہو جاتا

ہے۔ کسی بات کا کوئی سِرا، کسی سِرے سے نہیں ملتا۔ بند شیں اور کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور جن اینٹوں سے خوبصورت مکان بنائے گئے، وہ پھر ربط سے بے ربط ہو کر ملبے کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ واضح، غیر واضح ہو جاتا ہے۔ اِسی کیفیت میں، مَیں نے چاہا کہ مضمون لکھا جائے، لیکن پھر مَیں نے ہی چاہا کہ مضمون نہ لکھا جائے۔ بس، بے ترتیب باتیں کی جائیں۔

غور کر رہا تھا کہ ہماری عبادتیں، ہماری ریاضتیں اور ہماری دُعائیں اتنی بااثر نہیں ہوتیں جتنی ہم سے پہلے لوگوں کی ہوتی تھیں۔ گزشتہ زمانوں کے لوگوں کے حالات اتنے خوشگوار نہیں تھے جتنے آج کل ہیں۔ آج کا ایک معمولی سا کارخانہ دار، ایک چھوٹا سا سرمایہ دار بھی اپنے پاس اتنی دولت رکھتا ہے کہ شاید کسی مغل بادشاہ کے تصور میں بھی نہ ہو۔ اُن لوگوں کی زندگی خوشگوار تھی لیکن اُن کے پاس ایئر کنڈیشنرز نہیں تھے، ٹیلی فون نہیں تھے، اُن کے پاس سفر کے لیے گاڑیاں، جہاز اور ہیلی کاپٹر نہیں تھے۔ اُن کی سڑکیں بس نام کی سڑکیں تھیں۔ وہ سفر کیا کرتے تھے، گھوڑا گاڑی میں اور ہاتھی کی پشت پر۔ وہ لوگ گھوڑے دوڑاتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ آج ایک عام آدمی اتنی آسائش میں رہتا ہے، اِتنے آرام میں رہتا ہے، اس کو ہر طرح کی سہولتیں میسّر ہیں لیکن دل بجھا ہوا ہے — شاید زندگی کی بے ترتیبی میں گھِر چکا ہے۔ کثرتِ مقاصد نے آج کے انسان کو جکڑ کے رکھ دیا ہے۔

ہر چیز نقلی اور سطحی ہوتی جا رہی ہے۔ کسی زمانے میں کہیں سے درد کی فریاد اُٹھتی تو سارے زمانے میں اِحساس کی لہر دوڑ جاتی۔ آج لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے، پانی کی نذر ہو گئے، لیکن عیاشیوں کی رفتار میں فرق نہ آیا۔ شاید ہم ترتیب کی سب حدیں روندنا چاہ رہے ہیں۔ کل تک بیٹیوں کی رخصتی ایک دَرد کا سماں تھا۔ ماں، بیٹی جب ملتیں تو کہتے ہیں کہ آسمان کے کنگرے ہل جاتے، لیکن آج کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دُلھن رخصتی کے وقت رو نہیں سکتی۔ اُسے پتہ ہے کہ رونے سے اُس کا سینکڑوں روپے کا میک اپ خراب ہو جائے گا۔ ایک نقلی چہرہ اصلی غم پر چڑھا دیا جاتا ہے اور کیفیت کی ترتیب بے ترتیب کر کے رکھ دی جاتی ہے — موجودہ دَور شاید کیفیات شکن ہے۔ خلوص، وفا اور استقامت، یارانے، دشمنیاں سب بے ترتیب ہو گئی ہیں۔ مسجدیں بڑھتی جا رہی ہیں اور نمازی گھٹتے جا رہے ہیں۔ مسجدوں کے گنبد اور مینار بھی اپنے

قدیم اور پُر خلوص انداز سے ہٹتے جا رہے ہیں۔

لاؤڈ سپیکروں کا شور ہے۔ تبلیغ کا زور ہے۔ مسلمان، مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ جس کی طبیعت چاہے، اُٹھ کر کھڑا ہو جائے اور رٹی رٹائی ایک تقریر دے مارے۔ بے بسی ہے۔ وقتِ قیام بھی سجدے میں گزارا جاتا ہے۔ زندگی کسی رُخ پر جا رہی ہے اور تبلیغ کسی اور رُخ پر۔ ہم لوگ بیان کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کی زندگی سادہ تھی۔ آپ ﷺ نے کھجور کی چٹائی کا بستر بنایا ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے لباسِ مبارک میں پیوند تھے۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ معزز انسان بنائے گئے اور آپ ﷺ کے ماننے والے، آپ ﷺ کی راہ پر چلنے کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں، جبکہ ہماری زندگی اُس زندگی سے یکسر مختلف ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ نے شادی کی تقریبات کو سادہ ترین رکھنے کا حکم فرمایا۔ آج حضور ﷺ کے ماننے والے بچوں کی شادیاں کرتے ہیں، لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ لڑکی والے بارات کے استقبال اور طعام پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ یہی نہیں، بارات سے پہلے رسمِ حنابندی ادا کی جاتی ہے۔ راتوں کو ایک گھر سے دوسرے گھر جانے والے مہندی کی رسم اَدا کرنے کے لیے سرِعام گانا بجانا کرتے ہیں۔ ویڈیو فلمیں بنائی جاتی ہیں اور اپنے مسلمان ہونے کا سرِعام مذاق اڑایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں شادیوں کی دعوت ہوتی ہے اور بارات میں کسی بڑے سیاسی جلسے کا رنگ نظر آتا ہے۔ کیا بنے گا؟ اَمیر پیسے کی نمائش کر کے غریب کو مزید غریب کر دیتا ہے اور غریب کی بیٹیاں ہمیشہ بیٹیاں ہی بنی رہتی ہیں۔ اُنہیں دلھن بننے کا موقع اِس لیے نہیں ملتا کہ اُن کے پاس وسائل نہیں۔

یہ عجب باتیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شعبہ اپنی اصل سے باہر ہو گیا۔ ہر ترتیب ٹوٹ گئی۔ کسی زمانے میں اُستاد کردار ساز ہوتے تھے۔ بچوں میں عظمتِ کردار پیدا کرتے تھے۔ روحانیت کا درس دیتے تھے۔ زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کرتے تھے، اور آج کچھ اور ہی ماحول پیدا ہو گیا۔ درس گاہیں کچھ اور قسم کے انسان پیدا کر رہی ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہر طرف اسلام پھیل جائے، لیکن ہم نے خود جو اسلامی معاشرہ بنایا ہے، اُس کی حالت بے ترتیب سی ہے۔ ہم بچوں کو انگریزی سکولوں میں داخل کرواتے ہیں اور

چاہتے ہیں کہ اسلامی روحانی معاشرہ پیدا ہو۔ ہم کیا بو رہے ہیں اور کیا کاٹنا چاہتے ہیں؟

ہم عجب قوم ہیں۔ عبادت عربی میں کرتے ہیں۔ دفتروں میں انگریزی لکھتے ہیں، انگریزی بولتے ہیں۔ ہم عام طور پر گفتگو اُردو میں کرتے ہیں، گھروں میں اور بے تکلف ماحول میں مادری زبان استعمال کرتے ہیں۔ ہم اقبالؒ کے کلام کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُس کی زندگی پر اعتراض کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ قائد اعظمؒ کو بابائے قوم مانا جاتا ہے اور اُن کے دیے ہوئے پاکستان کی وہ عزت نہیں کرتے جو اِس کا حق ہے۔

ہم رحم دِلی کا سبق دیتے رہتے ہیں، اُس کے فوائد اور محاسن بیان کرتے ہیں — لیکن کسی پر رحم نہیں کرتے۔ لوگ اتنے امیر ہیں کہ بس بے حساب۔ اَمیروں کا مال بڑھتا جا رہا ہے اور غریبوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ کیا ترتیب بنے گی؟ کیا رحم دلی ہو گی؟ کیا بھائی چارہ ہو گا؟ کنارے پر آ جائیں تو امدادی کیمپ آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے — لیکن ڈوبنے والے کے پاس تو کوئی امدادی نہ پہنچا۔ یہ وسائل کی بات نہیں ہے، یہ احساس اور جذبات کی بات ہے۔

ٹیلی ویژن پر کُشتیاں دیکھنے والے کیا سیکھیں گے؟ ظلم دیکھنا اور ظلم کرنا پسندیدہ مشغلہ ہوتا جا رہا ہے۔ اِسی طرح شرم و حیا کے پردے چاک کیے جا رہے ہیں۔ ہماری روزمرّہ کی گفتگو میں نئے نئے لفظ شامل کیے جا رہے ہیں۔ گینگ ریپ ایک عام روزمرہ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

ہمارے اخبار ملک میں ہونے والے گناہ اور جرائم کو نمایاں سرخیاں دے کر عوام کو کیا تعلیم دے رہے ہیں۔ سنسنی خیزیت کا پیدا کرنا ایک کاروباری ضرورت ہو گیا ہے۔ فلمیں، ویڈیو فلمیں دن رات قوم کے کردار میں زہر گھول رہی ہیں۔ ہمارے بچے دیکھتے دیکھتے کچھ اور سے ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں کل کو ساری ترتیب کو مکمل طور پر بے ترتیب کر دیا جائے۔ اُس وقت سے ڈرنا چاہیے جب ساری ترتیب ختم ہو جائے۔ شاید وہی وقت قیامت کا ہو۔ باپ بیٹا اور ماں بیٹی کے درمیان حجابات اُٹھ چکے ہیں۔ کیسا اَدب اور کیا لحاظ!!

اِس سے پہلے کہ ہم سے سب کچھ چھن جائے، ہمیں بہت کچھ چھوڑ دینا چاہیے، اور پھر

سے ترتیبِ نو پیدا کرنی چاہیے۔ انسان، انسان کا دکھ محسوس کرے —بلکہ انسان، انسان کو انسان تو سمجھے۔ یہ فنا کی بستی ہے۔ یہ وقت کا عبرت کدہ ہے۔ یہاں سے بڑے بڑے فراعنہ لعنتی ہو کر نکلے۔ یہاں سے کوئی چیز اٹھائی نہیں جا سکتی۔ زمینیں انتقال کراتے کراتے بندے کا اپنا انتقال ہو جاتا ہے۔ ہم دوسروں کے مال کی حفاظت کرتے رہتے ہیں اور آنے والی نسل مال کے انتظار میں ہماری رخصت کی دُعا کرتی رہتی ہے۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو ہو رہا ہے، وہ نہ ہو —اور جو نہیں ہو رہا، وہ ہونا شروع ہو جائے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک وحدت میں پھر سے پرو دیے جائیں؟ کیا تمام علماء اور تمام مشائخ اکٹھے نہیں ہو سکتے؟ کیا اِس قوم کو وہ وقت نہیں مل سکتا جس کے آنے کی دُعائیں کی جا رہی تھیں؟ کیا وہ قربانیاں جو شہید ہونے والوں نے پیش کیں، اُن کو رائیگاں ہونے سے بچایا نہیں جا سکتا؟ یہاں اپنے دیس میں بہت سے لوگ خود کو پردیسی مانتے ہیں —کیوں؟

کیا قوم حاکموں اور محکوموں میں تقسیم ہو جائے گی؟ کیا اِسے امیر غریب میں بٹ جانا چاہیے؟ کیا سکھی لوگ، دکھیوں کا آسرا نہیں بن سکتے؟ کیا موجود بے ترتیبی پھر سے حُسنِ ترتیب میں نہیں آ سکتی؟

یہ سوچنے کی بات نہیں ہے۔ یہ اُس کے فضل کے انتظار کا وقت ہے۔ ہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے عمل سے دراصل ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ملک ماں ہے۔ اِس کا ایک بیٹا مرے یا دوسرا مر جائے —برابر ہے۔ اپوزیشن بھی ایمان سے کام لے اور حکومت بھی خلوص کے ساتھ کام کرے۔ قوم اور ملک مزید کسی صدمے کے متحمل نہیں ہو سکتے اور ہم سارے ملک پر رحم کریں، اِس کی خدمت کریں اور قوم کی تشکیل کریں —اور پھر عناصر میں ظہورِ ترتیب پیدا ہو جائے گا۔

رابطہ

رابطہ یہ نہیں کہ پوسٹ بکس نمبر بتا دیا جائے۔ رابطہ اُس خیال کا نام ہے جو کسی قاری کے دل میں مصنّف کے بارے میں پیدا ہو۔ دل میں پیدا ہونے والا خیال ہی رابطہ ہے۔ اظہار میں آئے یا نہ آئے، رابطہ ہی کہلائے گا۔

اگر ایک آدمی آپ کے پاس سے گزرا، اُس نے آپ کو دیکھا اور خاموشی سے آپ کی زندگی اور آپ کی حفاظت کے بارے میں دُعا کر دی تو اُس سے دِل کا رابطہ قائم ہو گیا۔ ہزارہا رابطے خاموشی سے پلتے رہتے ہیں، کوئی کوئی رابطہ ظاہر ہوتا ہے۔ ماں کا رابطہ، اپنے بچے کے پیدا ہونے سے پہلے بھی ہوتا ہے۔ وہ بچے کے خیال میں سوتی ہے، اُسی کے خیال میں جاگتی ہے۔ اُس کے خواب، اُس کی بیداری، اُس کے پروگرام، اُسی آنے والے بچے کے حوالے سے بنتے رہتے ہیں۔ پردیس جانے والے، اپنے دیس کے رابطے میں رہتے ہیں۔ عمر پردیس میں کٹتی ہے اور رابطہ وطن میں رہتا ہے۔ ماں کی دُعائیں رابطے کی شکل ہیں۔

ہم لوگ بعض اوقات یہ دریافت کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کس کا کب، کیسے اور کہاں رابطہ ہو گیا۔ استاد کی بات، اُس کا دیا ہوا علم جب تک قائم رہے، اُستاد سے رابطہ ہے۔ استاد فوت ہو جائے تب بھی رابطہ ہے۔ اسی لیے معلّم کی قدر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور جو ذات معلّمِ اخلاق ﷺ ہے، اس کا رابطہ کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔

رابطے دلوں میں پلتے ہیں۔ محبّت صرف رابطے کا نام ہے۔ ایک آدمی نے دوسرے

انسان کو پسند کیا۔ آنکھوں نے چہرہ دیکھا، دل نے قبول کیا، روح نے استقبال کیا، رابطہ مستقل ہو گیا۔ ہمارے غم اور ہماری خوشیاں اسی رابطے کی روشنی میں چلتے اور پلتے رہتے ہیں۔ وہ پرندے جو سرد علاقوں سے گرم علاقوں کی طرف ہجرت کرتے ہیں، وہ برفوں میں چھوڑے ہوئے اپنے انڈوں سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور یہاں تک بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے دل اور اپنی نگاہ کی گرمی سے انڈوں کو گرم رکھتے ہیں، انہیں سیتے ہیں۔

دنیا میں نظر آنے والی حرکت رابطوں کی تفسیر ہے۔ بندے کا رابطہ خدا کے ساتھ، چاہے اس کا اظہار ہو یا نہ ہو، قائم رہتا ہے۔ مالک ہونے کی حیثیت سے زندگی دینے والا، زندگی واپس لے لے، تب بھی رابطہ قائم رہتا ہے۔ وہ ہر حال میں آپ کی سانسوں میں ہے۔ آپ کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ اُس کے رابطے اُس کی ذات کی طرح پُراَسرار اور پُرتاثیر ہوتے ہیں۔ ایک رابطہ جو ہم خدا کے ساتھ رکھتے ہیں اور ایک رابطہ جو خدا ہمارے ساتھ رکھتا ہے۔

یہ زندگی رابطوں کی داستان ہے — رابطے ہی رابطے، لطف ہی لطف، رونق ہی رونق! رابطوں کو نہ ماننے والے شاید اِس حقیقت کو نہ سمجھ سکیں، لیکن یہ ایک اَمرِ واقعہ ہے کہ ہم ماضی میں زندہ ہیں، ہم حال میں زندہ ہیں، ہم مستقبل میں زندہ ہیں۔ یہ ہزارہا لائبریریاں ماضی کے مصنفوں کے ساتھ ہمارے رابطوں کی داستانِ دلنشیں ہے۔ اگر مصنّف فانی تھا، مر گیا۔ اُس کا ذکر ضروری نہیں، تو پھر اُس کی کتاب کیا ہے؟ کتاب مصنّف کے پاس لے جاتی ہے، اُس کے دل میں لے جاتی ہے، اُس کے دماغ میں لے جاتی ہے اور ہم اُس رابطے سے اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں کسی مصنف کو نہیں مانتا، کسی کی "کیمیائے سعادت" کو نہیں مانتا، یا کسی "نہج البلاغہ" کو نہیں مانتا، یا کسی "کشف المحجوب" کو نہیں مانتا کہ اُن کے مصنّف مر گئے، ختم ہو گئے، تو اَدب سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ قرآن کو زندہ کلام کیسے مانتے ہو اور حدیث کو زندہ کلام کیسے مانتے ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز، ہر گزری ہوئی چیز، اِتنی زندہ ہے کہ اندازہ کرنا مشکل ہے۔

کسی آدمی کا باپ فوت ہو جائے، قبر میں دفن ہو جائے، اگر وہ گزر گیا، ختم ہو گیا تو قبر کیا ہے اور کیوں ہے؟ اگر قبر صاحبِ مزار کے نام سے موسوم ہے تو ہر مزار اپنے صاحبِ مزار کے ساتھ رابطے کا ذریعہ بنتا ہے۔

ہم اِنہی رابطوں میں پلتے ہیں، انہی رابطوں پر چلتے ہیں، یہی رابطے ہماری سند ہیں، یہی رابطے ہماری گزر گاہِ خیال کے راستے ہیں — انہی شاہراہوں پر وقت کے قافلے چلتے رہے۔ وہ قافلے کہیں غائب نہیں ہو گئے، کہیں عنقا نہیں ہو گئے، کہیں معدوم نہیں ہو گئے۔ وہ سارے، زمانے کے چہرے پر اپنے نقش مُرتسم کر گئے۔

تاریخ ماضی سے رابطہ ہے اور مذہب — مذہب تو ہے ہی رابطے کا نام۔ ہم کلمہ پڑھتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے ہمیں کلمہ پڑھنے والا بنایا، ہم کو ایمان عطا فرمایا اور ہمیں ایک ایسے نبیِ معظّم ﷺ پر ایمان لانے کی سعادت بخشی جو آج سے بہت عرصہ پہلے تشریف لائے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ اپنے زمانے تک موجود تھے اور اُس کے بعد نعوذ باللہ موجود نہیں ہیں تو سوچنا پڑے گا کہ صحابہ کرامؓ نے جو کلمہ پڑھا اور جو کلمہ ہم پڑھ رہے ہیں، اُس میں بنیادی فرق ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی زندگی اور موجودگی میں حضور ﷺ پر ایمان لانا ایک دیکھی ہوئی بات تھی۔ آج جب وہ ذاتؐ ہمارے درمیان اُس حالت میں موجود نہیں ہے تو ہم اُس کا کلمہ اُس یقین سے کیسے پڑھیں، اُس کی شہادت اتنے وثوق سے کیسے دیں جو اُن لوگوں کے پاس تھی، جو آپ ﷺ کے زمانے میں تھے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ ہم بھی جو کلمہ پڑھتے ہیں، ہم اپنے آپ کو حضور ﷺ کے اتنا ہی قریب مانتے ہیں جتنا وہ لوگ مانتے ہیں، کیونکہ رابطہ جغرافیائی نہیں، تاریخی نہیں، وجودی نہیں، بلکہ یہ ایک روحانی رابطہ ہے۔ وہ رابطہ آج بھی اتنا ہی قوی ہے، اتنا ہی لافانی ہے، جتنا پہلے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کلمہ پڑھنے والا، کل کے کلمہ پڑھنے والے کے برابر ہے۔

جن لوگوں کے زمانے میں نزولِ قرآن ہوا، انہوں نے دیکھا کہ کس طرح نزول کی

کیفیات پیدا ہوئیں۔ ہمارے سامنے یہ واقعہ نہیں ہوا، لیکن ہمارا ایمان اتنا ہی قوی ہے کہ یہ کلام، اللہ کا کلام ہے، جبریلِ امینؑ کا لایا ہوا، ہمیشہ رہنے والا، حضورِ اکرم ﷺ کی زبان سے نکلا ہوا — اور یہ کلام ہمیشہ ہی اپنی تمام تقدیس کے ساتھ محفوظ اور قائم رہے گا۔ لوگوں نے اِس رابطے کے بارے میں بہت سے شبہات پھیلائے ہوئے ہیں۔ اِس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضور پاک ﷺ اللہ کے رسول ہیں، ہمیشہ کے لیے ہیں، اور جو "ہیں"، انہیں "تھے" نہیں کہہ سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس ذاتؐ پر نزولِ کلامِ مجید ہو، وہ ذاتؐ کم نہیں ہے مقدّس کتاب سے۔ حضور ﷺ کے رابطے کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کلمہ ہی رابطہ ہے اور رابطہ ہی کلمہ ہے۔

ہر اسم اپنے مسمّٰی کے ساتھ رابطہ رکھتا ہے اور یہ رابطہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ ہم جس اِسم کو پکارتے ہیں، اُس کے مسمّٰی تک ہماری پکار پہنچتی ہے اور ہمیں جواب ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کی اصلاح بھی اور اُس کا عرفان بھی، اِن رابطوں کا مرہونِ منّت ہے۔ روح، روح کو گائیڈ کر سکتی ہے۔ اب تو مغرب اور سائنس زدہ مغرب نے بھی روحانی رابطوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ انسان ایک ماحول میں رہتا ہے اور ممکن ہے اس کے رابطے کسی اور ماحول سے ہوں۔ دل کی باتیں دل والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ روح کی دنیا روح والے ہی پہچانتے ہیں۔ راز کا عالَم راز جاننے والوں پر آشکار ہوتا ہے۔ اگر ماضی کے رابطے ختم کر دیے گئے تو کسی مستقبل پر اِیمان لانا ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قوم بزرگوں کے دن مناتی ہے۔ اُس دن بزرگ لوگ اپنی عارضی رخصت کے باوجود اپنے دنوں کے منائے جانے کا لطف حاصل کرتے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کے مزار پر حاضری دینا قائدؒ کی روح کو سلام ہے اور اُن کے لیے آسودگی کا پیغام۔ اسی طرح باقی لوگوں کے آستانوں پر ہماری حاضریوں کا عالَم ہے۔ انسان سوچ سمجھ کر غور کے ساتھ اپنے رابطوں کو دریافت کرے، اپنے رابطوں کی حفاظت کرے اور اپنے رابطوں سے ہو سکے تو قوم کو آگاہ کرے۔ اقبالؒ نے پیرِ رومیؒ سے رابطہ کیا، حالانکہ پیرِ رومیؒ کوئی زندہ انسان نہیں تھے اور

پیرِ رومیؒ کا فیض اقبالؒ کے اندر بولا۔ قوم نے دیکھا، قوم نے سوچا، قوم نے فیصلے کیے، فیصلے کامیابیوں سے سرفراز ہوئے اور آج وہی فیصلے ہمارے "ہم" ہونے کا جواز ہیں۔

غور سے دیکھنے والی بات ہے کہ اگر آپ کوئی اچھی بات کہیں، اچھا کلام تحریر کریں تو آپ کے لیے ہزارہا اُٹھے ہوئے ہاتھ آپ کی صحت اور زندگی کی دُعا کے لیے تیار ہوں گے۔ کسی کا نام نہیں معلوم، کسی کا چہرہ نہیں دیکھا، لیکن اُن سے رابطہ ہے، اُن کا آپ سے رابطہ ہے۔ رابطے آپ کو تقویت دے رہے ہیں اور آپ اسی تقویت سے اپنے سفر پر گامزن ہیں۔

خدا ہمارے روحانی رابطوں کی حفاظت فرمائے۔ انہیں ہمارے لیے دُعا دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمیں اُن کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمارے استادوں کی خیر، ہمارے بزرگوں کی خیر، ہماری تاریخ کی خیر — اور ہمیں ایمان کی دولت عطا فرمانے والوں کی خدمت میں سجدۂ نیاز!!

رِشتے

رشتے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ جو ہمیں پیدائش سے ہی وراثت میں ملے اور وہ جو ہم نے خود بنائے۔ پیدائشی رشتے خون کے رشتے ہیں — ماں باپ، بہن بھائی، اَعزاء و اَقرباء — یہ سب رشتے بنے بنائے ہوتے ہیں۔ یہ رشتے نہ جوڑنے سے جڑتے ہیں اور نہ توڑنے سے ٹوٹتے ہیں۔ یہ دائمی رشتے ہیں۔ یہ اَزلی وابستگیاں ہیں۔ یہ ہماری ذمہ داریاں ہیں جنہیں ہم نے پورا کرنا ہوتا ہے۔ بزرگوں کی عزت، چھوٹوں سے پیار، اِن رشتوں کا تقاضا ہے۔

وہ رشتے جو ہم خود بناتے ہیں، ہمارے دوست ہیں، ہمارے ہم جماعت، ہم مذہب، ہم پیشہ، ہمدَم رفیق، ہمارے محبوب، ہمارے محبّ، ہمارے سیاسی رفقاء، ہمارے مخالفین، ہمارے مداح، ہمارے افسر، ہمارے ماتحت بلکہ حریف و حلیف، ہمارے اساتذہ، ہمارے تلامذہ — غرضیکہ ہر طرح کے لوگ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ ہماری زندگی ہمارے اِن ہی رشتوں میں بٹ جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے اور کٹ جاتی ہے۔ ہم باراتوں اور جنازوں میں شامل ہوتے ہوتے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایک مختصر زندگی اتنے لامحدود رشتوں کی کہاں سے تاب لا سکتی ہے — بس ختم ہو جاتی ہے۔ ہم دوسروں کی داستان سنتے سنتے سو جاتے ہیں۔ داستان جاری رہتی ہے، لیکن سننے والے ختم ہو جاتے ہیں۔

ہم اپنے بزرگوں سے اُن کی زندگی کے حالات سنتے ہیں، اپنے بچوں کو اپنے زمانے کا ذکر سناتے ہیں اور جب بچے اپنا حال سنانے کے قابل ہوتے ہیں، ہم سماعت سے محروم ہو چکے

ہوتے ہیں۔ ہم قلیل عرصہ کے لیے یہاں ہیں اور یہاں کا کاروبار ایک طویل سلسلہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم راستے میں ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ کوئی شخص یہ داستان مکمل نہیں کر سکا — کبھی آغاز رہ گیا اور کبھی انجام — کچھ گلے، شکوے، شکایتیں، کچھ خشک و تر یادیں رہ جاتی ہیں، باقی کچھ بھی تو نہیں رہتا۔

رشتوں کی بہار انسان کے لیے ایک عجب احساس پیدا کرتی ہے۔ فرد ایک وسیع اجتماعیت کے اِحساس میں پلتا ہے۔ ہم خود کو ہر طرف متعلّق محسوس کرتے ہیں۔ ایک عظیم وصال ہمیں اپنی آغوش میں لے کر پرورش کرتا ہے۔

ہم پر وقت کی عنایات کے دَروازے کھلتے ہیں۔ اِمکانات روشن ہوتے ہیں — ہمارا وجود، ہمارا احساس، ہمارا شعور ہر طرف محسوس کیا جاتا ہے۔ ہم خوشی اور غم میں تنہا نہیں رہتے۔ لوگ ہمارے ساتھ شریک ہو کر ہماری خوشی میں اضافہ کرتے ہیں اور غم کو کم کرتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہم دیکھے جا رہے ہیں، ہم سوچے جا رہے ہیں، ہم محسوس کیے جا رہے ہیں۔ ہم ایک وسیع اور عظیم زندگی کا لازمی حصہ بن گئے ہیں۔ ہمارے بغیر زندگی نامکمل تھی۔ ہمارے آنے سے سب کچھ ہوا۔ لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ زندگی ہمارے استقبال میں کھڑی تھی۔ ہم خود کو ایک نہایت ہی اہم فرد سمجھتے ہیں۔ ہم نہ ہوتے تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا — لیکن، اور یہ ''لیکن'' ایک اُداس ''لیکن'' ہے — کچھ ہی عرصہ میں سب کچھ بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہم پر برسنے والے پیار کے بادل، بے اعتنائی کی آندھی سے اُڑ جاتے ہیں۔ ہمارے سروں سے محبّت کی چادر اُتر جاتی ہے۔ محبّت کرنے والے، محبّت کرنے والے نہیں رہتے۔ ہماری خوشیاں، ہمارے غم بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہمارا عظیم وصال ایک خوفناک فراق بن جاتا ہے۔ ہمارے، ہمارے نہیں رہتے۔ ہمارا وجود ہی زندگی میں غیر موجود ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے تذکرے زبانوں سے اُتر جاتے ہیں۔ ہماری یاد دِل سے دُور ہو جاتی ہے۔ ہم تنہائی کے صحرا میں پہنچ جاتے ہیں۔ اپنوں کے پاس، اپنوں کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں ہوتا۔ ہماری محبّت

ہماری آزمائش بن جاتی ہے — اور رشتے دَم توڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ رشتے ہمیں چھوڑ دیتے ہیں، کچھ کو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ ہمیں بھول جاتے ہیں اور کچھ کو ہم۔ جن کے بغیر گزارا نہیں ہوتا تھا، اُن کے ساتھ گزارا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب تک ہم والدین کے گھر میں رہتے ہیں، ہم خوش رہتے ہیں اور جب شومئ قسمت اُسی مکان میں ماں باپ ہمارے گھر میں رہنے لگیں تو ہم اچھا محسوس نہیں کرتے۔ ہماری ضرورتیں پوری کرنے والے والدین جب ہم سے اپنی ضرورت کا ذکر کرتے ہیں تو ہم رشتوں کی اذیّت کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم اُس عنایت کو بھول جاتے ہیں جو ہم پر بچپن میں ہوئی۔

اِسی طرح باقی رشتے آہستہ آہستہ دَم توڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ہم آہستہ آہستہ اپنوں سے بیگانوں میں جا پہنچتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک قافلہ چل رہا تھا۔ ایک ہجوم تھا اپنوں کا، اپنے لگتوں کا۔ چلتے چلتے ہجوم بدل جاتا ہے۔ چہرے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہجوم قائم رہتا ہے لیکن افراد بدل جاتے ہیں، اور اس ہجوم میں ہمارے ماضی کی کوئی ہمراہی نہیں ہوتی۔ سب اجنبی ہوتے ہیں — سب، سب سے بے خبر — ہمارے ہی قافلے میں ہمارا کوئی نہیں ہوتا۔ رشتے ٹوٹ چکے ہوتے ہیں۔ دل پتھر ہو چکا ہوتا ہے، نہ کوئی یاد ستاتی ہے، نہ کوئی غم رلاتا ہے۔ ہونا اور نہ ہونا برابر سا لگتا ہے۔

رشتے ہمارا وقت، ہمارا پیسہ، ہمارا سکون اور کبھی کبھی ہمارا ایمان کھاتے ہیں۔ یہی ہمارا سماج ہے اور یہی ہمارا معیار ہے۔ ہمیں ترغیبات میں پھنسانے والے رشتے ہی تو ہیں۔ ہمیں غریبی سے غیرت دلانے والے رشتے ہی تو ہیں — اور پھر اِس غیرت سے مجبور ہو کر ہم ایمان فروشی کر جاتے ہیں۔ ہم غریبی کو حرام سمجھتے ہیں اور رشوت کو حلال۔ رشتوں کے تقاضے، دین کے تقاضوں سے متصادم ہو جاتے ہیں اور پھر — ہم بے بس ہو کر، کر گزرتے ہیں وہ کام جو ہمیں نہ کرنا چاہیے۔

رشتوں میں اہم ترین رشتہ میاں بیوی کا ہے۔ یہ رشتہ ہم خود بناتے ہیں اور خود ہی

اِس کو نبھانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ گاڑی کے دو پہیے ساری عمر مناظرہ ہی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجادلے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس غزل کے مطلع اور مقطع میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ سکون بھی اس رشتے میں ہے اور اضطراب بھی۔ شادی کے اوّلین اَیام طلسماتی ہوتے ہیں۔ محبّت و سرشاری کی داستان، وفورِ شوق کے لمحات اور عزت و احترام کے جذبات، شعورِ ذات کی بیداری کا دَور، ارتقاء و بقائے حیات کے عظیم عمل میں اشتراک کا اِحساس اِس رشتے کی اساس ہے— لیکن یہ رشتہ بھی— کیا اعتبار رشتۂ ناپائیدار کا! پیار ہی پیار میں "آپ" سے "تم" اور "تم" سے "تُو" تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ سکون بخش رشتے کے اذیّت ناک پہلو نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اِنسان پسندیدہ کو بس برداشت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ شروع شروع میں لوگ اِس رشتے کے دَم سے زندہ ہوتے ہیں اور پھر اِس کے باوجود—! ملہار میں شروع ہونے والا یہ رشتہ دیپک راگ پر ختم ہوتا ہے۔

رشتوں کی داستان شروع سے چلی آرہی ہے۔ رشتے پیدا ہوتے ہیں، رشتے بنتے ہیں، بنائے جاتے ہیں، رشتے پلتے ہیں، رشتے ٹوٹتے ہیں اور رشتے جزا و سزا مرتّب کرتے ہیں۔

ذہنی نشوو نما اور اِرتقاء کے ساتھ رشتوں کی افادیت بدلتی رہتی ہے۔ آج کے متمدّن و مہذّب معاشرہ میں رشتوں کا احساس مشینوں نے ختم کر دیا ہے۔ ہر آدمی ایک جزیرہ سا بن گیا ہے۔ محبتوں کی ضرورت نہیں رہی۔ خدمتیں خرید لی جاتی ہیں اور بس— ضرورت کے سودے ہیں، رشتے کیا ہیں! خاندان ختم ہو رہے ہیں، برادری کا وجود عدم ہو چکا ہے۔ حلقۂ دوستاں اور ہالۂ دشمناں میں چنداں فرق نہیں رہا۔ خون کے رشتے بھی خونی ہوتے جا رہے ہیں۔ خلوص، مہر، وفا اور محبّت کے الفاظ معنویت سے عاری ہوتے جا رہے ہیں۔ انسان ترقی کر رہا ہے۔ اُنسیت اور مروّت کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں رکھتا۔ وہ آسمان کے دروازے کھٹکھٹاتا ہے، وہ دِل کے دروازے پر کیوں دستک دے گا۔ وہ خلاؤں کے راستے دریافت کرنے نکلا ہوا ہے، اُسے گھر کا راستہ بھول گیا ہے۔ وہ ستاروں کی گزر گاہیں ڈھونڈ رہا ہے، وہ گزر گاہِ احساس سے بے خبر ہے۔

اُس کے پاس بہت کچھ ہے، بس پیار کرنے والا دل ہی نہیں۔ اُس کے لیے پیار، محبّت بے معنی الفاظ ہیں۔ انسان کو بے جان چیزوں سے محبّت ہے۔ مشینیں، کارخانے، گاڑیاں، بینک، تیز رفتار جہاز، بھاگم دَوڑ اور دھکم پیل میں گم انسان اتنا وقت ہی نہیں رکھتا کہ مانوس چہروں کو محسوس کرے۔ اُس کے پاس ایٹم کی طاقتیں ہیں۔ اُس کے قبضے میں بارُود کے ذخیرے ہیں۔ وہ قوّت رکھتا ہے — انسان کو تباہ کرنے کی قوّت، زمین کو ویران کرنے کی قوّت۔ جذبوں سے عاری انسان رشتے توڑ چکا ہے۔ وہ عقیدت و احترام کی دُنیا چھوڑ چکا ہے — اور نتیجہ یہ کہ انسان رشتے توڑتے توڑتے خود بھی ٹوٹ چکا ہے۔

باہمی احترام ختم ہونے سے کھچاؤ پیدا ہو گیا ہے اور ڈیپریشن کی وبا پھیل چکی ہے۔ آج جگہ جگہ کلینک کھل رہے ہیں۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا باطن مریض ہو چکا ہے۔ محبّت دِل کی صحت ہے اور بے مروّتی بیماری۔ رشتوں سے آزاد ہو کر انسان ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کا غلام ہو گیا ہے۔

آج کا انسان صرف مکان میں رہتا ہے۔ اُس کا گھر ختم ہو گیا ہے۔ باہمی اشتراک کے زمانے ختم ہو گئے۔ آج کی ملاقاتیں ضرورت کی ملاقاتیں ہیں۔ آج کا تعلق افادیت کا تعلق ہے۔ انسان کو شاید محسوس نہیں ہو رہا کہ وہ روحانی تشنگی کا شکار ہے۔ وہ انسانوں کے اِس عظیم میلے میں اکیلا ہے۔ وہ کسی کا نہیں اور اُس کا کوئی نہیں۔ وہ چیزوں کو دیکھتا ہے، انہیں محسوس نہیں کر سکتا — اس بیگانگی کا نتیجہ خطرناک ہو سکتا ہے۔

ابھی وقت ہے کہ رشتوں کے تقدّس کا احیاء کیا جائے۔ انہیں پامال ہونے سے بچایا جائے۔ ایک بار پھر پرانی نشستیں قائم کی جائیں، پرانے گیت گائے جائیں، پرانے چہرے ڈھونڈے جائیں، پرانی آنکھیں تلاش کی جائیں، پرانے آشیانے آباد کیے جائیں، پرانی عقیدتیں بحال کی جائیں، پرانے مناظر پھر سے دیکھے جائیں۔

انسان ماڈرن ہوتے ہوتے کہیں انسانیت ہی سے محروم نہ ہو جائے۔ دل پرانی یادوں

سے آباد رہیں اور پیشانیاں سجدوں سے سرفراز رہیں۔ پرانا کلمہ پھر سے پڑھا جائے۔ پرانی مساجد کی عزت کی جائے۔ پرانے خطبوں میں نئے نام نہ ملائے جائیں۔ پرانی عقیدتیں ہی دینی عقیدتیں ہیں۔ ہمارا رشتوں سے آزاد نیا پن کہیں ہمیں دین سے محروم نہ کر دے۔ محبّت و احترام سے آزاد ہو کر ہم گستاخ نہ بن جائیں۔ ہماری خود غرضی اور گستاخی ہمارے لیے عذاب نہ لکھ دے۔ ایسا عذاب کہ ہمارے لیے کوئی دل بے قرار نہ ہو، کوئی آنکھ انتظار نہ کرے، اور سب سے زیادہ خطرناک عذاب کہ ہمارے لیے کوئی دُعا گو ہی نہ رہ جائے۔ ہم نے جن لوگوں کو اپنی موت کا غم دے کر جانا ہے، کیوں نہ اُن کو زندگی ہی میں کوئی خوشی دی جائے۔ موت یہ نہیں کہ سانس ختم ہو جائے، اصل موت تو یہ ہے کہ ہمیں یاد کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ہمارے لیے نیک خواہشات رکھنے والے ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ اُن کی قدر کرنا چاہیے۔ اگر ہمارا کوئی نہ ہو، تو پھر ہم ہیں ہی کیا؟ ہمارا ہونا بھی کیا ہونا ہے—!!

نصیحت

دنیا میں سب سے آسان کام نصیحت کرنا ہے اور سب سے مشکل کام نصیحت پر عمل کرنا ہے۔ میں نے اپنے لیے آسان کام چن لیا ہے اور آپ — آپ کی مرضی، مشکل میں پڑیں یا مشکل سے باہر رہیں۔

نصیحت کرنے کا عمل زندگی کی طرح بہت پرانا ہے۔ غالباً پہلے انسان کے پیدا ہونے سے پہلے بھی نصیحت کا عمل موجود تھا۔ نصیحت ایک حکم کی طرح نافذ ہوتی تھی — ایسے کرو، ایسے نہ کرو۔ وہاں جاؤ — وہاں نہ جاؤ — سجدہ کرو — اُس کا سجدہ کرو اور اُس کے علاوہ کا سجدہ نہ کرو — ماں باپ کی اطاعت کرو — شیطان کی اطاعت نہ کرو — غرضیکہ نصیحت سنو اور مانتے چلے جاؤ — زمین کے سفر میں آسمان کی نصیحتیں سنو اور انہیں ماننے کا حوصلہ پیدا کرو۔

ماضی کے اَوراق میں ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ایک آدمی، ہم میں سے ہی، ہمارے سامنے ایک بلندی پر کھڑا ہو گیا اور ایک رعب دار آواز میں نصیحت کرنے لگ گیا کہ شرک نہ کرو — زمین پر اکڑ کر نہ چلو — اور وغیرہ وغیرہ۔ اِن لوگوں کو کس نے اجازت دی کہ لوگوں کو خطاب کریں کہ اے انسانو! غور سے سنو! — ایک وقت آنے والا ہے جب تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا — جب چھپے ہوئے راز ظاہر ہوں گے اور جب انسان کو اُس کے اعمال کے مطابق ایک عاقبت ملے گی۔

بہر حال نصیحتیں چلتی رہتی ہیں — خطاب جاری رہتے ہیں اور سماعتیں بے حس ہو

جاتی ہیں — نصیحت کرنے والے شور مچاتے رہتے ہیں کہ اے محترم اندھو! آگے قدم نہ بڑھانا — آگے اندھا کنواں ہے — لیکن عقل کے اندھے سُنی اَن سُنی کرکے دھڑام سے گرتے رہتے ہیں — اور پھر گلہ ہوتا ہے کہ کاش مجھے کوئی لاٹھی مار کے سمجھاتا، کہ واقعی آگے اندھا کنواں ہے۔ یہ لوگ سنتے ہیں لیکن اِن کے دل پر اثر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ دیکھتے ہیں لیکن اِنہیں نظر کچھ نہیں آتا — یہ لوگ فلسفی ہیں لیکن یہ بیچارے سمجھ نہیں سکتے — اِن کے پاس دل ہے لیکن احساس نہیں — یہ لوگ مغرور ہیں لیکن اِن کی متاعِ حیات قلیل ہے — یہ طاقت سے حکومت کرنا چاہتے ہیں، اِن کے پاس خدمت کرنے کا شعور نہیں — بس اس طرح یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ آوازیں آرہی ہیں کہ غافلو! سنو غور سے، گَجر کی آواز سنائی دیتی ہے، کان دھرو، وقت کا ناقوس بج رہا ہے۔ رحیلِ کارواں کے معنی تلاش کرو۔ بانگِ درا کی تفسیر ڈھونڈو، بالِ جبریل کا مفہوم سمجھو، لیکن نہیں — سننے والوں کے کانوں میں گویا پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جا چکا ہے۔ خواہشات کا اُودھم مچا ہوا ہے، نصیحت کی آواز کیسے سنائی دے!

لوگ مطمئن ہیں کہ اب کوئی سقراط موجود نہیں — اچھا ہوا کہ سعدیؒ رخصت ہو گئے — بھلا ہو اِقبالؒ کا، کہ اب وہ بھی نہیں — کچھ لوگوں کے لیے یہ اَمر باعثِ اطمینان ہے کہ اب نئی نسل پرانے مذہب سے آزاد ہو رہی ہے — خوش ہیں لوگ اِس بات پر کہ اللہ نے نبی بھیجنے کا سلسلہ ہی بند فرما دیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اُن کو نجات مل گئی، عقیدتوں اور عقیدوں سے — اور وہ آزاد ہو گئے نصیحتوں سے، ڈرانے والوں سے، آگاہِ راز کرنے والوں سے۔ اُن کے لیے صرف حال ہے — نہ کوئی فردا، نہ ماضی — بس صرف یہی دَور ہے، یہی زمانہ ہے۔ آئندہ کوئی حساب کتاب نہیں ہو گا — اللہ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر — لیکن — لیکن ایسے نہیں ہو سکتا۔ پیدا کرنے والے نے زندگی اور موت پیدا کی — یہ دیکھنے کے لیے کہ کون نصیحت کرتا ہے اور کون نصیحت پر عمل کرتا ہے — کون سعادت مند ہے جو دوسروں کے تجربات سے فائدہ حاصل کرتا ہے — کون ہے خوش نصیب جو نصیحت کے چراغ کی روشنی میں زندگی کی تاریکیوں سے

آزاد ہو جاتا ہے، اور کون ہے وہ جو اِس زندگی اور اُس زندگی کے انعامات سے سرفراز ہوتا ہے۔

نصیحت کا لفظ طلسماتی لفظ ہے، جو زندگی کے سفر میں کسی وقت بھی اپنا جادو جگا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ نصیحت کرنے والا نصیحت کے عمل سے خود کوئی فائدہ حاصل نہ کرے، ورنہ سب کچھ بیکار ہو جائے گا۔ مخلص کی تعریف ہی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ، آپ سے زیادہ مہربان ہو — وہ جو اپنے آپ کو بھول کر آپ کو یاد رکھے — وہ جو تم سے تمہاری بہبود کے علاوہ کسی اور معاوضے کا متمنّی نہ ہو۔ نصیحت کرنے والا مخلص نہ ہو تو نصیحت بھی ایک پیشہ ہے۔ پیشہ ور کی نصیحت، نصیحت نہیں کہلائی جا سکتی ہے — !!

بہرحال کہنے کا مدعا یہ تھا کہ نصیحت کا عمل قدیم ہے، آسان ہے۔ ہم نے اسے اپنے لیے چن لیا — اور اب یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ہم ہر وقت ہر آدمی کو ہر طرح کی نصیحت ہی کرتے رہیں — نہیں — ایسے نہیں — ! نصیحت کا پہلا اصول یہ ہے کہ نصیحت کرنے والا نصیحت سننے والے سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور پیدا کرے — بے تعلق نصیحت یا بے تعلق تبلیغ ایسے ہے جیسے زبانِ غیر میں تقریر کرنا — !

سب سے موزوں نصیحت تو یہی ہے کہ نصیحت سننے والے میں نصیحت سننے کا شوق ہو — ورنہ — ورنہ وہی کہانی کہ ایک دفعہ ایک بندر تھا — بندر اور بِیا پاس پاس رہتے تھے — پڑوسی تھے — بِیا سارا سال خوبصورت گھونسلہ بناتا اور سردی میں اُس میں آرام کرتا۔ بندر تو بس بندر ہی تھا۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ بندر سردی میں ٹھٹھر رہا تھا — اور بِیا اَپنے آشیانے میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بِیا کو کیا سوجھی کہ وہ بندر کو دیکھ کر نصیحت کرنے لگا۔ بولا: "بھائی بندر! میں نے تمہیں ہزار بار کہا تھا کہ موسمِ سرما آنے والا ہے۔ اپنے لیے آشیانہ بنالو، مگر تم نے ایک نہ مانی"۔ بندر یہ سن کر ناراض ہو گیا — اُس نے کہا: "اتنے سے پرندے! اتنے بڑے بندر کے سامنے زبان کھولتے ہوئے شرم نہیں آتی — تجھے نصیحت کا حق کس نے دیا — لا، میں تجھے گھونسلہ بنا کے دکھاؤں"۔ بندر نے بندروں والا کام کر دیا — اور بِیا کا گھونسلہ ٹوٹ گیا — توڑ دیا گیا — بندر نے

اپنا آشیانہ نہ بنایا—ناصح کا آشیانہ توڑ دیا—!!

بس یہی انجام کرتے ہیں نصیحت پر ناراض ہونے والے، ناصح کا— کبھی صلیب پر چڑھا دیتے ہیں — کبھی دار پر — کبھی اُس پر کربلائیں نافذ کر دیتے ہیں — کبھی اُسےؐ وادیٔ طائف سے گزار دیتے ہیں — کبھی کوئی صعوبت، کبھی کوئی — لیکن سلام و دُرود ہو نصیحت کرنے والوں پر، جن کے حوصلے بلند اور عزائم پختہ ہوتے ہیں—جو گالیاں سن کر دُعائیں دیتے ہیں اور جو غافلوں سے غفلت کی چادریں اُتار دیتے ہیں اور انہیں بے حسی کی نیند سے جگاتے رہتے ہیں۔ ہم بھی اُن لوگوں کے ساتھ عقیدت کے طور پر نصیحت کرنے کا عمل اِختیار کرنے کا اِرادہ رکھتے ہیں۔

اِس سے پہلے کہ کوئی نصیحت کی جائے، یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ دُنیا میں کوئی ایسی نصیحت نہیں جو پہلے کی نہ گئی ہو۔ کتابیں، لائبریریاں نصیحتوں سے بھری ہوئی ہیں—تو کیا کتابیں پڑھ لینا ہی کافی ہے؟ — نہیں —!اِس کے علاوہ بھی کچھ ہے —بہت کچھ ہے۔ یہ وقت کا عبرت کدہ ہے — یہاں آنکھ کھول کر چلنا چاہیے، اپنی من مانی نہیں کرنی چاہیے — پہلے من مانیاں کرنے والے کہاں گئے؟ عشرت کدے عبرت کدے کیوں بن گئے—؟ محلّات کھنڈرات ہو گئے — دُنیا میں جھوٹ بولنے والے کیا کیا نشانیاں چھوڑ گئے — ویرانیاں ہی نشانیاں ہیں—!

سب سے بڑی نصیحت تو یہی ہے کہ نصیحت سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے—کان کھول کر رکھے جائیں — آنکھیں اِنتظار سے عاری نہ ہوں —دِل احساس سے خالی نہ ہو۔ عقل کو عقلِ سلیم بننے میں کسی رکاوٹ سے دوچار نہیں ہونے دینا چاہیے۔ جب اِنسان نصیحت سننے پر آمادہ ہو جائے تو اُسے بہتی ہوئی ندیوں میں کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں گی— نصیحت ہی نصیحت !!

ندی راز ہے —گہرا راز — پہاڑ کا پیغام — سمندر کے نام — رواں دواں اپنی منزلِ مراد کی طرف— نصیحت ہے اُن لوگوں کے لیے جو اُولی الالباب ہیں۔ ندی ہی پر موقوف

نہیں، پہاڑ بھی انسان کے لیے ایک نصیحت آموز داستان رکھتے ہیں — ایک عزم — ایک قوت — ایک داستانِ دلبری! پہاڑوں میں نصیحتیں ہیں، بادلوں میں نصیحتیں ہیں — زمین کے اندر نصیحت، زمین سے باہر نصیحت — درختوں میں زبانیں ہیں — گویائی ہے — نصیحت ہے — جلوہ ہے، جلوہ گر بھی ہے — !!

زمین کے اندر نصیحت کی ایک داستانِ دلپذیر میر تقی میرؔ نے ایک رباعی میں پیش فرمائی ہے کہ پرانے قبرستان میں ایک کاسۂ سَر پر پاؤں جا پڑا — بس ٹوٹ گیا — اور ساتھ ہی یہ آواز آئی —

آئی صدا کہ دیکھ کے چل راہ ، بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

لیکن اِس سے بھی زیادہ اثر انگیز بیان بابا فریدؒ کے ایک اشلوک میں ہے۔ جس کے پیچھے ایک کہانی ہے جو کچھ یوں سی ہے۔ ایک دفعہ بابا جی فریدؒ اپنے سیلانی دَور میں ایک بستی میں سے گزرے۔ دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت ایک غریب عورت کو مار رہی ہے۔ بابا جیؒ نے وجہ دریافت فرمائی۔ اطلاع ملی کہ یہ اَمیر عورت ایک عشرت گاہ کی مالکہ ہے اور غریب اس کی ملازمہ — بلکہ مشّاطہ — اُس دن نوکرانی نے مالکن کو کاجل ڈالا اور اُس کے ساتھ کوئی ریت کا ذرّہ بھی تھا جو اُس کی خوبصورت آنکھوں میں بڑا تکلیف دہ لگا۔ اِس لیے اُس نے خادمہ کو مارا۔ بابا جیؒ اپنے سفر پر گامزن ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا اور اُسی بستی کے قبرستان میں قیام کے دوران بابا جیؒ نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک چڑیا نے ایک انسانی کھوپڑی میں اپنے بچے دیے ہوئے تھے۔ وہ چڑیا آتی اور چونچ میں خوراک لا کر بچوں کو کھلاتی، بچے کھوپڑی کی آنکھوں سے باہر منہ نکالتے اور خوراک لے کر اندر چلے جاتے۔ انسانی کھوپڑی کا یہ مصرف بابا جی کو عجیب سا لگا۔ انہوں نے یہ دیکھنے کے لیے مراقبہ کیا کہ یہ کھوپڑی کس آدمی کی ہے۔ انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو اُسی خوبصورت عورت کی ہے جو آنکھ میں ریت کا ذرّہ برداشت

نہ کرتی تھی — آج اُس کی آنکھوں میں چڑیا کے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ باباجیؒ نے اشلوک کہا:

جن لوئیں جگ موہیا سو لوئیں میں ڈِٹھ
کجرا ریکھ نہ سہندیاں تے پنچھی سوئے بِٹھ

(جو آنکھیں جگ کو موہنے والی تھیں، آج میں نے وہ آنکھیں دیکھ لیں — کاجل میں ریت کا ذرّہ برداشت نہ ہوا، آج پنچھی کے بچے اُسی آنکھ میں بیٹھے ہیں۔)

بہرحال نصیحت ہر طرف لکھی گئی ہے — ہر سانس نصیحت — ہر جلوہ نصیحت — تنہائی نصیحت، محفل نصیحت — ذرّہ ذرّہ اور قطرہ قطرہ نصیحت۔ قبول کرنے والا ہو تو عطا کرنے والا دُور نہیں۔ ذوقِ سجدہ مل جائے تو آستانۂ مسجود پاس ہی ہے — آنکھ منتظر ہو تو جلوہ بے تاب ہو کر سامنے آئے گا — خبر دینے والا ایک بڑی خبر لے کر پھر رہا ہے — آپ کے لیے، آپ کے فائدے کے لیے — آپ کی بچت کے لیے! مخبر کا انتظار کرو — آپ میں سے ہی آپ کے آس پاس آپ جیسا انسان، کوئی انسان، نہ جانے کب کہاں بولنا شروع کر دے — سماعت متوجہ رکھو — آپ کے اپنے ہی اندر سے آواز آسکتی ہے۔ دوسروں کی خامیوں پر خوش ہونے والو —! کوئی اپنی خوبی ہی بیان کرو! اِسلام سے محبّت کرنے کا دعویٰ کرنے والو —! مسلمانوں سے نفرت نہ کرو! آپ کی آنکھ میں کھٹکنے والے خار کسی اور نگاہ کے منظورِ نظر بھی ہو سکتے ہیں۔ نصیحتوں پر ناراض نہ ہونا چاہیے — بندر اور انسان کا فرق قائم رکھنا چاہیے —!!

ضمیر کی آواز

ضمیر کی آواز نہ تو ظاہری زبان سے دی جاتی ہے اور نہ ہی اِن کانوں سے سنائی دے سکتی ہے۔ یہ آواز بہت دُور سے آتی ہے اور بہت قریب سے سنائی دیتی ہے—ایسے جیسے ہمارے اندر سے کوئی بولتا ہے۔ کسی نے ضمیر کی صورت نہیں دیکھی، اِس کی آواز ہی سُنی گئی ہے۔ شاید یہ آسمانوں سے آنے والی ہاتف کی صدا ہے، جو ہمیں ہماری آلائشوں اور غفلتوں سے نجات دینے کے لیے آتی ہے۔ ہمیں اخلاقی آلودگی سے بچانے کے لیے یہ آواز پُراَسرار راستوں سے ہوتی ہوئی دِل کے کانوں میں گونجتی ہے۔ کبھی کبھی ہمدرد اور شفیق دوست کی طرح اور کبھی کبھی ایک جرنیل کے حکم کی طرح یہ آواز اپنا کام کرتی ہے۔ یہ آواز ہمارے لیے اُن راستوں کو روشن کرتی ہے جو نفس کی اندھیر نگری میں گم ہو جاتے ہیں۔

ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارا قیام عارضی ہے، ہمارا وجود ہمیشہ موجود نہیں رہ سکتا۔ یہ آواز بلکہ صرف یہی آواز، صدائے جرس ہے، ناقوسِ وقت ہے، بانگِ درا ہے —ایک وارننگ ہے کہ اگر منزل پر نگاہ نہ رکھی گئی تو گردِ راہ میں کھو جانے کا خطرہ موجود رہے گا۔ ہم خوش فہمیوں اور خوش گپیوں میں اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ انجام نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ضمیر کی آواز اِس خوابِ گراں سے بیدار کرتی ہے —ہمیں نشانِ منزل سے تعارف کرواتی ہے۔

یہ آواز ہمارے لیے ہدایت کا چراغ ہے۔ ایک مخلص دوست، ایک نڈر ساتھی —

جو ہمیں ہمارے مرتبوں، ہمارے خوشامدیوں اور خوشہ چینوں کی اصل حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ ضمیر کی آواز ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے مرتبے اور دبدبے سب عارضی ہیں۔ ہم فرعونِ وقت بننا چاہتے ہیں۔ ضمیر کی آواز فرعون کی عاقبت سے تعارف کرواتی ہے۔

ضمیر کی آواز پر کان نہ دھرنے والے بڑے بڑے محلّات میں رہنے کے باوجود اپنے پیچھے ویرانیاں چھوڑ گئے — بڑے بڑے ظلِ سبحانی رخصت ہو گئے، فانی ہو گئے، آنجہانی ہو گئے۔ جو لوگ زندگی میں اِنسان کو اِنسان نہ سمجھتے تھے، اِنسان کے بچوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے تھے، آخری وقت میں پکار اُٹھتے ہیں کہ کاش ہم مٹی ہوتے — کاش ہم اپنے سے مختلف ہوتے — کاش ہم مرتبوں پر مغرور نہ ہوتے — لیکن کاش تو بس کاش ہی رہتا ہے۔ کاش کہنے سے علاج تو نہیں ہوتا — زندگی دوبارہ تو نہیں ملتی۔

زندگی کے مختلف اَدوار میں ضمیر کی آواز مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچتی ہے، لیکن ہم ہیں کہ "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" — ہم پر اثر ہی نہیں ہوتا۔

ایک بچے کے لیے ضمیر کی آواز بس ماں باپ کی آواز کہی جا سکتی ہے۔ وہ شفیق آواز جو محبّت کی حلاوت لیے ہوئے، بچے کو آمادۂ سفر کرتی ہے — اُسے راہ کی دُشواریوں سے آگاہ کرتی ہے۔ علم کی منزل، کردار و اخلاق کی منزل کی طرف گامزن کرتی ہے۔ والدین اولاد کو نیک اور کامیاب راستوں کا مسافر بنانا چاہتے ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً اولاد کو جھنجھوڑ کر جگاتے ہیں کہ وقت — بلکہ زندگی، کیونکہ وقت ہی زندگی ہے — رائیگاں نہ گزر جائے۔

رفتہ رفتہ ماں باپ کی آواز میں اساتذہ کی آواز شامل ہو کر ایک نیا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ضمیر کی آواز میں نکھار آ جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں سر پر ایک اَبرِ سایہ دار و گُہر بار ہو — یہ آواز بڑی غمگسار ہوتی ہے — خدا کی آواز اِنسانوں ہی کے ذریعے سے تو آتی ہے۔

پیغمبروں کے بعد سب سے بڑا رُتبہ ماں باپ اور اساتذہ کا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ

حضرت اویس قرنیؓ نے حضورﷺ کی زیارت کا قصد کیا۔ ماں سے نیک سفر پر جانے کی اِجازت چاہی۔ ماں نے کہا: ”بیٹا! اگر حضورﷺ مسجد میں تشریف فرما ہوں تو زیارت سے فیض یاب ہونا“۔ اویس قرنیؓ نے ایک طویل سفر کیا — پیدل — حضورﷺ مسجد میں نہ تھے۔ اویس قرنیؓ ماں کے حکم کے مطابق واپس چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد پھر قصدِ زیارتِ نبیﷺ کیا۔ ماں نے کہا: ”بیٹا! حضورﷺ گھر پر تشریف رکھتے ہوں تو زیارت سے نصیب کو سرفراز کر لینا“۔ اتفاق یوں ہوا کہ حضورﷺ مسجد میں جلوہ افروز تھے۔ اویس قرنیؓ واپس آ گئے اور یوں زندگی میں ظاہری ملاقات نہ ہو سکی، لیکن ماں کے حکم کی بجا آوری کا انعام یہ ملا کہ آپؓ کو باطنی زیارت، بلکہ ہمہ حال زیارت سے فیض یاب کیا گیا اور حضورِ اکرمﷺ کا خرقہ مبارک اویس قرنیؓ ہی کو عطا ہوا۔ ماں باپ کے حکم کی اِطاعت حضورﷺ کے فرمان اور اللہ کے فرمان کے عین مطابق ہے۔

والدین کی آواز میں ضمیر کی آواز کا ہونا لازمی ہے۔ ماں باپ کی آواز کے بعد ہمیں ضمیر کی آواز کسی مخلص دوست کی گفتگو میں سنائی دیتی ہے۔ مخلص دوست ہمیں ہماری خامیوں سے آشنا کرواتا ہے، ہمیں ہماری غلط روی سے روکتا ہے — ہمیں غرور کے گھوڑے پر سوار ہونے سے باز رکھتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ آسمانوں پر نگاہ کرتے وقت یہ نہ بھُولنا چاہیے کہ پاؤں زمین پر ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں مخلص دوست کا ساتھ میسّر ہو — خوشامدیوں کے سنہرے جال سے بچانے والا — نخوت و نفرت کی بدبختیوں سے دُور رکھنے والا — اللہ کی رحمت کا سفیر — مخلص دوست — ضمیر کی آواز کا مظہر!!

اگر شومئ قسمت، مخلص دوست بھی میسر نہ ہو تو ضمیر کی آواز حاصل کرنے کا ذریعہ آئینہ ہے۔ آئینے کے رُوبرو ہو کر ہم اپنے ہی تو رُوبرو ہوتے ہیں۔ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ ہمیں ہمارا ہی تو چہرہ دِکھاتا ہے — اصل چہرہ — لبادے اور نقاب سے آزاد۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان جب آئینہ دیکھنے میں محو ہو، عکسِ آئینہ بولتا ہے — ہمکلام ہوتا ہے —

خطاب کرتا ہے — نصیحت کرتا ہے کہ آج تیرے سر کو غرورِ تاجوری ہے، کل تیرے سر پر شورِ نوحہ گری ہو گا — زمین پر اِترا کر نہ چل — تیرا اَصل ٹھکانا تیرے پاؤں کے نیچے دو گز زمین کے اندر ہے — کیا تیرا فخر اور کیا تیرا افتخار —!! عکسِ آئینہ بڑے راز اور بڑے کام کی چیز ہے۔ یہ ضمیر کی آواز کا پیکر ہے۔

ضمیر کی آواز کو سُننا، اُسے پہچاننا، اُس پر عمل کرنا بڑے نصیب کی بات ہے۔ ضمیر کی آواز سے آشنا لوگ ہمیں بتاتے ہیں کہ ضمیر ہی ہمارے اعمال کی اصلاح کرتا ہے — ہمیں حق سچ کا راستہ بتاتا ہے۔ ضمیر کی آواز زندگی کے کامیاب راستوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ یہی وہ آواز ہے جو تاریکیوں میں ہدایت اور نُور کے چراغ روشن کرتی ہے۔ انسان کو نفسِ امّارہ کے شکنجے سے آزاد کروانے والی آواز ہی ضمیر کی آواز ہے۔ یہی آواز حلال و حرام میں تمیز سکھاتی ہے۔ ہم مجبوری کا بہانہ بنا کر جرم و گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ضمیر کی آواز ہمیں تاریک راہوں سے نکالتی ہے، ہمارے دِل میں خوفِ خدا ڈالتی ہے۔ یہ آواز ایک صحیفے کی طرح نازل ہوتی ہے — ہمیں بے راہ اور گم راہ ہونے سے بچاتی ہے۔ یہ آواز — ہنگامِ آلام اور ہنگامہ ہائے سُود و زیاں میں مایوس نہ ہونے کا پیغام دینے والی آواز — رحمتِ حق کی نوید ہے — خبردار! میری رحمت سے مایوس نہ ہونا، یعنی اپنے مستقبل سے مایوس نہ ہونا۔

ضمیر کی آواز ہمارے ہی باطن کی جلوہ گری ہے — ہمارے نصیب کی محافظ آواز۔ ضمیر کی بھی کئی قسمیں ہیں — انفرادی ضمیر، گروہی ضمیر، قومی ضمیر، ضمیرِ مِلّت، ضمیرِ اُمّت، بلکہ "ضمیرِ اُمّتاں"۔

مثنوی مولانا رومؒ انفرادی ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے اکسیر ہے، کیمیا ہے۔ عشق کو زندگی دینے والی کتاب — مثنوی، اور اگر عشق زندہ ہو تو نفس کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی ضمیر کی آواز کا کرشمہ ہے۔ اقبالؒ نے ضمیرِ قوم کو بیدار کیا۔ قوم میں وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار پیدا کر کے ایک نئی منزل کا شعور اور حصول بخشا۔ ایسے اِنسان خود ہی قوم کا ضمیر ہوتے ہیں۔ اِن کی

آواز پر چل کر نئی منزلوں سے ہمکنار ہونا ممکن ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے دُعا کی ہے کہ یا الٰہی! میرے بعد کوئی دانائے راز اگر آئے تو اُسے نسیمِ حجاز سے سرفراز کرنا، اُسے دلِ گداز عطا فرمانا، اُسے "ضمیرِ اُمّتاں" کو پاک کرنے کی توفیق عطا فرمانا، اُسے کلیمی عطا کرنا، اُسے حِکمت سے بہرہ ور کرنا —یا الٰہی! آنے والے کو نَے نوازِ دَوراں بنانا۔

ایسے انسان قوموں کے لیے خوش نصیبی کا پیغام لاتے ہیں۔ وہ ضمیر کو زندہ کرتے ہیں —عارضی منفعت سے نظر ہٹا کر ایک دیرپا، باقی رہنے والی حیات کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

آج کا اِنسان مصروف ہے۔ کسی ضمیر کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ وہ مال گننے اور جمع کرنے کے شغل میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اگر اُس سے خدا پوچھے کہ تمہیں دوزخ میں بھیجوں یا جنّت میں، تو اُس کا جواب ہو گا: "جہاں دو پیسے کا فائدہ ہو، وہاں بھیج دو"۔ ایسے آدمی کے لیے ضمیر کی آواز کیا کرے—؟

ضمیر کی آواز پھر بھی بدستور پکار پکار کر کہہ رہی ہے—لوگو! حق سے زیادہ نہ لو، تاکہ محروم کو بھی اُس کا حق مِل سکے—تم بچوں کو مالِ حرام کِھلاتے ہو یا اُنہیں آگ کا لقمہ دیتے ہو—معصوموں کے ساتھ ظلم نہ کرو—اپنے بچوں کو رشوت کا مال کِھلا کر ہلاک نہ کرو—تم جس کام کے لیے ملازم رکھے گئے ہو، اُسے ایمانداری سے کرو—اِستحقاق کی بات کرتے ہو، فرائض کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟

یہ ملک لاکھوں جانوں کی قربانی سے بنا ہے۔ قوم کو ایک اعلیٰ زندگی عطا کرنے کے لیے یہ ملک حاصل کیا گیا—لیکن افسوس! چند ہوس پرست، جونکوں کی طرح اِس کا خون چوس رہے ہیں۔ کسی غریب کو کیا فرق پڑتا ہے اگر اس پر ہندو ظلم کرے یا اس پر مسلمان ظلم کرے۔ غور کرنے کا وقت ہے—سنجیدگی اختیار کرنے کا لمحہ ہے۔

اگر ضمیر کی آواز پر کان نہ دھرا تو خاکم بدہن—مسجدِ قرطبہ—خدا نہ کرے۔ ضمیر زندہ رہا تو فرد زندہ رہا۔ فرد زندہ ہے تو قوم زندہ ہے اور قوم زندہ ہے تو ملک سلامت ہے۔

خدا ہمیں بیدار بخت اور بیدار ضمیر بنائے! مُردہ ضمیروں نے ہمیں پہلے ہی بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مُردہ ضمیر وہ ہے جو ملک و قوم کے نقصان کی پرواہ کیے بغیر اپنی منفعت کی فکر کرے۔ اگر معاشرے میں باضمیر پیدا ہو گئے تو مُردہ ضمیر ویسے ہی رُوپوش ہو جائیں گے۔ حق آئے گا تو باطل جائے گا۔

ضمیر کی آواز خلاؤں میں موجود رہتی ہے۔ ہم کثیر المقصدیت کا شکار ہیں۔ ہم ایک سے زیادہ زندگیاں رکھتے ہیں۔ ہم ایک سے زیادہ اموات کا ذائقہ چکھیں گے۔ ہمیں غور کرنا چاہیے۔ ضمیر کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں کم اَز کم محسنوں کے ساتھ وفا کرنی چاہیے۔ ضمیر کی آواز کا یہی پیغام ہے کہ یہ ظاہری شان و شوکت واہمہ ہے —لباس کے اندر ہر آدمی ایک ہی آدمی ہے —اور وہ وقت دُور نہیں ہے جب یہ وقت ختم ہو جائے گا— ضمیر کے باغی خاک ہو جائیں گے اور ضمیر کی آواز پر چلنے والے کامران و سرفراز رہیں گے۔

محنت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اے اِنسان! تُو محنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ پس اپنے ربّ کے راستے کی طرف محنت کر! یہ بات طے شدہ ہے کہ اِنسان جس کے پاس اشرف ہونے کا لقب ہے، اُسے محنتی بنایا گیا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرے گا اور کچھ نہ ہوا تو غلطی کرے گا۔ کام کے لیے محنت کرے گا اور کبھی کبھی تو بیکار رہ کر بھی محنت کرے گا۔

بیکاری پر بیماری سے زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے، بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ بیکار آدمی سب سے زیادہ محنت کرتا ہے۔ کام کو ذریعۂ معاش بنانے کا طریقہ تقریباً ہر ایک کو معلوم ہے، لیکن بیکار رہ کر زندہ رہنے کا طریقہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اِن میں کچھ لوگ مانگ کر گزارہ کرتے ہیں، لیکن یہ کام بھی آسان نہیں ہے۔ بہر حال اِنسان محنت کے لیے ہے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر طرف اِنسان کی محنت کے جلوے ہیں۔ اِنسان نے زمین کو سنوارا ہے۔ اُس نے بڑی محنت سے، مسلسل محنت کے ساتھ، محنتِ شاقّہ کے ساتھ شہر بسائے ہیں۔ اِنسانی زندگی اِنسانوں ہی کی محنت کے بنائے ہوئے راستوں پر گامزن ہے۔

اِنسان نے پہاڑوں پر بستیاں بنائیں۔ صحراؤں میں اُس نے اپنے مسکن تلاش کیے۔ اُس نے سمندر کے اندر راستے بنائے۔ اِنسان کی محنتیں ہر طرف آشکار ہیں۔ سائنس ہو یا آرٹ کی دنیائیں، سب اِنسان کی محنت کی رہینِ منّت ہیں۔ اِنسان کے اندر یوں لگتا ہے جیسے پارہ ہے،

اُسے قرار نہیں۔ وہ سوچتا ہے، محنت کرتا ہے، فاصلے طے کرتا ہے۔ وقت کے فاصلے ہوں یا زمین و آسمان کے فاصلے، اُس نے اپنی محنتوں سے یہ فاصلے طے کیے ہیں۔

شاید اِنسان کی خواہش اُس کی محنت کا باعث ہے۔ خواہش اِنسان کو دوڑاتی ہے اور آرزو کے تجویز کردہ راستوں پر اِنسان محنت کرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ ماہیتِ اَشیاء جاننے کے لیے محنت کرتا ہے۔ غاروں میں چھپے ہوئے راز دریافت کرتا ہے۔ سمندروں کے چھپے ہوئے خزانے نکالنے کے لیے محنت کرتا ہے۔ اُس کے سامنے ایک بہت بڑی دنیا ہے، پھیلی ہوئی دُنیا، جو اُسے دعوت دیتی ہے کہ دُنیا کو دریافت کیا جائے، اِسے حاصل کیا جائے اور اِنسان اِس کام کے لیے محنت کرتا چلا آرہا ہے۔

اِنسان اپنی محنت سے اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے اور کبھی کبھی اپنی محنت سے دُوسروں کی محنت کے انعام چھینتا ہے۔ محنت کرنا اِنسان کی جبلّت ہے۔ اُس کے اندر کشمکش ہے اور وہ باہر کشمکش پیدا کرتا ہے۔ سراغِ ہستی کی دریافت ایک کٹھن کام ہے۔ یہ ایک چیلنج ہے اور اِنسان اِس چیلنج کو قبول کرنا جانتا ہے۔ راز دریافت کرنے کے لیے اِنسان نے کئی کئی سال محنت کی۔ کئی کئی نسلیں محنت کرتی رہیں۔ محنت کرتے ہوئے کئی زمانے اور کئی جگ بیت گئے، تب کہیں جا کر وہ گوہرِ مقصود ملا۔ وہ گوہرِ مقصود اگر کوئی فانی شے ہے تو محنت رائیگاں ہے۔ اِس دنیا میں جہاں محنت نے بڑے بڑے کرشمے سرانجام دیے ہیں، وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ محنتیں رائیگاں ہو گئیں—اُن کے لیے افسوس!

اِنسان کی پیدائش سے پہلے اِبلیس نے اپنے تکبّر کی وجہ سے اپنی صدیوں کی محنت کو خود ہی رائیگاں کر لیا۔ اُس کو افسوس تک نہ ہوا۔ اُسے معافی کا راستہ نہ سوجھا اور وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اِنسان کو اللہ نے معافی کا راستہ بتایا ہوا ہے۔ اِنسان اپنی رائیگاں ہونے والی محنتوں پر افسوس کرے تو اُس کو محنت کے لیے نئے راستوں سے تعارف ہو سکتا ہے۔ اپنی محنت کی قدر و حفاظت نہ کی جائے تو سب محنت رائیگاں ہے۔ اِرشاد ہے کہ افسوس ہے اُس بُڑھیا پر، جس نے تمام عمر

سُوت کاتا اور آخر میں اُسے اُلجھا دیا۔

وہ لوگ جنھوں نے باطل کے راستوں پر محنت کی، اُن کی محنت اُن کے لیے ندامت کے علاوہ کیا لائی؟ محنت کرنا تو اِنسان کی سرشت میں ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ وہ کس کام کے لیے محنت کرتا ہے۔ ویسے تو ایک جواری بھی جُوا خانے میں محنت کرتا ہے۔ وہ اپنے ہارے ہوئے مال کی برآمدگی کے لیے محنت کرتا ہے اور اپنا پیسہ، وقت اور عاقبت برباد کر بیٹھتا ہے۔

اِسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ طالب علم جو سیاستدانوں کے لیے محنت کرتے ہیں، اپنی عمر اور ماں باپ کا پیسہ ضائع کرتے ہیں۔ امتحان میں ناکامی لے کر گھروں کو واپس لوٹتے ہیں۔ اُن کی محنت نے رائیگاں ہو کر اُن کے لیے ندامت لکھ دی۔

کارآمد کیا ہے اور رائیگاں کیا ہے؟ اِس کا فیصلہ صرف وہی طاقت کر سکتی ہے جس نے اِنسان کو پیدا کیا، اور اُس طاقت کا ارشاد ہے کہ اے اِنسان! اپنے ربّ کی طرف محنت کر! ربّ کی طرف محنت کیا ہوتی ہے؟ ربّ کی طرف محنت، ربّ کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبر ﷺ کے راستے پر چلتے رہنے کا نام ہے۔ جو لوگ بے جہت اور بے سمت محنتیں کرتے ہیں، اُن کے لیے کیا انجام ہو سکتا ہے! گناہ گار کی محنت کا انجام تکمیلِ گناہ ہے اور تکمیلِ گناہ ہی اِنسان کی عاقبت خراب کرنے کے لیے کافی ہے۔ اِن محنتوں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو پھر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اِنسان نے باغی رستوں پر جو محنت کی ہے، اُس کا ریکارڈ اِسی دُنیا کے عبرت کدوں میں محفوظ ہے۔ ویرانیاں چھوڑ جانے والی محنت پر افسوس ہوتا ہے، اور اِس کے برعکس وہ لوگ جنھوں نے ربّ کے راستے کی طرف محنت کی، وہ مرنے کے بعد بھی سرفراز ہیں۔ اُن کے آستانے، اُن کے مزار، اُن کی تصانیف اور اُن کے ملفوظات آنے والی نسلوں کے لیے مینارۂ نور کا کام دیتے ہیں۔ وہ آنے والی نسلوں کو بتا گئے کہ محنت وہی ہے جو ربّ کی طرف ہو۔ یوں تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ مصروفِ محنت ہے اور محنت کرتے کرتے اِنسان بدنامی کما لیتا ہے، ناکامی کماتا ہے، عبرت ناک انجام کماتا ہے اور ایسی موت حاصل کرتا ہے جو دیکھنے والوں کے

لیے عبرت ہوتی ہے۔ جتنے لوگ دُنیا میں سرفراز ہوئے، وہ سب وہی تھے، جو حکم اور اَمر کے اندر رہ کر محنت کرتے رہے۔ وہ آہستہ آہستہ لیکن یقین کے ساتھ اپنی محنتوں کو دِین اور دُنیا کی کامیابی کے لیے استعمال کرتے رہے۔

محنت ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اِنسان کے پاس اُڑنے کے لیے پَر نہیں ہیں لیکن محنت کے ذریعے اُس نے بلند پرواز پرندوں کے صرف نشیمن ہی سر نہیں کیے، بلکہ اُن کی پرواز کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ محنتی اِنسان ایک ایک قدم چل کر پہاڑ کی چوٹیوں پر پہنچا۔ دن رات کی محنت سے اُس نے مخفی کو آشکار کیا۔

یہ اِنسان اگرچہ خود ایک بہت بڑا راز ہے لیکن اِس کو راز دریافت کرنے کا شوق ہے۔ اِنسان صرف یہی نہیں کہ بے جان دُنیا سے آشنا ہے، بلکہ جمادات، نباتات اور حیوانات کے دِل کا راز بھی جانتا ہے۔ ذرّے کا جگر چیر دیتا ہے اور ایٹم کے اندر چھپی ہوئی طاقت کو دریافت کر لینے کا سہرا اِنسان کی محنت کے سر ہے۔

اِنسان کی محنت کے جتنے بھی قصیدے لکھے جائیں، کم ہیں لیکن وہ محنت جو کسی کے کام نہ آئے اُس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے، کم ہے۔ وہی محنتیں کامیاب ہوئیں جو اِنسان کی فلاح کے لیے کی گئیں، اِنسان کی خدمت کے لیے کی گئیں، اِنسان کو سکون پہنچانے کے لیے کی گئیں، اِنسانی زندگی کو ایک خوبصورت زندگی بنانے کے لیے کی گئیں، اور وہ محنتیں جو اِنسان کا سکون برباد کرنے کے لیے کی گئیں، جن کے ذریعے بحر و برّ میں فساد مچا، جن کے پیچھے طاغوت کارفرما تھا اور جن کے پیچھے اِنسانی نفس تھا، اُس کی اَنا تھی — وہ غلط روی کی محنتیں اِنسان کے چہرے پر سیاہی لکھ گئیں۔

مبارک ہیں وہ محنتیں، جن کو قبولیت کی منزل ملی۔ ایسی محنتیں اِنسان کو شرف عطا کرتی ہیں۔ اپنی شہرت کے لیے کی جانے والی محنت انجامِ کار اِنسان کے لیے افسوس پیدا کرتی ہے۔ زندگی دوبارہ نہیں ملتی اور اِنسان کے پاس غلطیوں کی اصلاح کا وقت بھی نہیں ہوتا۔ ایک

ہی دفعہ سوچ سمجھ کر محنت کا آغاز کرنا چاہیے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایسے جاننے والے سے پوچھ کر محنت کی جائے جو محنت اور محنت کے انجام کے رشتوں سے باخبر ہو۔ اُس سے اپنی محنت کی سمت دریافت کرنا چاہیے۔ اگر سمت صحیح ہو جائے تو کامیابی اور ناکامی دونوں میں اِنسان کا بھلا ہے — مقصد اُس سمت کا ہے۔ اگر اللہ کی جانب جانے والی راہ ہماری محنت کا مدعا ہے تو اِس راہ میں مر جانا بھی شہادت ہے۔ اِس راہ میں ہر مقام ایک منزل اور ہر منزل ایک مقام ہے۔ بے حد کی راہ اُتنی ہی بے حد ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو دُنیا میں نمایاں ہوئے، جنہوں نے نیکی کے راستے پر چراغ جلائے، جنہوں نے آنے والے زمانوں کے لیے نشانیاں چھوڑیں، وہ لوگ کتنے محنتی تھے۔ جب دُنیا سو رہی ہوتی تھی، یہ لوگ جاگتے تھے — اپنی راتوں کو آہِ سحر گاہی سے منوّر کرتے اور اللہ کے فضل کے سہارے مانگتے اور دُعائیں کرتے کہ اے اللہ! ہمیں رائیگاں ہونے والی محنتوں سے بچا — اور اللہ اُن کو عطا فرماتا، اپنے راستوں کا شعور اور اُن پر نازل فرماتا، اپنے کرم کی بارش اور اُن کو عنایت فرماتا اُن کے راہنما جو اُن کا ہاتھ پکڑ کر منزل تک پہنچاتے۔ یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ عطارؒ، رومیؒ، رازیؒ، غزالیؒ، جامیؒ، خسروؒ اور اقبالؒ سب آہِ سحر گاہی کے کرشمے ہیں — اور آہِ سحر گاہی محنتوں کی انتہا ہے۔ گناہ کی تلاش میں محنت کی بجائے گناہ سے بچنے کے لیے محنت کی جائے تو اُس کا انجام کچھ اور ہی ہے۔ یہی فضل ہے کہ ہمیں منظور ہونے والی اور مقبول ہونے والی محنت کا شعور مل جائے، ورنہ محنت کرنا سرشت تو ہے ہی — بے شعور محنت کس کام کی!!

کتنے لوگ محنت کرتے ہیں اور جنہیں خبر نہیں کہ وہ کیوں محنت کر رہے ہیں۔ وہ مشین ہیں، روبوٹ ہیں اور جنہیں معلوم نہیں کہ کس نے اُنہیں ناکام اور نامراد منزل کی طرف گامزن کر دیا۔ وہ ہنستے گاتے اور محنت کرتے کرتے جہنّم واصل ہو جاتے ہیں۔

جہنّم میں جانے والے کم محنت نہیں کرتے۔ بس فرق یہ ہے کہ اُنہیں اُن کی محنتوں نے برباد کر دیا، اور اِس کے برعکس سرشاریٔ جنّت حاصل کرنے والے لوگ ایک ضابطے کے

اندر رہ کر محنت کرتے ہیں اور اُن پر اِنعامات کی بارش ہوئی۔

اللہ کے ذکر کے لیے محنت کرنے والے، مذکورِ ذاتِ حق ہو گئے۔ خدا کے راستوں کی طرف بلانے والے خود خدا کا راستہ ہو گئے۔ توحید بیان کرنے والے، رسالت بیان کرنے والے، صداقت بیان کرنے والے، اُس بیان کا حصہ بن گئے۔ اُن کے نقشِ قدم وقت نے محفوظ کر لیے۔ اُن کے آستانے آباد رہ گئے۔ ہر زمانے میں اُنہی کے جلوے رہے۔ حکومتیں آتی ہیں، چلی جاتی ہیں۔ بادشاہ آتے ہیں، بدل جاتے ہیں۔ چراغاں کرانے والے تاریکیاں چھوڑ کر رُخصت ہو جاتے ہیں۔ کتنے ظلِّ سبحانی آئے، اپنا حکم نافذ کرنے کے لیے محنت کرتے رہے اور آخرِ کار فنا کی پستیوں میں غرق ہو گئے۔

درویش لوگوں نے اللہ کی طرف محنت کی، اُس کے راستوں پر چراغ جلائے۔ اُس کے راستوں پر چلنے والی سنگتیں تیار کیں۔ اُس کے راستوں کو آسان بنایا۔ وہ لوگ رہتی دُنیا تک نیک نامی کی آغوش میں رہیں گے۔

زمانے بدل جائیں — صدیاں بیت جائیں — درویش کا آستانہ، اُس کی رونقیں اور برکتیں ختم نہ ہوں گی۔ یہ اللہ کریم کا اِحسان ہے کہ اپنی راہ پر محنت کرنے والوں کو اپنی راہ کی آسانیاں اور اپنی راہ کے جلوے عطا فرماتا ہے۔ وہ اُن لوگوں کی سرپرستی فرماتا ہے، وہ اُن لوگوں کو آمادۂ سفر کرتا ہے، اُن لوگوں کے سفر میں اپنی عنایات کو شریکِ سفر رکھتا ہے اور اُن کو اپنے قرب کی منزل عطا فرماتا ہے۔ یہ محنت سرفراز کرتی ہے۔

کیا یہ مناسب نہیں کہ اِنسان اپنی محنت کے مقاصد سے باخبر ہو، اِس میں اصلاح کرے اور اپنی محنت کا قبلہ درست کرے۔ اِس دُنیا میں سب سے زیادہ مقبول محنت اُس ہستی کی ہے، جو سب سے زیادہ مقبول ہے۔ جن کی شان میں اپنے تو اپنے، بیگانے بھی نعت کہتے رہے ہیں۔ ہر وہ محنت جو آپ ﷺ کے دامن سے وابستہ کرے، مبارک ہے اور ہر وہ محنت جو آپ ﷺ کے قرب سے محروم کرے، بُولہبی ہے۔

نیکی کا راستہ محنت کا راستہ ہے۔ نیکی کو روکنے کا راستہ بھی محنت کا راستہ ہے، لیکن انجام کا فرق جنّت اور دوزخ کا ہے۔ محنت کے نتیجے میں اتنا بڑا فرق!— کیا قابلِ توجہ نہیں؟ انسان آنکھوں پر پٹی باندھ کے مشین کی طرح محنت کرتا جائے تو اِس کا نتیجہ وہی ہو گا جو ایک مشین کا ہوتا ہے۔ پیسہ کمانا، پیسہ گننا، پیسہ جمع کرنا، بڑا محنت طلب کام ہے اور یہ بڑے ہی عذاب کا باعث ہے۔ محنت وہ، جو مالک کی مرضی کے مطابق ہو۔ کوشش وہ، جو زندگی دینے والے کی منشا کے مطابق ہو۔

خدا کرے کہ ہم لوگ اپنی محنتوں کا چہرہ بھی دیکھیں اور محنتوں کے انجام کا چہرہ بھی دیکھ لیں۔ اِس مختصر زندگی میں یہ چھوٹا سا کام کرنا بہت ضروری ہے۔ محنت اگر آسمانوں کو مسخر کرلے تو بھی اِتنی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ محنت کے ذریعے اِنسان دِل کی دُنیا کا رستہ دریافت کرے، اور یہ کام اللہ کے فضل سے ہو گا— کیونکہ دِل ہی اللہ کا راز ہے۔ اللہ کا راستہ مومن کے دِل کے دروازے سے شروع ہوتا ہے۔

فطرت

اگر کوئی کہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا، تو اِسے مانا جاسکتا ہے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ کسی انسان نے اپنی فطرت بدل لی ہے، تو اِسے نہیں مانا جاسکتا۔ انسان اپنا بہت کچھ بدل سکتا ہے، حتیٰ کہ شکل بھی تبدیل کر سکتا ہے لیکن وہ فطرت نہیں بدل سکتا۔ انسان کی فطرت اُس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی تشکیل پا چکی ہوتی ہے، اور پھر وہ اپنی اِس تشکیل کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے — ایسے، جیسے وہ اِس فطرت میں ہی رہن رکھ دیا گیا ہو۔

انسان تبدیلی پسند ہے — وہ بدلتا رہتا ہے۔ لباس بدلتا ہے۔ اپنے سماجی، اخلاقی اور سیاسی کردار بدلتا ہے۔ مکان اور شہر بدلتا ہے، دوست اور دشمن بدلتا ہے — لیکن وہ جو کچھ بھی کرے، اپنی فطرت نہیں بدل سکتا۔ کہتے ہیں کہ اگر ہزاروں من چینی بھی ڈال دی جائے تو کڑوا کنواں میٹھا نہیں ہوسکتا۔ پانی کا اصل ذائقہ اُس کی فطرت ہے۔ ہم اسے ہزار رنگ دیں، یہ اپنی فطرت پر رہتا ہے۔

ایک دفعہ ایک گِدھ اور ایک شاہین بلند پرواز ہوگئے۔ بلندی پر ہوا میں تیرنے لگے۔ وہ دونوں ایک جیسے ہی نظر آ رہے تھے — اپنی بلندیوں پر مست، زمین سے بے نیاز، آسمان سے بے خبر، بس مصروفِ پرواز — دیکھنے والے بڑے حیران ہوئے کہ یہ دونوں ہم فطرت نہیں، ہم پرواز کیسے ہوگئے؟ شاہین نے گِدھ سے کہا: ”دیکھو! اِس دُنیا میں ذوقِ پرواز کے علاوہ اور کوئی بات قابلِ غور نہیں“۔ گِدھ نے بھی تکلفاً کہہ دیا: ”ہاں! مجھے بھی پرواز عزیز

ہے، میرے پَر بھی بلند پروازی کے لیے مجھے ملے"۔ لیکن کچھ ہی لمحوں بعد گِدھ نے نیچے دیکھا۔ اُسے دُور ایک مرا ہوا گھوڑا نظر آیا۔ اُس نے شاہین سے کہا: "جہنّم میں گئی تمہاری بلند پروازی اور بلند نگاہی — مجھے میری منزل پکار رہی ہے"۔ اتنا کہہ کر گِدھ نے ایک لمبا غوطہ لگایا اور اپنی منزلِ مُردار پر آ گرا۔ فطرت الگ الگ تھی، منزل الگ الگ رہی۔ ہم سفر آدمی اگر ہم فطرت نہ ہو تو ساتھ کبھی منزل تک نہیں پہنچتا۔

انسان کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہو گا کہ فطرت اپنا اظہار کرتی رہتی ہے۔ جو کمینہ ہے، وہ کمینہ ہی ہے خواہ وہ کسی مقام و مرتبہ میں ہو۔ میاں محمد بخش صاحبؒ کا ایک مشہور شعر ہے کہ

؎ نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نئیں پایا
کِکّر تے انگور چڑھایا ، ہر گچھا زخمایا

(کمینے انسان کی دوستی کبھی کوئی فیض نہیں دیتی، جس طرح کیکر پر انگور کی بیل چڑھانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ہر گچھا زخمی ہو جاتا ہے)

فطرت کا تعلّق حالات اور تعلیم سے نہیں، اِس کا تعلق انسان کے باطن سے ہے، اِس کے باطنی اندازِ نظر سے ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ فطری طور پر مذہب پرست ہیں، کچھ لوگ مذہب سے بیزار۔ مذہب پرست لوگ عبادت گاہیں بناتے ہیں — مثلاً مسجد، مندر، چرچ، گردوارہ، اسٹوپا وغیرہ۔ یہ لوگ اپنے اپنے انداز میں اپنے اپنے پیشواؤں کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔ اپنی باطنی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ اصل ارتقاء کس کے پاس ہے۔

دنیاوی سفر کو کسی آسمانی ضابطے کے مطابق طے کرنے والے، مذہبی لوگ کہلاتے ہیں۔ اُن کی فطرت ہی اُن کو مجبور کرتی ہے کہ وہ خود کو بلند خیالی سے آگاہ کریں۔ وہ اِس کائنات کو کسی خالق کے حوالے سے دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی بات انہیں مذہبی شعور کی طرف لاتی ہے۔

یہ اُن کی فطرت ہے — اور دوسرے لوگ تو ہمیشہ ہی دوسرے ہوتے ہیں۔ وہ کسی خالق کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ جب خالق ہی کو نہیں مانتے تو وہ کسی رسول پر کیا اعتقاد رکھیں گے! ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ دنیا سمیٹتے ہیں اور کچھ لوگ دنیا سے نجات چاہتے ہیں۔ یہی تو فطرت ہے۔ بنانے والے خالقِ اکبر کا حکم ہے کہ تم میں سے ہی لوگ ہیں جو دنیا کے طلب گار ہوں گے اور تم میں سے ہی لوگ ہیں جو آخرت کے طلب گار ہوں گے۔ یہ خالق کا حکم ہے کہ ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ یہ اصل ہی فطرت ہے۔ یہی دیکھنے والی شے ہے۔ اِس کا عرفان ہی، عرفان ہے — چیزوں کو اُن کی حقیقت کے رُوپ میں دیکھنا۔ حضور ﷺ اکثر دُعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! مجھے چیزوں کو اُن کی اصلی فطرت میں دیکھنے کا شعور عطا فرما۔

اگر فطرت سے آشنائی ہو جائے تو دنیا میں کوئی کسی کا گلہ نہ کرے۔ آج کا انسان چہرے بدلتا رہتا ہے۔ وہ اپنے اصل جوہر کے برعکس زندگی بسر کرنے کی سعی کرتا ہے لیکن اُس کی فطرت اُس پر غالب آ کر رہتی ہے۔ ہمارے پیشے، ہمارے مرتبے، ہمارے مال، ہمارے اثاثے ہماری فطرت نہیں بدل سکتے۔ کمینہ، کمینہ ہی ہو گا — خواہ وہ کہیں بھی فائز ہو۔ سخی، سخی ہو گا — خواہ وہ غریب ہو۔

ابتدائی زمانوں میں پیشے، مزاج کے مطابق بنائے گئے تھے۔ معلّم فطرتاً معلّم ہوتے تھے۔ اُن کی تصانیف معلّم تھیں۔ اُن کی مجلس معلّم تھی۔ اُن کا ہر ہر انداز معلّمانہ تھا۔ لوگ دُور دُور سے اُن کے پاس آتے اور علم کی پیاس بجھاتے۔ امتحانوں اور ڈگریوں کے کاروبار نہیں تھے۔ صحیح لوگ تھے، صحیح کام کیا کرتے تھے۔ اب لوگ پیشے کے اساتذہ ہیں، اُن کا وہ انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ انہیں اپنے گریڈوں کی فکر ہے۔ وہ طالب علموں کو اپنے سامنے بدعادات میں غرق ہوتے دیکھ کر بے تاب نہیں ہوتے۔ جب مہینوں کے مہینے گزر جائیں اور طالب علموں کا سفر رُکا رہے، اِن معلّموں پر قیامت نہیں گزرتی۔ وہ تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور چھٹیاں مناتے ہیں۔ یہ فطرت ہی کچھ اور ہے، وہ فطرت ہی کچھ اور تھی۔

ہر شعبہ اپنی بنیاد سے ہٹ سا گیا ہے۔ سیاست کو لیں۔ ہم دیکھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ کس قسم کے لوگ آگے آ رہے ہیں۔ اِن سے کیا توقعات ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے، ہم ملکی سطح پر ایک دائرے کا سفر کر رہے ہیں۔ زمانہ کہاں ترقی کر رہا ہے، ہم صرف دُوبدو ہیں، ایک دوسرے کے۔ جھگڑالو فطرت والے لوگ کہیں قوم میں انتشار پیدا نہ کر دیں! سلیم فطرت لوگ سیاست سے گریز کرتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ وہ لوگ ہی زیادہ مظلوم بنا دیے جاتے ہیں۔ سلیم اور حلیم فطرت لوگوں کو آگے آنا چاہیے کہ سفر کا رخ صحیح ہو۔

اگر انسان فطرت آشنا ہو جائے تو بہت سے جھگڑے اور بہت سے ہنگامے ختم ہو سکتے ہیں۔ ہم فطرت کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کریں — بد اور نیک — تو ہم دیکھیں گے کہ یہی دو گروہ اپنے اپنے عمل سے دنیا کو وہ کچھ بنا رہے ہیں، جو یہ بن رہی ہے۔

ایک طرف تو اِنسان کی تکلیف کو دُور کرنے کے لیے ہسپتال بن رہے ہیں۔ نیک فطرت لوگ دن رات انسان کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ دُکھی انسانوں کی خدمت ہوتی ہے، اِن ہسپتالوں میں۔ انسان کا خیال تک زخمی ہو جائے تو اِس کے لیے بھی خدمت کے لیے تیار ادارے موجود ہیں۔ دنیا کو اَمن کا گہوارہ بنانے والے لوگ مصروفِ خدمت ہیں، اور اِن کے مقابلے میں بد فطرت لوگ کیا کر رہے ہیں۔ تباہی، بربادی، جنگ، پریشانی اور بے چینی پھیلانے والے، اِنسان ہی تو ہیں۔

اسی طرح حیا والے برائی دیکھنے سے بھی گریز کرتے ہیں، اور بے حیا تو بس، ہے ہی بے حیا — اِس کا کیا۔ اخبارات بھرے پڑے ہیں، بداعمال لوگوں کے ظلم سے — لوٹنے والے، بم پھینکنے والے، نظامِ عالم درہم برہم کرنے والے، افراتفریاں مچانے والے، سماجی سکون برباد کرنے والے، محفوظ کو غیر محفوظ بنانے والے، محسن فراموش، دوستوں سے بھی غداری کرنے والے، میزبان کا گھر لُوٹ کر لے جانے والے، مسافروں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے، پاکیزہ روایات کو پارہ پارہ کرنے والے — اپنی فطرت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

نیک فطرت لوگ سماج ساز ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں کو پریشان نہیں کرتے۔ فرق صرف اصل اور فطرت کا ہے۔ بد فطرت بدی کر کے ہی دَم لیتا ہے۔ کہتے ہیں، کسی زمانے میں ایک بادشاہ نے کچھ ڈاکو گرفتار کیے۔ اُن کو سزائے موت کا حکم دیا۔ ڈاکوؤں میں ایک چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ بادشاہ نے سوچا کہ ابھی بچہ ہی تو ہے، اِسے نہ مارنا چاہیے۔ وزیرِ خاص نے کہا: "جہاں پناہ! بچہ تو ہے لیکن میں اِس کو بد فطرت دیکھ رہا ہوں"۔ بادشاہ نے کہا: "اِسے ہم اپنے پاس رکھ کر پرورش کریں گے"۔ وزیر کا کہنا نہ مانا گیا۔ دِن گزرتے گئے۔ بچہ بڑا ہو گیا اور آخر ایک دن شہزادی کو لے اُڑا۔ وزیر نے کہا کہ اب رونا کس بات کا۔ بَد، بَد ہی نکلا۔

یہ پہچان بھی خاص فطرت کی عطا ہے۔ بیج میں درخت کو دیکھنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ یہ سعادت بھی عطائے رحمانی ہے۔ حکمت ہر کسی کو عطا نہیں ہوتی۔ نیکی کے نام پر جماعتیں بنانے والے بد بھی ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ضروری نہیں کہ باطن کا عکس ہو۔ اسی بات سے خبر دار رہنے کی ضرورت ہے۔ آزمائش کے لمحے میں ہی اصل ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں، ایک دفعہ بلّیوں نے مل کر چناؤ کے ذریعے ایک بلّی کو سردار بنا دیا۔ اُس کے سر پر تاج رکھ دیا۔ سردار بلّی تاج پہن کر پہلی تقریر کرنے لگی۔ وہ تقریر کی تیاری کر کے آئی تھی۔ بس اُس نے تقریر کے لیے ابھی لب کھولے ہی تھے کہ اُس کو ایک چوہا نظر آ گیا۔ اُس نے تاج پھینک دیا اور کہا: "جہنّم میں گئے تمہارے تاج اور تمہارے انتخابات —چوہا ہی اصل بات ہے"۔ اُس کی فطرت غالب آ گئی اور جلسہ منتشر ہو گیا۔

ہمیں فطرت شناس ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی بلند فطرت، پست حالات سے گزریں تو بھی اُن کا مزاج پست نہیں ہوتا۔ عالی ظرفی یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی عزت کی جائے۔ ایک دفعہ حضورِ اکرم ﷺ کے رُوبرو غلام پیش کیے گئے۔ اِن میں حاتم طائی کی بیٹی بھی تھی۔ آپ ﷺ نے پہچانا کہ سخی باپ کی سخی بیٹی ہے۔ آپ ﷺ نے اُس کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دی۔ سخی کی عزت کی، حالانکہ وہ غلام تھی۔ پیغمبر ﷺ کی بات باتوں کی پیغمبر ہوتی

ہے۔ بس یہی سند ہے کہ حالات کے پیچھے اصل فطرت کو پہچاننا چاہیے۔

وہ ملک ترقّی کرتے ہیں جہاں اداروں کے سربراہ نیک فطرت لوگ ہوں۔ حسّاس فطرت انسانوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ کہیں وہ ہمارے عمل سے آزردہ نہ ہوں۔ ایک دفعہ ایک بادشاہ نے ایک آدمی کو یوں سزائے موت دی کہ اُسے پہاڑ سے گرادیا جائے۔ وہ آدمی بچ گیا۔ بادشاہ نے کہا: ''اسے دریا میں گرادیا جائے''۔ وہ بچ گیا۔ بادشاہ نے اُس سے پوچھا: ''اے انسان! تُو مرتا کیوں نہیں؟'' اُس نے کہا: ''اگر مجھے آسمان سے بھی گرادو تو میں بچ جاؤں گا۔ میں خاص فطرت رکھتا ہوں۔ میں کسی بلندی سے گر کر نہیں مر سکتا۔ ہاں البتہ — مجھے مارنا ہی ہے تو مجھے نظروں سے گرادو، میں مر جاؤں گا''۔

کسی شخص سے اُس کی فطرت کے خلاف کام لینا ظلم کہلاتا ہے۔ اِس ظلم سے بچنے کے لیے اور اس سے سماج کو بچانے کے لیے فطرت آشنا، جوہر شناس لوگوں کی ضرورت ہے۔ اداروں کے سربراہوں کی فطرت کے بارے میں غفلت نہ برتنا چاہیے۔ یہی ایک ضروری احتیاط ہے۔ تحفے وصول کرنے والے کو بااختیار نہیں بنانا چاہیے۔ نیچ نوازی بند کردی جائے تو سفر کی سمت کا تعیّن آسان اور یقینی ہو جائے۔ اگر عالی ظرفوں کو عالی مرتبہ بنادیا جائے تو منزل مل جاتی ہے۔

برسوں اِکٹھا رہنے کے باوجود رشتوں کے اشتراک کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ جب فطرت غالب آتی ہے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ:

ع ہم جسے ایسا سمجھتے تھے، وہ ویسا نکلا

مختلف فطرتیں مشترک سفر نہیں کر سکتیں۔ اگر ایسا ہو رہا ہو تو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ پیرِ رومیؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دجلہ کے کنارے پر انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک کوّا اور ایک ہنس ساتھ ساتھ چُگ رہے تھے۔ مولانا حیران ہوئے کہ یہ کیسا منظر ہے، دو الگ فطرتیں ایک ساتھ دانہ چُگ رہی ہیں۔ مولانا اُن کے قریب گئے۔ معلوم ہوا کہ

دونوں ہی زخمی تھے۔ بیماری میں مختلف فطرتوں کا عارضی اشتراک ہو سکتا ہے لیکن صحت مند وجود اپنی فطرت کے علاوہ کسی اور اشتراک میں موجود نہیں رہ سکتا۔

کبھی کبھی صحبتِ غیر، انسان کی فطرت کو عارضی طور پر رُوپوش کر دیتی ہے لیکن یہ وقت ہمیشہ نہیں رہتا۔ آخر رُوپوش رُونما ہو کر رہتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شیر نے دیکھا کہ ایک شیر زادہ بھیڑوں کے گلّے میں نہایت شریفانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیا قیامت ہے، شیر نے فطرت بدل لی۔ وہ اُس جوان کے پاس گیا اور کہا: "میرے ساتھ آؤ! میں تمہیں ایک نظارہ دکھاتا ہوں"۔ وہ اُسے تالاب پر لے گیا اور کہا غور سے دیکھو، ہم دونوں کی شکلیں برابر ہیں۔ ہم ایک ہی جنس ہیں۔ ہماری ایک ہی فطرت ہے۔ اب دیکھو! —میرا عمل! اُس نے ایک بھیڑ کو گردن سے پکڑا اور آناً فاناً اُسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ بس اِتنی ہی دیر درکار تھی۔ شیر زادے کا جوہر بیدار ہو گیا۔ فطرت غالب آئی۔ وہ بھی واقعی شیر بن گیا۔

اصل فطرت کو بیدار ہونے کے لیے صحبتِ صالح درکار ہے۔ صالح فطرت لوگوں کو اہم مقامات پر فائز کرنے سے اہم نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تقسیم فاطرِ حقیقی نے قائم کر رکھی ہے۔ فطرت اِس لیے نہیں بدلتی کہ اِسے فاطرِ حقیقی نے نہ بدلنے کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے لیکن انسان کی فطرت نہیں بدل سکتی۔ یہ اٹل ہے۔

حقیقت

حقیقت درحقیقت ہر اُس شے کا نام ہے، جو ہے۔ بنانے والے نے جو بھی تخلیق فرمایا، حق ہے۔ یہاں کچھ بھی باطل نہیں۔ حکم ہے کہ جو بھی ہے، باطل نہیں ہے — یعنی سچ بھی حقیقت، جھوٹ بھی حقیقت — خیر کی اپنی حقیقت ہے، شر کی اپنی حقیقت۔ خالق ایک ہی ہے — "خیر" اُس نے پیدا فرمایا — "شر" اُس نے تخلیق فرمایا۔ انسان صرف آنکھ کھول کر چلتا چلے اور دیکھتا جائے، غور کرتا جائے اور ممکن ہو تو جاننے والوں سے پوچھتا چلے کہ اشیاء اور اَسماء کی حقیقت کیا ہے، اور یہ کہ حقیقت کی حقیقت کیا ہے؟

انسان نے تصور کر رکھا ہے کہ حقیقت فلاں قسم کی شے ہے، اور جب انسان زندگی کا سفر کرتا ہے، اُس کو وہ شے نہیں ملتی تو وہ کہتا ہے کہ حقیقت نہیں ملی۔ یہی بیان تو غلط ہے کیونکہ جو کچھ ملا، وہ بھی تو حقیقت ہی تھی۔ اگر شیر نہیں ملا، تو ہاتھی تو ملا۔ بس ہاتھی ہی حقیقت ہے، اُس جنگل کی۔ آگے چلیں گے تو شیر بھی ملیں گے۔ پھر وہ حقیقت ہوں گے۔ پس! جو کچھ بھی حقیقتاً موجود ہے، حقیقت ہے۔

اس سارے مشاہدے میں مشکل صرف ایک ہے کہ ہمارا اندازِ نظر اکثر غلط ہوتا ہے۔ ہم ایک محدود رسائی کی آنکھ سے لامحدود منظر کو دیکھتے ہیں اور پھر فوراً فیصلہ کرکے اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم زمین کی وسعتوں میں پھرے، سمندروں کی تہہ تک پہنچے، خلاؤں کا چپّہ چپّہ چھان مارا، ہمیں کوئی خدا نہیں ملا — پس خدا کا وجود نہیں ہے۔ یہیں نتیجہ غلط ہو گیا۔ ڈھونڈنے

والا بڑے بڑے فاصلے طے کرتا رہا، اُس نے اپنے دل کا سفر نہیں کیا۔ اس لیے اسے خدا کی حقیقت یا اُس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔

ایسے ہی دوڑ لگانے سے حقیقتیں دریافت نہیں ہوتیں۔ فاصلے طے کرنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ بحث کرنے سے حقیقت نہیں ملتی۔ غور کریں اور پھر مزید غور کریں، حتیٰ کہ آپ اصل تک رسائی حاصل کر لیں۔

اصل کیا ہے—؟ آم کا بیج ہے؟ آم کا درخت ہے؟ آم کا پھل ہے؟ آم کا گودا ہے؟ آم کی گٹھلی ہے؟ آم کی گٹھلی کے اندر کا مغز ہے؟ کیا اِس سارے کارخانۂ تخلیقِ ثمریات کے پیچھے کسی کا اَمر تو نہیں؟ اِس کو ہی حقیقت کیوں نہ مان لیا جائے—اور پھر اَمر لگانے والی ذات خود ہی حقیقتوں کی حقیقت، ہر آخر کا اوّل اور ہر اوّل کا آخر، وہی جو ہر ظاہر کا باطن ہے اور ہر باطن کا ظاہر ہے۔ وہی جو نیستی کو ہستی اور ہستی کو نیستی بنا دیتا ہے۔ وہی جس کے قبضۂ قدرت سے کسی شے کے باہر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہر پردے کے پیچھے موجود ہے۔ سب حقائق کا خالقِ مطلق ہے۔ وہ ہر منظر میں جلوہ گر ہے۔ ہر دل میں موجود ہے اور شاید ہر آنکھ سے اوجھل ہے۔ اسی حقیقت کے ذکر کو "حقیقت" کہتے ہیں۔

حقیقت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے دریافت نہ ہونے والے کی دریافت جاری رہتی ہے۔ اُس کا ذکر رہتا ہے۔ وہ ہر کلام میں ہے، ہر جگہ ہے، لیکن کہاں ہے؟ ہم نہیں بتا سکتے۔ وہ کوئی جغرافیائی مقام نہیں کہ اسے طول بلد اور عرض بلد میں بتایا جا سکے۔ وہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں کہ اسے کتابوں میں تلاش کیا جائے۔ وہ تو عیاں ہے۔ صرف ہم ہی اُسے دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ آنکھ میں بینائی کہاں رہتی ہے؟— جسم میں جان کدھر رہتی ہے؟—خوشی کس کونے میں رہتی ہے؟— غم کہاں ہوتا ہے؟ آنسو کہاں سے آتے ہیں؟ کیا یہ دُور سے آتے ہیں؟ کیا اِن اشکوں کی تاثیر سے عرش ہل جاتے ہیں؟ —ہم باخبر نہیں۔ ہم خود تو خود سے ناآشنا ہیں، خدا سے کیا آشنا ہو سکتے ہیں! ویسے بھی خدا سے

آشنائی ممکن ہی نہیں، جب تک وہ خود آشنائے راز نہ کر دے۔ آج تک تو ایسے ہی ہوتا رہا ہے کہ وہ خود ہی کسی نامعلوم لمحے میں پردے کے پیچھے سے پکارتا ہے— ٹھہرو! میں تمہارا رب ہوں۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ عصا— اسے پھینک دو— اور دیکھو—! بس اُس نے خود ہی نامزد فرمادیا— پیغمبرؑ— اُس کا پیغام لانے والا۔ وہ آشنائی عطا کرتا ہے۔ اِنسان خود کیا کر سکتا ہے! وہ خود کلام کرتا ہے۔ خود جلوے عطا فرماتا ہے۔ خود ہی مرتبے دیتا ہے۔ بیان کی طاقتیں دیتا ہے اور کبھی کبھی تو حقیقت آشنا کر کے گویائی کی طاقت سلب کر لیتا ہے۔ کتنے حقیقت شناس خاموش چلتے پھرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں، بتا نہیں سکتے، اور جو لوگ بتا سکتے ہیں، شاید جان نہیں پاتے۔

حقیقت کا متلاشی عزم کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بلند پہاڑوں اور گہرے سمندروں کا سفر کوئی آسان کام نہیں۔ بس ہمت، یقین اور زبردست اُمّید کی ضرورت ہے۔ مایوسی اِس راستے کا سب سے بڑا راہزن ہے۔ کتنے کتنے قافلے لُٹ گئے اِس راہ میں۔ بس مایوس ہو گئے، واپس آگئے کہ حقیقت کچھ نہیں—!

یہ بڑے فضل کی بات ہے کہ حقیقتوں والا خود ہی حقیقت سے پردہ ہٹائے، ورنہ انسانی عقل اور انسانی دل پر غفلت کا پردہ رہتا ہے— نفس کا پردہ، غرور کا پردہ، لالچ و خود پسندی کا پردہ، اَنا کا پردہ، دولت کا پردہ، شہرت کے حصول کی ہوس کا پردہ— پردہ ہی پردہ— جہالت و ظلم کا پردہ، علم والا مشہور ہونے کی غلط فہمیوں کا پردہ! حقیقت کہاں سے نظر آئے گی! نگاہ میں ناپاک، ناروا اور نامحرم مناظر ہوں تو ایسی بدبخت آنکھ حقیقتوں کو کیا دریافت کرے گی—؟ جنس پرستی کے بھوکے شکاری حقیقت کے پجاری نہیں بن سکتے۔ حقیقت کی تلاش کرنے والا خود حقیقت نہ بنے، تو بات نہیں بنتی۔ انسان ایک خاموش روشن آئینہ بن جائے تو حقیقت نقاب اور حجاب سے باہر نکل کر آئینے کے رُوبرو ہو جاتی ہے۔ بس آئینہ صیقل ہونا چاہیے۔ یہ دل کا آئینہ ہے، جو اُس کے ذکر سے صیقل ہوتا ہے اور پھر ایک دن، کسی دن، کسی ساعت، کسی لمحے کے لیے چکاچوند، حقیقت کا جلوہ— بلکہ جلوے کا عکس اور پھر عکس کا جلوہ— جلوہ گری کر جاتا ہے۔

سُدھ بُدھ — ہوش و حواس — غائب — بس جلوہ حاضر اور بندہ غائب — اور جب بندہ حاضر ہوتا ہے، جلوہ غائب ہو چکا ہوتا ہے — اور پھر وہی عام روشنی، وہی عام منظر۔ منظر سے منظر غائب ہو گیا۔ جان میں سے جان نکل گئی — اور پھر جلوہ آشنائی کے بعد، جلوے کی تلاش شروع ہو گئی۔ پہلے مائل بہ کرم وہ ہوا — پیار کا آغاز اُس نے کیا۔ اُس نے اپنا بنایا۔ اُس نے اپنا جلوہ دکھایا۔ اب وہی روپوش ہو گیا۔ اب ہم اُس کی تلاش میں ہیں۔ اب تلاش کرنے والا پوچھتا ہے، ہر جانے والے سے کہ کہاں رہتا ہے، جلووں والا؟ کیا مقام ہے اُس کے قیام کا۔ خانہ کعبہ میں تو غلافِ کعبہ ہے، مکان ہے، مکین کہاں ہے؟ وہ کہیں آس پاس ہے۔ سامنے نہیں ہے۔ ہم اُس کی آہٹیں سن رہے ہیں لیکن وہ ابھی تک آیا نہیں۔ شاید وہ کبھی نہیں آئے گا! نہیں، ایسے نہیں ہے۔ میں نے پہلے کہا کہ عزم کا راہی مایوس نہیں ہوتا۔ شاید یقین بھی اُس کا ہی جلوہ ہے۔ اُمّید اُس کی ہی جھلک ہے۔

اور — اور — خاموشی ہی اچھی ہے — لیکن بات کو روکنا بھی نہیں چاہیے — اور — اُس کا محبوب ﷺ ہی اُس کا دیدار ہے۔ جس نے آپ ﷺ کو دیکھا، اُس نے اُسے دیکھ لیا۔ یہ عجب بات ہے۔ حقیقت کی تلاش انسان کے دَر تک جا پہنچی — پہلے دُرود، پھر سلام — پھر حقیقت ہی حقیقت — جلوہ ہی جلوہ!! — نا آشنا کے لیے شرک ہی شرک، اور آشنا کے لیے ایمان ہی ایمان۔ مقامِ غور ہے کہ اللہ کے ہاں انسانوں کا تذکرہ ہے — انسانوں کا، صرف انسانوں کا — اور اگر انسان، انسانوں کا تذکرہ کرے یا اُن سے محبّت کرے اور ہمیشہ ہمیشہ ہمہ حال محبّت کرے تو شرک؟ — یہ کیسے ہو سکتا ہے! کیا اللہ آج کل بھی دُرود بھیجتا ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ کے ظاہری پردہ کرنے کے بعد، اللہ کس پر دُرود بھیجتا ہے؟ محمد ﷺ ذات ہے یا صفت — ذات ہے تو قائم ہے — اللہ کے دُرود کے آئینے میں — اللہ کسی گزشتہ پر دُرود نہیں بھیجتا۔ وہ حال کا اللہ ہے۔ قرآن، حال کا قرآن ہے۔ کلمہ، حال کا کلمہ ہے — اور رسول ﷺ؟ — حال ہی کے رسول ﷺ ہیں — ہمیشہ سے، ہمیشہ کے لیے۔ اِس کے ماسوا شرک ہے۔ یہی توراہِ توحید ہے۔

یہی حقیقت ہے۔ اللہ کی راہ — حقیقت کی راہ — اُن لوگوں کی راہ جن پر اُس کا انعام ہوا۔ وہ لوگ آج بھی ہیں۔ اُن کی راہ تلاش کرو — اُن کی راہ اختیار کرو — وہ لوگ ہی حقیقت کے جلوے ہیں — مظاہرِ انوار ہیں — مشاہدۂ تجلّی ہیں — وہ جو جلوہ گزر گیا تھا نظر سے، وہ پھر نظر میں آباد ہو جائے گا۔ شرک سے بچو — کسی واہمے کی پوجا نہ کرو — عین اللہ کی عبادت کرو۔ اللہ — سچا اللہ — مالک اللہ — ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محبّت کرنے والا اللہ — اپنے ہمیشہ رہنے والے محبوب ﷺ سے ہمیشہ کی محبّت —!! صرف اُسی اللہ کی اطاعت کرو — وہ جو کہتا ہے، میرے محبوب ﷺ کی آواز سے کسی کی آواز کا قد بھی بڑا نہ ہو — ورنہ تمہارے اعمال یعنی عبادتیں بھی ضائع ہو جائیں گی۔ اگر تم اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو اطاعت کرو ہمیشہ رہنے والے نبی ﷺ کی — اللہ تم سے محبّت کرے گا — اور پھر حقیقت آشنائی آسان ہو جائے گی۔ وہ جو تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا، جب ہوش اُڑ گئے تھے، اب ہمیشہ رہے گا — وہ بھی رہے گا اور ہوش بھی!!

دِیدنی

یہ ایک گہرا راز ہے کہ ہر شے دراصل ایک ہی شے ہے۔ یہ سب کائنات ایک ہی کائنات ہے۔ سب صنعت ایک ہی صانع کا اظہار ہے۔ ہر شے ہر دوسری شے کا آئینہ ہے۔ رات سورج ہی کے ایک انداز کا نام ہے۔ دُوری کسی قرب کے حوالے سے ہے۔ فراق اور وصال ایک ہی محبوب کی عطا ہے۔ اگر چیزوں کو اُن کے اصل کے حوالے سے پہچانا جائے تو ہر شے ایک ہی شے ہے۔ ہر انسان ہر دوسرے انسان کا عکس ہے۔ طاقتور انسان کمزور انسانوں کی عنایت کا نام ہے۔ ڈاکٹر مریض کے اور مریض ڈاکٹروں کے روپ ہی ہیں۔ ہر فراوانی، ہر احتیاج کے دَم سے ہے اور ہر محرومی، ہر حاصل کے دَم سے ہے۔ نیکی، بدی کے حوالے سے اور بدی، نیکی کے دَم سے۔ جو ایک نہ ہو سکا، اُسے دوسرا بننا پڑا۔ جو یہ نہ بن سکا، اسے وہ بننا پڑا — ہر فراز، ہر پستی کا دوسرا نام ہے اور شکست کی تاریخ فتح کی تاریخ ہے۔ اگر میں ''مَیں'' نہ ہوتا — تو ''تُو'' کیسے ''تُو'' ہو جاتا! اَزل نہ ہو تو ابد کیا! آغاز ہے تو انجام ہے، نہیں تو نہیں۔ جس کا آغاز نہ ہوا، اُس کا انجام بھی نہ ہوا۔ جو ہر آغاز سے قبل ہوا، وہ ہر انجام کے بعد بھی رہے گا۔

چیزوں کے آپس میں رشتے بڑے مضبوط اور مربوط ہیں۔ محبّت اور نفرت ایک ہی جذبہ ہے۔ پسند کے باطن میں ناپسند کا ہونا ناگزیر ہے۔ ہم دوستوں کے دوستوں کو دوست سمجھتے ہیں اور اُن کے دشمن کو دشمن، حالانکہ ہمارا اُن سے براہِ راست تعلق نہیں ہوتا۔

یہ عجب بات ہے کہ قہقہے اور آنسو ایک ہی کہانی ہے۔ ایک ہی مسافر ہنستا جا رہا ہے اور وہی مسافر روتا جا رہا ہے۔ ایک ہی گھر میں شادیانے بھی بجتے ہیں اور انہی انسانوں کے

حوالے سے ماتم بھی ہوتا ہے۔ قہقہے، آنسو ایک ہی کہانی ہے۔ جو ایک نے کھویا، اسے دوسرے نے پایا، اور عجب بات ہے کہ جسے ایک تلاش کرتا ہے، دوسرا اُسی سے نجات چاہتا ہے۔

سارا منظر اور پس منظر ایک ہی نظارہ ہے۔ سارا کھیل ایک ہی کھیل ہے۔ انسان پر اِس میں مختلف مراحل آتے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتے ہیں، ڈراما جاری رہتا ہے۔ افراتفری ہے۔ ہر انسان پریشانی میں ہے لیکن پریشانی کے باوجود ہر انسان اپنے سامان کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔ لوگوں نے سامان کو پکڑ رکھا ہے اور سامان نے لوگوں کو۔ انسان کی ملکیت اُس کی مالک ہو گئی ہے۔ ہم جس کو قابو کرتے ہیں، وہ ہمیں پکڑ لیتا ہے۔ کسی چیز کو روکنے کے لیے خود رُکنا پڑتا ہے۔ اگر ہم کسی چیز کے ساتھ اُلجھیں تو ہم اپنے آپ سے اُلجھتے ہیں۔ ہم آزاد نہ کریں تو ہم آزاد نہیں ہو سکتے۔ اس سارے ڈرامے میں سارے کھیل کا مصنّف جب چاہے، ڈرامے کو تکمیل تک پہنچا دے۔ ہر انسان اپنے آپ کو ساتویں ایکٹ میں محسوس کرتا ہے کہ ابھی کھیل ختم ہو گا۔ یہ کھیل شروع ہوتے ہی ختم ہونے والا تھا۔ آغاز ہی سے بدن ٹوٹ رہا تھا۔ انجام نوشتۂ دیوار ٹھہرا۔ ہم استقامت چاہتے ہیں۔ ہمیں عارضی زندگی ملی۔ ہم کسی مقام پر دو متصل لمحات تک بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ کچھ ہوتے ہوتے، کچھ اور ہو جاتا ہے۔ کچھ کہتے کہتے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فریاد لب تک آتے آتے اپنا مفہوم بدل لیتی ہے۔ دن، رات کے خوف سے گزرتا ہے اور رات صبح کے انتظار میں کٹ جاتی ہے۔ ایسی بھی راتیں آتی ہیں کہ رات کٹ جاتی ہے اور سورج نہیں نکلتا۔ ایسے بھی دن آئے کہ سورج ڈوب گیا، روشنی باقی رہی۔ ایسے ساتھ بھی ملے جو پاس پاس رہے، ساتھ ساتھ رہے، قریب رہے اور کبھی قریب نہ محسوس ہوئے۔ نگاہوں میں رہ جانے والا ذرا سا فاصلہ، برسوں کی مسافت میں طے نہ ہو سکا۔ ساتھ چلنے والے، ہزار بار اجنبی نکلے اور اپنے قافلے سے بچھڑ گئے۔ چلتے چلتے، ساتھ بدل جاتا ہے اور طے کرتے کرتے، راستے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کبھی سر پر آسمان گرتا ہے، کبھی پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ کبھی انسان، انسان پر مر رہا ہوتا ہے اور کبھی انسان، انسان کو مار رہا ہوتا ہے۔ آنکھ کھول کر چلیں تو آنکھ بند ہونے کی تمنّا پیدا ہوتی ہے۔ آنکھ بند کر دیں تو آنکھیں کھول کر چلنے کا ارادہ پیدا

ہوتا ہے۔ یہ ایسا جلوہ ہے کہ جسے پوری طرح دیکھا بھی نہیں جا سکتا اور پوری طرح چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔

شاہین کی خوراک معصوم فاختہ کا گوشت ہے۔ وہ اپنی خوراک کھا رہا ہوتا ہے اور ہم اپنے آپ میں لرز جاتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی بکری سے پوچھا گیا: ''مائی بکری! تُو لاغر کیوں ہو گئی؟'' بکری نے اُداس ہو کر جواب دیا: ''تمہیں کیا بتاؤں میں نے خواب میں شیر کا جلوہ دیکھ لیا''۔ بس اتنی سی بات ہے۔ جس نے شیر کا جلوہ دیکھ لیا، اُس کی صحت خراب ہو گئی۔ دیکھنے والا ضرور متاثر ہوتا ہے۔ یہ سارا دبستان ایک ہی مالک کی ملکیت ہے۔ وہ ایک طرف ایسے ایسے ستارے بناتا ہے کہ انسان کے تصوّر سے بھی بڑے اور کہیں اتنی باریکیوں میں تخلیق ہوتی ہے کہ انسانی نظر کی مجال نہیں کہ الیکٹرون کے اندر رہونے والے جلووں کو دیکھ سکے۔

یہ ساری صنعت ایک ہی ذات کی صنّاعی ہے۔ ایک ہی جلوہ ہے جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ کوئی انسان اُس کے بغیر نہیں اور وہ ہر انسان کے علاوہ ہے۔ اُسی سے سب کچھ ہے اور وہ کسی سے نہیں۔ وہ سب کا باعث ہے، اُس کا کوئی باعث نہیں۔ وہ قاسم ہے، مقسوم نہیں۔ وہ کاتب ہے، مکتوب نہیں۔ وہ خالق ہے، مخلوق نہیں۔ وہ مارتا ہے، مرتا نہیں۔ وہ پیدا کرتا ہے، پیدا نہیں ہوتا۔ وہ وقت کا خالق ہے اور خود وقت سے باہر ہے۔ وہ کیا ہے؟ وہ خود ہی جانتا ہے! ہم قلیل علم رکھتے ہیں۔ اتنا علم جتنا اُس نے عطا فرمایا۔ اُس نے ہمیں جو بنایا، سو بنایا۔ اُس نے ہمیں جو کہا، سو کہا۔ احسنِ تقویم سے اسفل السّافلین تک ہمارے تمام مقامات اُدھر سے ہیں۔ ہم تو صرف ظلوماً جھولا ہیں۔ ہم خود تو ''ہم'' نہیں ہیں — ہم تو اُس کا شاہکار ہیں — ہمیں ناز بھی ہے — ندامت بھی — شرمندگی بھی ہے اور فخر بھی! ہمارا حاصل، ہماری محرومیاں ہیں — ہم پھیلتے پھیلتے سمٹ جاتے ہیں — ہم چلتے چلتے رک جاتے ہیں — ہم ہنستے ہنستے رونے لگ جاتے ہیں — ہم الوداع کرتے کرتے رخصت ہو جاتے ہیں — ہم عجب لوگ ہیں!

ہم پیمانے بناتے رہتے ہیں لیکن خود کو ماپنے کا وقت نہیں رکھتے — شاید حوصلہ ہی نہیں رکھتے۔ ہم آئینے بناتے ہیں — آئینوں میں خود نہیں جھانکتے۔ ہم توقعات رکھتے ہیں کہ

لوگ ہمارے معیار پر پورا اُتریں، ہمارے تقاضوں کو پورا کریں لیکن ہم خود کسی کی خواہش پر پورا نہیں اُترتے۔

ہم اپنی خامیوں کو تقدیر بھی کہہ لیتے ہیں اور اپنی قسمت کو تو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہم بھی عجب ہیں۔ ہمارے متعلق بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم ایک رات شبینہ میں گزارتے ہیں، دُرود و سلام کی مجالس بپا کرتے ہیں، مراقبے اور سُرور میں محویت تلاش کرتے ہیں — اللہ ہمارے قریب ہوتا ہے، ہم اللہ کے قریب ہوتے ہیں — اور دوسری رات، دوسری قسم کی رات ہوتی ہے۔ ہم لوگ، لوک رس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہم پر وجد بھی طاری ہوتا ہے۔ ہمارے پاؤں میں طبلے کی تال پر حرکت بھی ہوتی ہے۔ دھمال ہماری فقیری کا نشان ہے۔ ہم تضادات کا مُرکّب ہیں۔ ہمارے ظاہر اور باطن میں فرق رہتا ہے۔ ہم جن لوگوں کا نام اَدب سے لیتے ہیں، اُن کی زندگی کو نہیں اپناتے۔ ہم صداقت کی تبلیغ کرتے ہیں اور عمل اپنی تبلیغ سے باہر ہوتا ہے۔ غالباً نیکی اور اسلام کو صرف تبلیغ کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ کام کے وقت یعنی عمل کے وقت ہم رشوت لیتے اور دیتے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ ہم میں سے کچھ کالی بھیڑیں بھی ہیں — رشوت وصول کرکے کام نہ کرنے والا بس کالی بھیڑ ہے۔

سچ پوچھو تو ہم نے ایک اعلیٰ قوم بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دیا ہے — آخر کب تک خوابوں کے سہارے جیا جا سکتا ہے؟ اَب ہم "حقیقت پسند" ہوتے جا رہے ہیں۔ اب ہم سمجھ چکے ہیں کہ یہ ملک ہمارے لیے بنا ہے، ہم اِس کے لیے نہیں ہیں — ہم سب ایک دوسرے کو خدمت کے نام پر دھوکا دیتے ہیں۔ ہم کاریگر ہیں۔ ہم خود کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ آنے والے خطرات کو ہم آناً فاناً آنکھیں بند کرکے ٹال دیتے ہیں۔ ہم شاید اُلٹی گنتی کرنے والے ہیں — ہم کیا کرنے والے ہیں —؟

لیکن، ایسے نہیں — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ ابھی ٹمٹماتے ہوئے چراغوں میں کچھ لَو باقی ہے۔ ابھی اُمّید ختم نہیں ہوئی۔ آواز آ رہی ہے کہ مایوس نہ ہونا۔ انتشار ختم ہو جائے گا۔ آرزوؤں کا ہنگامہ دُور ہو جائے گا۔ ہماری موجودہ حالت یہ ہے کہ جیسے اندھیرے میں

دو فوجیں ٹکرا رہی ہوں۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم کیا ہو رہا ہے۔ کون ہے جو سیاہی گھول رہا ہے۔ کون ہے جو انسان کو انسان سے دُور کر رہا ہے۔ کون ہے جو استعداد سے زیادہ بوجھ ڈال رہا ہے۔ کون ہے جس نے اِس قوم کو خدا کے خوف سے زیادہ غریبی کے خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ صرف غور کرنے کی بات ہے۔ موت سے پہلے انسان مر نہیں سکتا اور وقتِ مقررہ کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب یہ مان لیا کہ موت کا وقت مقرر ہو چکا ہے تو پھر یہ ہنگامہ کیا ہے۔ انسانوں کے ایمان کو کیا ہو گیا؟ بے مقصد قیام کی تمنّا آخر کہاں پہنچائے گی اِس قوم کو۔ مقصد نہ ہو تو زندگی کیا ہے؟ جب یہ معلوم ہے کہ عزت اور ذلّت اللہ کی طرف سے ہے تو یہ ساری سیاست، سارے اخبار، سب پراپیگنڈہ، یہ سب کیا ہے؟ یہ مناظرے، یہ مقابلے، یہ مباہلے اور یہ مجادلے کیا ہیں؟ ہر چیز کو عزت کے ساتھ رہنے دیا جائے تو اپنی عزت بھی قائم رہتی ہے۔ ساتھ والے مکان میں ہونے والے واقعات ہم کو متاثر نہیں کرتے۔ ہمارے ساتھ ہونے والے واقعات سے کون متاثر ہو گا؟

جب یہ معلوم ہو چکا کہ رزق مقرر ہو چکا۔ ہر ذی جان مخلوق کا رزق اللہ نے اپنے ذمے لگا رکھا ہے — اب یہ بے چینی کیا ہے؟ یہ قرضہ جات کیا ہیں؟ یہ سُود اور منافع کیا ہیں؟ اللہ کا واضح ارشاد ہے کہ زمین پر جو بھی مخلوق ہے، اُس کا رزق اُس کے پاس ہے اور اللہ خزانوں کا خالق ہے، خزانوں کا مالک ہے۔ زمین و آسمان کے خزانے اُس کے اپنے ہیں۔ زمین و آسمان کے لشکر اُس کے اختیار میں ہیں۔ وہ جو چاہے جیسے چاہے، کرے — ہم اور ہماری سوچ بس اپنے بے دست و پا ہونے کے ثبوت ہیں۔

کیا انسان نے غور کرنا چھوڑ دیا کہ سارا ماضی سمٹ کے اتنا رہ گیا جتنا ہمارے علم میں ہے، اور ہمارے علم میں آنے والا ماضی مختصر ہے — اور ہمارے حال کی تمام مصروفیتیں اِسی ماضی کے حوالے سے ہیں۔ ہماری عقیدتیں، ہمارا دین، ہماری عبادت ماضی میں دیے گئے منشور سے عبارت ہیں۔ ہماری تاریخ پرانی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ ہمارا علم پرانے علم سے برآمد ہوا۔ ہمارا حال اور ہمارا ماضی صرف ایک ہی زمانہ ہے۔ ہمارا مستقبل — جب تک وہ مستقبل ہے، ایک

واہمہ ہے، ایک خواب ہے۔ جب ہمارے پاس آئے گا، وہ مستقبل نہیں ہو گا، حال ہو گا—اور "مستقبل حال ہو گا" —یہ عجب بات ہے۔ ماضی حال ہے، مستقبل حال ہے اور حال بھی حال ہے۔ پھر ماضی کی عقیدت کیا ہے اور مستقبل کا منصوبہ کیا ہے؟ یہی راز ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ حال یادوں کا نام ہے، منصوبوں کا نام ہے، لیکن بات بہت قابلِ غور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو واقعہ ہو چکا، جب مجھے اُس کا علم ہوتا ہے تو میرے لیے وہ واقعہ ہو رہا ہوتا ہے۔ میرا ماضی اور سب دنیا کا ماضی، میرے لیے حال ہے۔ گزرا ہوا واقعہ گزرتا ہی نہیں ہے۔ آج بھی ہم دن مناتے ہیں اور اُس دن کو آج کا دن کہتے ہیں، حالانکہ وہ کل کا دن تھا۔ کچھ راتوں کو ہم آج کی رات کہتے ہیں، حالانکہ وہ کل کی رات تھی۔ کوئی دن جب دوبارہ ہی نہیں آتا تو دن منانے کی بات بہت ہی قابلِ غور ہے۔ کوئی تاریخی واقعہ کسی قیمت پر دوبارہ ویسے نہیں رونما ہوتا—اِس کی اہمیت کیا ہے؟

کچھ لوگوں نے گزشتہ کل میں کچھ فیصلہ کیا۔ متفقہ فیصلہ، اِس لیے وہ اہم تھا۔ اب اُس اہمیت کو یاد رکھنے کی بجائے کیوں نہ متفقہ فیصلے ہی کر لیے جائیں—نئی اہمیت پیدا ہو جائے گی۔ تاریخ کو یاد رکھنے کی بجائے تاریخ بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔ اِسلام صرف روایت کا نام نہیں، صرف احکام اور ارشادات کا نام نہیں، مسلمانوں کے متفقہ عمل کا نام بھی اِسلام ہے۔ پرانے مسلمان اور ہم مسلمان، ایک ہی مسلمان ہیں۔ اُن کا کعبہ ہی ہمارا کعبہ ہے۔ اُن کے زمانے کا قرآن، ہمارا ہی قرآن ہے۔ وہ اللہ، یہ اللہ ہے۔ ہر وہ چیز جو موجود تھی، موجود ہے۔ اگر روح قائم ہو جائے تو وجود ضرور قائم ہو جائے گا۔ وجود کا ٹوٹنا، روح کے انتشار کا نام ہے۔

اگر حال محفوظ ہو جائے تو سارا مستقبل محفوظ—کیونکہ یہی عمل ہمیشہ رہے گا۔ اِسی طریقے نے آئندہ طریقہ بھی بننا ہے۔ اِسی اسلام نے آئندہ کا اسلام بننا ہے۔ یہی کعبہ ہمیشہ کا کعبہ ہے۔ ہم غور کیوں نہیں کرتے۔ ہم بڑے فخر کے ساتھ اِسلام کا پرچار کرتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کا بھی خوف رہتا ہے کہ ہم پر بنیاد پرستی کا الزام نہ آئے۔ اگر اِسلام پرستی کو بنیاد پرستی کہا جائے اور حق پرست کو بنیاد پرست کہہ لیا جائے تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کی تردید کر دی جائے؟

ہم نے اِس بات پر غور کرنا چھوڑ دیا ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور ہمیں کہاں جانا ہے — اور ہمارے ذِمے کیا کام ہے۔ ہم صرف ہنگامہ کرنے والی قوم بن گئے ہیں۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ مشرق اور مغرب دو مختلف سمتیں نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی سمت ہے۔ ہر مقام بیک وقت مشرق بھی ہے اور مغرب بھی۔ ہر مقام اعلیٰ بھی ہے اور ادنیٰ بھی۔ سورج نہ کہیں سے نکلتا ہے اور نہ کہیں ڈوبتا ہے۔ رات دن ہمارے اپنے نام ہیں۔ غم خوشی ہمارے اپنے نام ہیں — نہ ہمیں کوئی دیتا ہے، نہ چھینتا ہے — نہ ہم ماضی میں ہیں، نہ مستقبل میں — ہم حال ہیں — سدا بہار حال۔ موت میں زندگی اور زندگی میں موت — غم میں خوشی اور خوشی میں غم — قرب میں بُعد اور بُعد میں قرب — وصال میں فراق اور فراق میں وصال کی لذّتیں ہی ہمارا منصب ہے۔ ہم جتنا فاصلہ طے کرتے ہیں، مرکز ہمارے ساتھ ہی طے کرتا ہے۔ کسی شے کا حاصل کرنا، اُس کے خیال کرنے سے ہے۔ منزلیں دوڑنے سے حاصل نہیں ہوتیں، پروگراموں سے حاصل نہیں ہوتیں۔ بس ٹھہر جاؤ اور نوازش کا انتظار کرو۔ نوازش ضرور ہو گی۔ حق والے کا حق ادا کر دو اور یہی تمہارا حق ہے۔ رونے والے کے آنسو پونچھو، کیونکہ یہی تمہارا غم ہو گا۔ تیز چلنے والے کو روکو، کیونکہ یہ بھی تمہارے قافلے کا فرد ہے۔ سُست رہنے والے کو محبّت کے ساتھ تیز کرو، وہ بھی معزز ساتھی ہے۔ محروم کی مدد کرو۔ مظلوم سے تعاون کرو۔ سب کی سب کے ساتھ نسبت ہے۔ سب لوگ ایک ہی لوگ ہیں۔ جو ایک نے کھویا، وہی دوسرے نے پایا۔ یہ نہ پوچھو کہ وہ حق سے کیوں محروم ہوا؟ تم یہ دیکھو کہ تم نے حق سے زیادہ کیوں حاصل کر لیا؟ تیرا حاصل ہی اس کی محرومی بن گیا۔ اپنے حاصل کی ترتیبِ نَو اور تقسیمِ نَو کرو۔ اپنی وضاحتوں کو واضح کرو۔ اپنے ہونے کو، نہ ہونے سے پہلے، اُس وقت سے بچاؤ جب تم کسی اور طاقت کے سامنے جوابدہ کر دیے جاؤ گے۔ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا گواہ کوئی بھی نہ ہو تو ہم اپنے گواہ خود ہیں۔ ہم اپنے آپ کو خود ہی تباہ کرتے ہیں اور عروج کی تمنّا میں ہم زوال میں جا گرتے ہیں۔

اِس زمین پر ہونے والا یہ سفر، ہمارا پہلا سفر ہی درحقیقت ہمارا آخری سفر ہے۔ جو ہو

رہاہے، پہلی بار — لیکن آخری بار۔ احتیاط سے، غور کے ساتھ، منشا کو پہچان کر، بنانے والے کی مرضی کے مطابق سفر کو جاری رکھنا چاہیے۔ ہم سے پہلے آنے والوں نے راستے پر نشانات چھوڑے ہیں۔ وہ ہمارے لیے ہیں، کیونکہ ہم سے پہلے ہونے والا سفر بھی ہمارا ہی سفر ہے۔ ہماری غلطی سے سب پر الزام آئے گا۔ ہم تابدار ہوں گے تو سارا اسلامی سفر، سب مسافر، روشن ہوں گے۔ ہمارے دامن پر لگنے والا داغ سب کی ندامت کا باعث بن سکتا ہے۔ ہم سب سے ہیں اور سب کے لیے ہیں۔ اپنے آپ کو اپنے لیے اور اپنوں کے لیے محفوظ رکھنا چاہیے، اور اپنوں کو اپنے لیے اور سب کے لیے زندہ رکھنا چاہیے — اور سب اپنے ہیں۔ اُن کے ساتھ اپنوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے والے اپنے بھائی ہیں اور کلمے کی وحدت میں پائے جانے والے لوگ بھی ہمارے بھائی ہیں۔ بھائیوں کے ساتھ برابر کا سلوک ہونا چاہیے۔ یہ کلام، اللہ کا کلام، کلامِ مجید، جو ایک ذات ﷺ پر نازل ہوا، سب کے لیے ہے — ماضی، حال، مستقبل کے مسلمانوں کے لیے — اِس کا خطاب، ہر زمانے سے آزاد — اِس کے مطابق کیا ہوا عمل، ہر زمانے کے لیے مفید ہے۔ ہمارا خدا اور ہمارے خدا کی محبّت ہر زمانے میں حیّ و قیوم ہے۔ دریافت کرنے کی بات ہے۔ آج بھی ذوقِ یقیں میسر آجائے تو

ع آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

یہی تو ایک بہت بڑا راز ہے — اور جس نے اِس راز کو سمجھ لیا، وہ مر گیا — اور جو نہ سمجھ سکا، وہ مارا گیا۔

بیزاری

انسان نے انسان کو انسان سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ لوگ اُس کی نگاہ سے گر گئے اور وہ خود انسانیت سے گر گیا— آج کا انسان اپنے علاوہ کسی کو کچھ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ صرف ایک حقیقت ماننے کو تیار ہے— اپنا وجود— اُس کی نظر میں باقی مخلوق غیر اللہ ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو معتبر مانتا ہے— ایسے عقیدے کا بھی کیا اعتبار—!

آج ہر آدمی ہر دوسرے آدمی سے بیزار ہے۔ دراصل خود پسندی اور خود پرستی کا منطقی نتیجہ بیزاری ہے— جس آدمی سے جو بات کرو، اُلٹا ہی جواب ملے گا۔ فرد، افراد سے بیزار ہے، طبقہ طبقوں سے۔ حکومت رعایا سے تنگ آ گئی ہے، رعایا حکومت سے اُکتا چکی ہے۔ رشتے اذیت بنتے جا رہے ہیں— خون کے رشتے، خونی رشتے بنتے جا رہے ہیں— بڑوں نے چھوٹوں پر مصیبت ڈالی ہوئی ہے، چھوٹے بڑوں کے لیے عذاب بن رہے ہیں۔ عقیدہ معتقدوں سے اور معتقد اپنے عقیدے سے علیحدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں سے بیزار ہے اور کرنیں اپنا سورج چاٹ رہی ہیں۔

عجب بات ہے— زندگی ختم ہو جاتی ہے اور پروگرام ختم نہیں ہوتے— ہونی ہوتی نہیں اور انہونی ہوتی جا رہی ہے۔ وقت کے حساب سے رات رخصت ہو چکی ہے، لیکن سورج ابھی تک نہیں نکلا۔ سفر ختم ہو گئے، لیکن منزلیں نظر نہیں آتیں۔ مسافر ختم ہو گئے، لیکن مسافرت باقی ہے۔ عجب حادثہ ہے، انسان چلتے چلتے مٹ گیا— مگر فاصلہ نہیں مٹتا۔

دوست دوستوں کو چھوڑ رہے ہیں۔ دشمن دشمنوں سے مل رہے ہیں۔ وفا کو حماقت سمجھا جا رہا ہے، اِس لیے کہ اس میں دوسروں کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

آج کے دَور کے لیے "تسلیم" کا لفظ ناقابلِ قبول ہوتا جا رہا ہے — کوئی شعبہ اپنی کسی غلطی کو نہیں مانتا — دوسروں کی کسی خوبی کو ماننا تو جیسے عذاب ہو — اور نتیجہ یہ ہے کہ سماج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ تبلیغ زوروں پر ہے، تسلیم کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔ نئی عبادت گاہیں بن رہی ہیں۔ بڑے بڑے فانوس معلّق ہیں۔ بڑے بڑے طاقتور لاؤڈ سپیکر نصب ہیں۔ روحِ عبادت ہی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ وقت ہی کچھ ایسا ہے۔ اللہ کی عبادت کرنے والے، اللہ کی مخلوق سے بیزار ہیں — یعنی اللہ سے پیار ہے اور اللہ کے کام سے، اُس کے آرٹ سے، اُس کے فن سے، اُس کی مخلوق سے، یہ لوگ بیزار ہیں۔ اللہ انسان پیدا کرتا ہے۔ انسانوں سے پیار کرتا ہے اور یہ لوگ عبادت کے بہانے انسانوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اِن لوگوں کو اللہ سے زیادہ اپنی عبادت سے پیار ہے۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے!

ابلیس خدا سے پیار کا دعویٰ کرتا تھا۔ اُس کی عبادت کرتا تھا، لیکن اُس کا حکم ماننے سے انکار کر گیا۔ اس نے تکبر کیا، کفر کیا۔ اِس لیے کہ اُسے انسان کی اہمیت کا شعور حاصل نہیں ہوا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسے مصوّر سے پیار ہے لیکن اُس کی بنائی ہوئی تصویروں سے پیار نہیں — تو اُس شخص کو کیا کہا جائے!

یہ کائنات اور اِس کی تمام رعنائیاں، اِس کے چاند، ستارے، سورج، پہاڑ، میدان، دریا، سمندر، بادل، انسان، حیوان، چرند پرند، ظاہر مخفی مخلوق، اِس کے جمادات، نباتات سب خالق کا عمل ہے اور خالق کا ہر عمل خالق کی طرح محترم اور معزز ہے۔

عقیدے اور اعتقادات انسانوں کو مزید انسان بنانے میں کام آتے ہیں، لیکن انسان ہونا شرط ہے۔ ہم شاید انسان ہونے سے، انسان بنے رہنے سے بیزار ہیں۔ ہم ہر چیز سے بیزار ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ ہمارے پاس نہ تلاش ہے، نہ حاصل — یہ بیزاری انسان

کی روح تک آ پہنچی ہے اور یہی معاشروں کی تباہی کا باعث ہے۔ اِس بیزاری کی وجہ سے ہر آدمی ایک خوفناک تنہائی کا شکار ہے — ایک دُور تک پھیلے ہوئے صحرا میں تنہا مسافر کی تنہارات کی طرح۔ ہم جب تک دوسروں کو قبول نہیں کرتے، اُن کا احترام نہیں کرتے، اُن کو خالق کی مخلوق کے طور پر عزت سے نہیں دیکھتے، تب تک ہمیں بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔

آج کی بیزاری کا یہ عالم ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا: ''بھائی! تم نے وہ کہانی سنی ہے؟'' دوسرے نے بیزار ہو کر جواب دیا: ''نہیں! میں نے دوسری کہانی سنی ہے'' — اور یوں بات کو وہیں دفن کر دیا۔ کسی زمانے میں لوگ موسم کا حال بیان کر کے ایک دوسرے کے حالات جان لیتے تھے۔ ایک دوسرے سے تعارف کرتے تھے، ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے تھے، لیکن آج کوئی انسان کسی انسان کے قریب آنا چاہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خطرہ خطرے کے قریب آرہا ہے۔

اُستاد شاگردوں سے بیزار ہیں اور شاگرد اساتذہ سے — علم کی تمنّا ختم ہو گئی ہے۔ لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن علم کے قریب نہیں جاتے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کی تمنّا نے انسانوں کے درمیان بڑے فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔ انسان مشین بن کے رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر مریض کے مال سے محبّت کرتے ہیں اور مریض کی ذات سے بیزار ہیں۔ مریض ڈاکٹروں سے تنگ ہیں لیکن بڑے بڑے ہسپتالوں میں بڑی رونقیں ہیں۔

انسان کو انسان سے کوئی پیار نہیں۔ مال کی محبّت نے انسان سے انسانوں کی محبّت چھین لی ہے۔ ترقی کی انتہا یہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں تباہ کن ایجادات کر چکی ہیں۔ زمین اور آسمان خطروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ خطرہ صرف انسان کے لیے ہے۔ انسان کا وجود خطرے میں ہے۔ قومیں قوموں سے بیزار ہیں، ملک ممالک سے۔ اِس بیزاری نے رُوس کو کیا دن دکھائے ہیں۔ کتنا بڑا عروج اور کتنا بڑا زوال! — امریکا اب تمام قوت اور خود فریبی کے باوجود اِس قسم کے خطرے اور حالات سے دوچار ہے۔ غرور اور انسانوں سے بیزاری، انسان کو آخر برباد کر

دیتے ہیں۔ مغربی تہذیب اپنے سفر کے شاید آخری حصے میں پہنچ گئی ہے۔ یہ آشیانہ اپنے ناپائیدار ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔

اب بھی دنیا کی اُمّید اور اِنسان کے مستقبل کا اِمکان تہذیبِ مشرق میں ہے۔ مادّہ پرستی نے اِنسانوں میں بیزاری پیدا کی — ایک رُوحانی زندگی ہی اِس بیزاری کا علاج ہے۔ ابھی مشرق میں کچھ چراغ جل رہے ہیں۔ روشنی باقی ہے۔ لوگ روح کی باتیں کرتے ہیں، لیکن یہاں بھی مادّہ پرستی کی وَبا تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اِس مقام پر ہر ذی ہوش آدمی کا فرض ہے کہ وہ غور کرے۔ دولت سے محبّت کی بیماری سے شفا پائے۔ انسان سے محبّت کا آغاز کرے۔ دلوں میں پیدا ہونے والے فاصلوں کو کم کرے۔ خدا سے محبّت اور اُس کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے بنائے ہوئے انسانوں سے پیار کرے۔ جب تک انسان، انسان کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرے گا، وہ سکون اور چین میں داخل نہیں ہو گا۔

یہ کائنات بہت مربوط ہے۔ اللہ نے ایک انسان کو آنکھ عطا کی ہے تو دوسرے کو خوبصورت چہرہ عطا فرمایا ہے۔ جب تک یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے کے قریب نہ ہوں، جلوہ پیدا نہیں ہوتا۔ بس آئینہ آئینے کے سامنے ہو تو نظارہ ملتا ہے۔ حسنِ تخلیق یہ ہے کہ قوّتِ سماعت — اپنی قوتِ سماعت، محتاج ہے قوتِ گویائی کی — دوسروں کی قوتِ گویائی! یہ دوسرے لوگ بہت اہم ہیں، اپنے لیے — اپنے ہونے کے لیے۔ یہ نہ ہوں، تو ہم کیا ہیں۔ جاننے والے بزرگ کہتے ہیں کہ آج کل عالم یہ ہے کہ کفر بھی "اپنی صداقت" چھوڑ چکا ہے، اِس لیے اسلام میں بھی وہ جذبہ نہیں پیدا ہو رہا۔

اپنے اپنے مقام پر ہر چیز بدلتی جا رہی ہے۔ تعمیر اپنی بنیادوں سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اِس بیزاری کو دُور کرنے کا طریقہ سوائے احترامِ آدمیت کے اور کیا ہو سکتا ہے! جو لوگ خدا سے محبّت کا دعویٰ کرتے ہیں اور مخلوقِ خدا سے بیزار ہیں، اُن لوگوں نے اِس بیماری کا آغاز کیا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں، ایک دوسرے کو

تبلیغ کرتے ہیں، ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے محبّت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، کیونکہ ہم ایک دوسرے سے بیزار ہیں— حالانکہ ہم سب ایک ہی ہیں۔ ایک خالق کا عمل — ایک طرح سے زندگی میں داخل ہونے والے، ایک جیسا سفر کرنے کے بعد ایک جیسی موت کا ذائقہ چکھنے والے، ایک دوسرے سے بیزار کیوں ہیں؟ مسافروں کے درمیان مسافرت کے دوران کیا جھگڑا اور کیا بیزاری؟ اپنے دین اور اپنے عقیدے پر چلتے جائیں اور اِس سعادت سے محروم ہونے والوں کی خدمت کرتے جائیں تو شاید ایک اچھا وقت قریب آجائے۔

ایک دفعہ جب حضور اکرم ﷺ لوگوں کو وضاحت فرمارہے تھے کہ بھوکوں کو کھانا کھلانے کی کیا اہمیت ہے تو ایک صحابی نے عرض کیا: ”یارسول اللہ ﷺ! کیا غیر مسلم کو بھی کھانا کھلانا ثواب کا باعث ہے؟“ آپ ﷺ نے سختی سے فرمایا کہ بھوکے انسان کو کھانا کھلانا ہے، بھوکا تو بس بھوکا ہی ہے، مسلمان ہو خواہ یہودی، جہاں کوئی انسان بھوکا ہو، اُس کو کھانا کھلایا جائے۔

آج ہم دیکھتے ہیں اگر کوئی غریب دوائی کے لیے پیسے کا سوال کرے تو ہم اُس سے کہتے ہیں کہ پہلے تیسرا کلمہ سناؤ۔ ضرورت دوائی کی ہے۔ وقت تبلیغ کا نہیں ہے۔ تبلیغ کے لیے لاؤڈ سپیکر دن رات بول رہے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ لاؤڈ سپیکروں پر ٹیپ ریکارڈر بول رہے ہیں۔ شور پر شور مچا رہے ہیں۔ وقت بے وقت سب کچھ کہا جارہا ہے۔ انسان کو اتنا کچھ سننے کو مل رہا ہے کہ بس خدا کی پناہ! مسجدوں میں تبلیغ، جلسوں میں تبلیغ، شادی میں تبلیغ، نماز جنازہ پر تبلیغ — ہر آدمی ہر دوسرے آدمی کو تبلیغ کر رہا ہے۔ اِتنی آوازیں سن کر اِنسان کے پاس سوچنے کا وقت نہیں رہتا، اور عمل کا وقت تو اور بھی مشکل ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ انسان انسان کے قریب آجائے اور ایک متفقہ لائحۂ عمل کے ذریعے قوم کو سکون کی منزل کی طرف گامزن کر دیا جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ قوم حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف میں تقسیم رہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ زندہ باد اور مردہ باد کے علاوہ اور کچھ نہ کیا جائے؟ کیا بیزاری سے بچت کی

کوئی راہ نہیں؟

یہی وقتِ دُعا ہے کہ اے اللہ! ہم سب پر رحم فرما۔ ہمیں خود پسندی کے عذاب سے بچا۔ اے اللہ! تُو ہر لحاظ سے اپنی قدرتوں سمیت اکمل و اعلیٰ ہے۔ تیری بنائی ہوئی ہر چیز ایک مصلحت رکھتی ہے اور سب سے خوبصورت مخلوق اِنسان ہے۔ اے اللہ! ہمیں انسانوں کی عزت کی توفیق عطا فرما۔ ہمیں دوسروں کی حقیقت ماننے کا جذبہ دے۔ جو لوگ میرے اعتقاد پر نہیں چلتے، وہ ایک اپنی حقیقت رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق دے۔ جو لوگ ہمارے خلاف بولتے ہیں، اُن کی بات تحمل سے سننے کا حوصلہ عطا فرما، اور وہ جو ایک اچھے وقت کے انتظار میں بیٹھے ہیں، اُن کے حُسنِ انتظار کو ایک کامیاب منزل عطا فرما۔ وہ دَور نصیب کر دے کہ ہم تیری عبادت کریں اور تیرے بندوں سے محبّت — سورج اپنی کرنوں سے بیزار نہ ہو اور کرنیں اپنے سورج کو چاٹ نہ لیں۔ لوگ جس درخت کے سائے میں بیٹھے ہیں، اُس کا سایہ چُرا کر غائب نہ ہو جائیں۔ مروّت اور محبّت کے زمانے نازل فرما۔ ہمیں مال، شہرت اور اقتدار کے نشے کی بجائے سکون، مروّت، محبّت اور خدمت کے جذبات سے نواز دے۔

معلوم اور نامعلوم

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے — اور مغرب میں غروب ہوتا ہے — سورج ڈوب جائے تو رات آجاتی ہے — تاریکی اپنے حُسن کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے — اور پھر صبح ہوتے ہی وہی عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ سورج اور زمین کے مدار کی نسبت سے موسم بدلتے ہیں، بہار میں پھول کھلتے ہیں، خزاں میں پت جھڑ ہوتی ہے۔ ایک خاص موسم میں پرندے ایک خاص انداز سے آشیانے بناتے ہیں، بڑے بڑے خوبصورت آشیانے، اور پھر آشیانے خالی رہ جاتے ہیں اور پنچھی اُڑ جاتے ہیں — کسی نامعلوم منزل کی طرف —!

کون نہیں جانتا کہ آسمان سے نُور نازل ہوتا ہے، حُسن اُترتا ہے، روشنی آتی ہے اور بارشیں ہوتی ہیں۔ بارش اور روشنی نہ ہو تو زمین، زمین نہ رہے۔ سب جانتے ہیں کہ زمین کا حُسن، آسمان کی عطا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ روشنی کے اِس عظیم پھیلاؤ کے باوجود کچھ مقامات اَزل ہی سے تاریک چلے آرہے ہیں — کیوں؟ اَبرِ رحمت برستا ہی چلا جاتا ہے اور کچھ لوگ بُوند بُوند اور قطرے قطرے کو ترستے ہی رہتے ہیں۔ ایک کھیت میں جل تھل ہوتا ہے اور ساتھ والا بے آب عذاب سے جل جل جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

ایک خاص مقرر شدہ لمحے میں زندگی پیدا ہوتی ہے اور ایک اتنے ہی خاص اور مقرر شدہ لمحے میں مر جاتی ہے۔ آدمی مر جاتے ہیں اور زندگی پھر بھی زندہ رہتی ہے۔ یہ کیا راز ہے؟

ایک بچہ پیدا ہوتے ہی حسرتوں اور مایوسیوں کی گود میں ڈال دیا جاتا ہے اور دوسرا

بچہ — فراوانیوں سے کھیلتا ہوا، زندگی کے درد اور کرب سے نا آشنا، پروان چڑھا دیا جاتا ہے۔ انسان برابر ہیں لیکن معلوم نہیں کہ کیسے برابر ہیں۔ ہم نے تو موت کے یکساں عمل کے باوجود قبروں کو یکساں حالت میں نہیں دیکھا۔ ایک مزار پر تو ہجومِ عاشقاں نے میلے لگا رکھے ہیں اور دوسرا مزار تو "مزارِ غریباں" ہی رہتا ہے۔ یہ کیا راز ہے کہ آباد، مہذب اور متمول شہروں کے اندر خانہ بدوشوں کے پھٹے ہوئے خیمے موجود ہوتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ میڈیکل سائنس ترقی کرتی جارہی ہے اور ہسپتالوں میں مریض بھی بڑھتے جارہے ہیں۔ انسان قہقہے لگاتے لگاتے کراہنے لگ جاتا ہے — معلوم عمل میں نامعلوم عمل شروع ہو جاتا ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ بچے ایک جیسے ہوتے ہیں، ساخت کے اعتبار سے، لیکن ایک گھر میں پلنے والے جڑواں بھائی بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ احساس مختلف ہو جاتے ہیں۔ ایک انسان شعر کہنے لگ جاتا ہے اور دوسرا، ہمیشہ دوسرا ہی رہتا ہے۔ یہ کیا کرشمہ ہے کہ ایک لقمے سے خون بھی بن جاتا ہے، ہڈیاں بھی، بینائی بھی، رعنائیِ خیال بھی — اور حسن و جمال بھی — لقمے سے کیسے کیسے کرشمے پیدا ہوتے ہیں — کیوں؟

بے رنگ زمین میں ہم بے رنگ بیج بوتے ہیں، اسے بے رنگ پانی دیتے ہیں اور پھر کچھ عرصہ بعد اُس سے رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ وہی پانی پتوں میں سبز ہو جاتا ہے اور گلاب میں سرخ — کیا پانی، بیج اور مٹی اپنا خاص شعور رکھتے ہیں؟

آج بھی اِسی بے جان زمین میں جب کوئی مردہ بطور امانت دفن کیا جائے تو وہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میّت کے پھول تک نہیں مرجھاتے — کیا زمین سماعت بھی رکھتی ہے؟

سب جانتے ہیں کہ گائے ایک خوبصورت جانور ہے — مسلمان اس کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ ہندو اِس کی پرستش کرتے ہیں۔ گائے دودھ دیتی ہے، سب کو معلوم ہے۔ دودھ کی افادیت — دودھ کو لوگ نُور بھی کہہ لیتے ہیں۔ گائے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے، لیکن اتنا کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ خون اور گوبر کے درمیان سے پاکیزہ دُودھ کی نہر کیسے جاری ہوتی ہے۔ پاکیزگی ہی پاکیزگی — نُور ہی نُور — صحت ہی صحت —

یہ سب کیسے ہے؟

اور تو اور — ایک معمولی سی مکڑی کو لیں، جو مٹی نگلتی ہے اور مٹی اُگلتی ہے، لیکن اِس اُگلنے والی مٹی سے ریشم کی ایک تار کا نکلنا اور پھر اِس تار کے ذریعے ایک ایسا خوبصورت جالا بُننا، جو جیومیٹری کے اصولوں کے عین مطابق ہوتا ہے — خوبصورت اور دیدہ زیب — یہ اُس کی فطرت ہے، لیکن اتنی خوبصورت کہ بیان سے باہر — اور اسی مکڑی کے جالے کے حوالے سے تاریخِ اسلام کا ایک عظیم واقعہ کہ مکڑی کے جالے نے ایک عظیم ترین زندگی کے محفوظ رہنے کا جواز بنایا اور اِسی کمزور جالے سے ایک قوی دلیل بر آمد ہوئی — یہ سب کیسے ہے؟

ہم نے دیکھا کہ ایک مکّھی پھولوں سے رس اِکٹھا کرتی ہے اور پھر ایک نامعلوم عمل کے ذریعے اس سے شہد بناتی ہے۔ ایک قیمتی اور عظیم خوراک جس میں لوگوں کے لیے شفا لکھ دی گئی ہے۔ یہ سب کیسے ہے؟ مکّھی کو، ایک ''اَن پڑھ'' مکّھی کو، اتنی بڑی تعلیم کہاں سے ملی کہ بڑے بڑے معلّم اِس کو سمجھنے سے قاصر ہیں — اِسے کس نے سکھایا؟

ہم سب کو معلوم ہے کہ ایک معمولی سا پانی کا قطرہ ایک بے جان سیپ کے باطن میں اُتر جاتا ہے اور پھر وہی سیپ اِس میں جان ڈالتی ہے — اور اِس قطرے کو ایک ایسے انوکھے اور نرالے عمل سے گزارتی ہے کہ وہی معمولی قطرہ ایک گوہرِ تابدار بن جاتا ہے۔ سیپ میں شعورِ مخفی رکھا گیا ہے؟ یہ بجا ہے کہ سائنس نے موتی کلچر کیے ہیں، لیکن صرّاف کے پاس جاتے ہی قلعی کھل جاتی ہے۔ نقل دو کوڑی کا اور اصل دُرِّ بے بہا۔ میاں محمد بخشؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

؎ کچ وی منکا، تے لعل وی منکا، اِکّو رنگ دوہاں دا
جد صرّافاں اَگّے جاون تے فرق ہزار کوہاں دا

(اصل اور نقل کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے، لیکن جاننے والے کی نگاہ میں اِن میں ہزار ہا میلوں کے فاصلے ہوتے ہیں۔)

ہم علم رکھتے ہیں کہ محنت سے اِنسان کو مقصد حاصل ہو جاتا ہے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ تمام محنتیں کیوں بار آور نہیں ہوتیں۔ کامیاب لوگ بھی محنت کرتے ہیں اور ناکام بھی۔

اَمیر محنت کرتے ہیں اور غریب اُس سے زیادہ محنت کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ غریب رہتے ہیں۔ کیا کوشش کے علاوہ کوئی اور عمل بھی اِنسان پر کارفرما ہے؟ کیا اُسے نصیب کہتے ہیں؟ نصیب کیوں ہوتا ہے؟ انسان اپنے نصیب سے کیوں باخبر نہیں ہوتا؟ کیا نصیب ظالم بھی ہو سکتا ہے؟ —یہ معلوم نہیں۔

ساکن فضاؤں میں خاموش زندگی کے دوران اچانک زلزلے کا ہنگامہ کیا ہے؟ بستیاں زیر و زبر ہو جاتی ہیں۔ بستیاں تہ و بالا کر دی جاتی ہیں۔ ہنستے کھیلتے والی زندگیاں بے سبب ہی ملبے تلے دب کر مر جاتی ہیں—یہ زلزلے کیوں آتے ہیں؟

ہم دیکھتے ہیں کہ پہاڑ، خاموش پہاڑ، پتھروں کے ڈھیر کب سے پڑے ہوئے ہیں۔ اِن کی حقیقت کیا ہے۔ پتھر ہیں، لیکن اِن پتھروں کے درمیان عجب کھیل ہوتا ہے۔ پانی ہے، آگ ہے اور مٹی ہے۔ مٹی میں ملی ہوئی دھاتیں ہیں۔ سونا، چاندی، تانبا، غرضیکہ ہر طرح کی قیمتی دھاتیں۔ یہ بے نام سے پہاڑ، پتھروں کا ڈھیر، اپنے اندر، اپنے پہلو میں بیش بہا قیمتی خزانے لیے بیٹھے ہیں۔ لکڑی کے نہ ختم ہونے والے خزانے، معدنیات کے نہ ختم ہونے والے ذخیرے، سنگِ سرخ، سنگِ سیاہ اور سنگِ مرمر—خزانے ہی خزانے—نہ ختم ہونے والے سٹور —کہیں نمک کی نہ ختم ہونے والی کان اور کہیں کوئلے کے ذخیرے—اور حیران کن بات کہ انہی کوئلوں کے ذخیروں کے آس پاس بیش بہا قیمتی ہیرے پائے جاتے ہیں۔ عجب بات یہ ہے کہ چمکتے دمکتے ہیرے دراصل کاربن ہی کی ایک شکل ہے۔ کاربن کو یہ خوبصورت شکل اختیار کرنے کا شعور کیسے مل گیا؟ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے—یہ معلوم نہیں ہو سکا!!

ہمیں معلوم ہے کہ سمندر گہرے اور وسیع پانی کا پھیلاؤ ہے، لیکن اِس وسیع پھیلاؤ کے اندر جانے والوں نے عجیب و غریب کرشمے دریافت کیے ہیں، جنہیں دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اِن سب کرشمہ کاریوں کی وجہ سائنس معلوم نہیں کر سکی۔

اِنسان کو یہ تو معلوم ہے کہ ایک چھوٹی سی آنکھ پل بھر میں بے شمار مناظر دیکھ سکتی ہے۔ زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا سلسلہ آنکھ کی دسترس میں ہوتا ہے۔ انسان کی بینائی کیا کچھ

نہیں دیکھتی، لیکن انسان اگر اپنی بینائی کو دیکھنا چاہے تو وہی بے بسی —لا علمی!

ہمیں معلوم ہے کہ جو اَدوار اور جو زمانے ختم ہو چکے، وہ ختم ہو گئے۔ جو گزر گئے، وہ گزر گئے — لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ختم ہونے والا ختم ہی نہیں ہوتا۔ ختم ہونے والے واقعات ہماری تعلیم کا حصہ بن جاتے ہیں اور یہ تعلیم موجودہ زمانے کا علم کہلاتی ہے۔ گویا ناموجود زمانہ، موجود زمانے کا علم ہے۔ ایک طرف ہمارا مشاہدہ، ہمارا علم ہے اور دوسری طرف ہمارا مطالعہ ہمارا علم ہے —اور کبھی کبھی ہمارا غور و فکر اور ہمارا مراقبہ بھی ہمارا علم ہوتا ہے۔ اگر گزری ہوئی شے کو اور گزرے ہوئے زمانے کو یکسر نکال دیا جائے تو ہمارے علم کے پلّے کیا رہ جاتا ہے؟ تمام ادب، تمام فلسفہ، تمام تاریخ، تمام عمرانیات اور تمام مذہبیات اور سیاسیات بھی اپنے مفاہیم اور معانی کھو بیٹھتے ہیں۔ ہمارا دین عہدِ گزشتہ کی تعلیم سے ماخوذ ہے۔ ہمارے عقیدے عہدِ گزشتہ سے متعلق ہیں۔ ایک جلیل القدر پیغمبرؑ نے خواب دیکھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو ذبح کرتے دیکھا۔ آپؑ نے اپنے فرزند سے خواب بیان کیا۔ آدابِ فرزندی سے آشنا بیٹا بولا: "آپؑ وہ کریں، جو آپؑ کو حکم ہوا"۔ بیٹے کو لٹایا گیا۔ چھری چلائی گئی، لیکن نہ جانے کیوں اور کیسے، بیٹے کی جگہ ایک دُنبہ پایا گیا۔ چلو یہ واقعہ تو ہوا، سو ہوا۔ بہت قدیم زمانے کا واقعہ ہے، لیکن یہ واقعہ آج تک ہوتا جا رہا ہے۔ اِسی واقعہ کی یاد میں آج تک قربانی ہو رہی ہے۔ یہ ماضی کیوں نہیں ماضی ہوتا؟ بھولا ہوا دَور کیوں نہیں بھولتا؟ گزرا ہوا زمانہ کیوں نہیں گزرتا؟ رُلانے والے صدمات گزر گئے، لیکن وہ ابھی تک کیوں رُلاتے ہیں؟ کربلا کا واقعہ بہت پرانا ہے، لیکن کربلا ہر دَم تازہ ہے۔ کون ہے جو ماضی کو حال بنا رہا ہے؟ وہ جو نظر کے سامنے ہے، وہ بھی ہمارا اپنا —اور جو نظر کے سامنے نہیں ہے، وہ بھی ہماری نگاہ میں ہے۔ یہاں تک کہ آنے والے زمانے بھی کچھ لوگوں کی نگاہوں میں ہوتے ہیں۔ کوئی انسان قدسیوں کے پاس پہنچ جاتا ہے اور اُن سے سنتا ہے کہ وہ خاص راز آشکار ہونے والا ہے۔

وہ راز کیا ہے جو بیان ہوتا جا رہا ہے اور آشکار نہیں ہوتا۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ ایک راز ہے، لیکن راز کیا ہے؟ اِس سے سب بے خبر ہیں کیونکہ وہ تو ابھی آشکار نہیں ہوا۔ سب

کہتے ہیں کہ بہت جلد کچھ ہونے والا ہے، لیکن کیا؟ اِس بارے میں سب خاموش ہیں۔ ہماری زندگی ماضی اور مستقبل کے بارے میں غور کرتے گزر جاتی ہے، یعنی حال — ماضی اور مستقبل کے بے ہنگم سنگم میں رہتا ہے۔ ہم آزاد ہونے کے باوجود اتنے بے بس کیوں ہیں کہ ہم نہ ماضی سے نجات پاسکتے ہیں اور نہ مستقبل کے خیال ہی سے باہر نکل سکتے ہیں؟ کیا ہم جکڑ کر رکھ دیے گئے ہیں؟ کیا ہماری آزادی اور نجات کی کوئی صورت نہیں؟ جو نہیں ہے، ہمارے لیے تو وہی ہے۔ ماضی گیا، ختم ہو گیا — لیکن نہ جاتا ہے، نہ ختم ہوتا ہے۔ مستقبل ابھی پیدا ہی نہیں ہوا، لیکن ہمارے ساتھ کون باتیں کرتا ہے؟ ہمارے خواب کون بناتا ہے؟ ہماری امّیدیں، ہمارے خدشات کون مُرتّب کرتا ہے؟

ہمیں اتنا کچھ معلوم ہونے کے باوجود، کتنا کچھ معلوم نہیں — کیوں؟

آخری خواہش

آخری خواہش کے اظہار کا موقع بھی بڑے نصیب کی بات ہے اور اِس موقع کے فراہم کرنے کا شکر ادا کرتا ہوں، میرے مالک! کہ تُونے مجھے ہوش عطا کیے رکھا، اپنی عطا کی ہوئی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا رہا، لیکن افسوس تو صرف یہ ہے کہ میں تیری نعمتوں کا بھرپور استعمال کرنے کے باوجود تیرے سامنے سجدۂ شکر تو کُجا، تیرے لیے کلمۂ شکر تک اَدا نہ کر سکا۔

میں بھی کتنا ناشکر گزار ہوں، تُو مجھے، مانگنے پر اور بن مانگے نعمتوں سے نوازتا رہا۔ میری زندگی کا تمام سرمایہ تیرے ہی کرم کا اظہار ہے۔ مجھے شعور بخشنے والے مولا! تُونے مجھے ظاہری باطنی بینائیوں سے نوازا۔ تُونے مجھے کیا کیا نہ عطا کیا۔ تُونے مجھے نیک بزرگوں سے وابستہ رکھا اور پھر وہی بات کہ میں اپنے آپ کو اتنا زیادہ اہل ثابت نہ کر سکا جتنا کہ شاید مجھے کرنا چاہیے تھا— لیکن یہ کیا کہ میں تجھ سے ایسے ہی ہم کلام ہو گیا۔ لو میرے مالک! میں آنسوؤں سے وضو کرتا ہوں اور پہلے تیرے سامنے سجدہ بجالاتا ہوں۔ یہ سجدہ تیری تسلیم کا سجدہ ہے، تیری محبّت کا سجدہ ہے، تیری نوازشوں کے شکر کا سجدہ ہے اور اِس بات کے اعتراف کا سجدہ ہے کہ میں تیری عبادت میں اپنی اِس شرمسار پیشانی کو سجدوں سے سرفراز نہ کر سکا۔

میرے مالک! یہ وقت جو اِس وقت مجھ پر آیا، اِس نے مجھے جہاں ایک طرف روشنی عطا کی ہے، وہاں اِس لمحے نے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے، لیکن میں تیرے سامنے گزارش کرتا ہوں کہ اگر اِسے غرور اور گستاخی نہ کہا جائے تو مجھے کچھ خوف نہیں۔

"حرفِ بے نیازی" سرزَد ہو رہا ہے، اور وہ بھی اس لیے کہ تیری رحمتوں پر بے انتہا بھروسہ ہے۔ اپنی ہستی میں یہ وجود اگرچہ خاکی ہے لیکن یہ مٹی تیرے کرم کے آسرے میں اپنے آپ سے بلند ہوتی جارہی ہے۔

میرے اللہ! مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معاف فرمادے۔ میں تیرے دربار میں سوائے ندامت کے چند آنسوؤں کے اور کچھ نہیں لا سکا۔ میرے پاس خجالت اور ندامت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انہی چند موتیوں کا حقیر نذرانہ پیش کرتا ہوں اور وہ بھی ایک ٹوٹے ہوئے پیمانے میں — اور یہ ہمیشہ بار بار ٹوٹا ہے۔ تیرے آسمان کے تارے ایک ایک مرتبہ ٹوٹتے ہوں گے اور یہ سینکڑوں بار ٹوٹنے والا پھر تیری رحمتوں کے سہارے قائم ہے۔ بہرحال آج میں اعتراف کرتا ہوں، کیونکہ اِس وقت جبکہ دنیا کی نگاہ میں آخری وقت ہے، میرے اور تیرے سوا اور کوئی نہیں — ایسی تنہائی مجھے زندگی میں پہلی بار نصیب ہوئی۔ ماضی کی تمام خواہشیں آج ندامتیں بن رہی ہیں اور مجھے یہ جان کر بہت ہی افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کبھی کبھی تیرے دربار میں جو رو رو کے دُعائیں کی ہیں، وہ بھی حصولِ گناہ کے لیے ثابت ہوئیں۔ میرے اللہ! میں کیا کرتا رہا ہوں۔ میں نے تجھ سے دولت مانگی اور تُو نے عطا فرمائی، لیکن اِسی دولت کے سہارے میں نے تیرے بندوں کو اَذیتیں دیں، اُن کی اَنا مجروح کی، اُن پر زندگی کی آسانیاں کم کر دیں۔ میرے مالک! تیرا اِحسان میں نے تیرے ہی دربار میں تیرے ہی رُوبرو تیری بغاوت کے لیے استعمال کیا۔ کاش! میں اُس وقت مَر گیا ہوتا جب میں گناہ سے حاصل کی ہوئی دولت اور غریبوں یتیموں کے حقوق غصب کرنے سے حاصل ہونے والی دولت کے سہارے تیرے دربار میں آیا۔

میں نے بظاہر حج کیا، لیکن تجھے معلوم ہے اور مجھے بھی یاد آ رہا ہے کہ اس حج میں تیری محبّت شامل نہیں تھی۔ یہ میری ایک سیاسی اور سماجی ضرورت تھی۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ دین کے نام پر میں دنیا کے کاموں میں مبتلا رہا۔ کہیں میں نے دینی جماعت بنائی، اور یہاں تک ظلم کیا کہ میں نے اس میں ایسی ایسی باتیں کر دیں جو درحقیقت نہیں تھیں۔ میں نے فرضی مکاشفات بیان کر کے سادہ لوح انسانوں کو اپنی اَنا کی تسکین کے لیے متاثر کیا۔ میں نے بڑا ظلم

کیا۔ میں نے جھوٹے خواب بیان کیے۔ میں نے فرضی مراقبے بیان کیے۔ میں نے جعلی مقامات پر اپنے آپ کو فائز بتایا۔ میں نے بڑا ظلم کیا، اور ان باتوں پر مجھے کل تک خوشی تھی کہ میں نے لوگوں کو بے وقوف بنایا، لیکن آج میرے مولا! تیرے دربار میں جھوٹ بولنے کی تو گنجائش ہی نہیں اور سچ بولتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے، لیکن یہ آخری وقت کم از کم مجھے بیبا کی ضرور عطا کر رہا ہے کہ میں اعلان کر دوں اُن تمام لوگوں کے لیے جو میرے طلسماتی بیانات کے جال میں پھنس گئے تھے، اُن تمام لوگوں سے آج معافی چاہتا ہوں۔

لوگ بھی کتنے سادہ لوح ہیں کہ کسی کے روحانی مقام کے بارے میں افواہیں سن کر اُس کے پیچھے ہو لیتے ہیں — کہیں کسی ڈبہ پیر کے دام میں آ جاتے ہیں، کہیں کسی سیاہی پیر کے، کہیں کسی کے فریب میں، کہیں کسی کے فریب میں — حالانکہ تُو نے یہ کھول کے بتایا ہے کہ عاقبت اپنے اعمال پر ہے، دوسرے کے مقامات پر نہیں۔ یا اللہ! یہ وقت اِس لیے بھی میرے لیے قیمتی سا ہے کہ لوگوں کی نگاہ کے مطابق یہ بسترِ مرگ ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ یہی وقت میری بیداری کی صبحِ صادق کا وقت ہے۔ آج تیرے اور میرے درمیان کسی تکلّف کا کوئی پردہ نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو میرے اتنا قریب ہے جتنا کہ باقی رہنے والی ذاتِ ذوالجلال ایک فانی انسان کے قریب ہو سکتی ہے۔ میرے اللہ! مجھے وہ زمانہ بھی یاد آ رہا ہے، جب میں نے بظاہر تیری عبادت بھی کی، بڑے زور و شور سے تیری نمازیں پڑھیں، بڑے دَم خَم سے میں نے محافلِ ذکر میں شمولیت کی، اللہ ہُو کی ضرب لگانے کے لیے میرے پاس بڑے جواز تھے۔ میں لوگوں کو متاثر کرنا چاہتا تھا کہ انہیں پتہ چل جائے کہ میں بڑا عابد، زاہد اور ذاکر ہوں۔ اے اللہ! اس ریاکاری کے لیے مجھے معاف کر دیا جائے۔ وہ نمازیں ہی تھیں، لیکن ریاکاری کی۔ وہ عبادت ہی تھی، لیکن نمائش کے لیے۔ میں نے تیری عبادت کی، لوگوں کے لیے، سماج کے لیے اور کبھی کبھی تو سیاسی جلسوں میں باجماعت ریاکاری کا مرتکب ہوا۔ میرے اللہ! میں بہت بڑا ظالم انسان تھا لیکن آج تیرے دربار میں پہنچ کر توبہ کی توفیق حاصل کر کے یہ معلوم ہوا کہ تیری عطا، ہماری خطا سے بہت زیادہ ہے — بلکہ تیری عطا کے سامنے کسی خطا کا ذکر ہی کیا، لیکن خطا کا

ذکر اور اِس پر استغفار کے مواقع ملنا بھی بڑے نصیب کی بات ہے، اور تُو نے مجھے یہ خوش نصیب لمحہ عطا کیا ہے۔ اِس شکر کے لیے بھی میرے پاس وہی آنسو ہیں جو پہلے ندامت کی تسبیح بیان کر رہے تھے۔

میرے اللہ! میں اِس بات کا بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ تُو نے مجھے رونے والا بنایا اور اِس بات کا شکر ہے کہ آج میں کسی تمنّا یا حسرت کے لیے نہیں رو رہا۔ آج میں اُن تمام غلطیوں اور کوتاہیوں پر جن میں ریاکاری کی عبادتیں بھی شامل ہیں، اُن کے لیے افسوس کر رہا ہوں، اور تُو نے افسوس کا جو موقع عطا کیا، اُس کے لیے اپنی مسرت کا اظہار اِن اشکوں سے کر رہا ہوں جو اَب میری آئندہ زندگی کے لیے چراغاں کا کام کریں گے۔ یہ بسترِ مرگ کی توبہ نہیں کیونکہ میرے حواس قائم، میرے ہوش قائم، میرا سانس قائم، میرے دل کا احساس زندہ، میرے خون کی گردش سلامت، میری یادداشت زندہ، میرا اَپنے پروردگار پر ایمان تابندہ۔ میں ابھی نہیں جانتا کہ میرے لیے آئندہ کتنا عرصہ زندہ رہنے کا موقع عطا ہو جائے۔ میں اِسی بات کے لیے شکر اَدا کر رہا ہوں کہ اَے میرے مولا! تُو نے مجھے توبہ کی توفیق موت سے پہلے عطا کر دی۔ تُو ہی توفیق عطا کرنے والا ہے۔ میرے مولا! آج میں تیرے ساتھ چند باتیں اِس لیے کر رہا ہوں کہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو اور یہ دل پھر تیرے عالی دربار میں سرنگوں ہو جائے۔

مجھے وہ دن یاد ہے، جب میں نے کاروبار شروع کیا۔ کاروبار میں خوب ترقی ہوئی اور میرے بیانات میں خوب جھوٹ کی ملاوٹیں ہوئیں۔ میں نے اپنے گاہکوں کو اپنی ظاہری عابدانہ شخصیت کے رعب سے لُوٹا اور اُس وقت میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ میں کیا کر رہا ہوں! دراصل میں اپنے آپ کو لُوٹ رہا تھا۔ لوگوں کا سرمایہ تو حاصل کر رہا تھا لیکن میں اپنی آبرو لُوٹ رہا تھا۔ اپنی عاقبت خراب کر رہا تھا، اپنے مستقبل میں زہر گھول رہا تھا۔ میرے مولا! میں نے بہت سے پیشے بدلے اور ہر پیشے کا مقصد تھا کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بیوقوف بنایا جائے اور انہیں رنگین دھوکے دیے جائیں۔ میں نے زمینیں خریدیں، زمینیں بیچیں، مٹی سے سونا بنایا، لیکن آج جبکہ اور کوئی انسان پاس نہیں، میں جان رہا ہوں کہ اگر تُو نے توبہ قبول نہ کی تو میرا

چھپایا ہوا سونا گرم کر کے اُسی سے مجھے داغا جائے گا۔ میرے مولا! مجھے بچا! میرے اپنے چھپائے ہوئے جرائم کی زد سے۔ یوں تو میں نے کسی آدمی کو براہِ راست قتل نہیں کیا، لیکن میں لوگوں پر زندگی کے ذرائع تنگ کرتا رہا، اُن سے آسانیاں چھینتا رہا اور اپنے پاس وہ مال جمع رکھا جس کی مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ میں کتنا بے وقوف تھا کہ میں دوسروں کے مال کی حفاظت کرتا رہا اور آج اپنا حال دیکھ کر تیرے سامنے بے بسی کا اعتراف کرتا ہوں اور اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت کی حماقت پر تہِ دل سے معافی مانگتا ہوں۔

میرے اللہ! مجھ پر رحم فرما۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب میں نے سیاسی زندگی اختیار کی۔ لوگوں سے اُن کی خدمت کے بہانے تقویت لے کر اُنہی کے خلاف استعمال کی۔ غریبوں نے مجھے طاقتور بنایا اور میں نے اُن لوگوں کی زندگی میں کوئی روشنی نہیں کی۔ میرے اللہ! میں آج تسلیم کرتا ہوں۔ کاش! میں حکومت کرنے کی بجائے خدمت کرنے کی خواہش کرتا، کیونکہ خدمت مجھے تیرے قریب رکھتی، حکومت اپنی اَناپروری کی وجہ سے تجھ سے دُور کر گئی۔ میرے اللہ! اس بات کی معافی چاہتا ہوں۔ آج میرے پاس کوئی دُعا نہیں کہ میں اپنے کسی منصوبے کی کامیابی کے لیے کچھ عرض کروں، صرف اور صرف اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہتا ہوں۔ میرے اللہ! میری یہ دُعا ہے، ڈوبتے سورج کی آخری دُعا کہ مجھے عطا فرما وہ نعمت جو آج تک میں مانگ نہیں سکا۔ تُو جانتا ہے کہ مجھے کس چیز کی ضرورت تھی۔ تو جانتا ہے کہ وہ کیا نعمت اور کیا دولت تھی جس کا سوال مجھے بڑی دیر پہلے کر دینا چاہیے تھا، لیکن میرے پاس یہ شعور نہیں تھا۔ میری مراد ہے، میرے مولا! مجھے ڈوبنے سے پہلے اپنے محبوب ﷺ کا جلوہ دکھا — یہی جلوہ — مجھے آخری نعمت کی تمنّا کے طور پر درکار ہے۔ تُونے مجھے بہت کچھ دیا، مجھے یقین ہے کہ تُونے مجھے معاف فرما دیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جس پر تیرا رحم ہوتا ہے، اُسی کو توبہ کی توفیق ملتی ہے۔ مجھے اِس بات کا قوی یقین ہے کہ تیری رحمت کے دروازے سے کبھی کوئی سائل خالی نہیں گیا۔ بخشش کے طلب گار بس ندامت کے اظہار پر ہی سرشار کر دیے جاتے ہیں۔ جس نے منجدھار میں تجھے پکارا، اُس کا بیڑہ ہمیشہ پار ہوتا ہے۔ میرے مالک! مجھے سمجھ آرہی ہے کہ پکار

تیرے قرب کا اظہار ہے۔ میرے مالک! میں نے پکار کی ہے، تیرے دربار میں سوال کیا ہے کہ وہ جلوہ مجھے عطا فرما— ہاں یہی جلوہ۔ تیری مہربانی کے لیے میرے سجدے حاضر، میرے دل کے سجدے حاضر، میری روح کے سجدے حاضر۔ میرے پاس انتہا کی چیز، انکساری ہے، اور تیرے پاس بندوں کے لیے انعام، اپنے محبوب ﷺ کے جلوے ہیں۔ جلوہ سب تیرا ہی ہے— مظہرِ انوار، ذاتِ محبوب ﷺ ہے۔

میرے مالک! آج اتنا مبارک لمحہ تُو نے عطا فرمایا کہ پھر میرے اندر ایک تمنّا اور پیدا ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ اب تمنّا کا اظہار نہ کروں، لیکن مجبور ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جن جن لوگوں سے جو جو کچھ کیا، اُن کے پاس جا کر دست بستہ معافی طلب کی جائے۔ پس میرے مولا! اِس ڈوبتے سورج کو ڈوبنے سے بچا۔ مجھے پھر اپنے سفر پر روانہ کر۔ مجھے کھوئے ہوئے مواقع کے باوجود اُن لمحات کو پھر سے گزارنے کی توفیق دے جو گزر چکے ہیں۔ بہت کچھ چھن گیا لیکن ابھی اور بہت کچھ باقی ہے۔ اے دُعائیں قبول کرنے والے! تیرا شکریہ کہ میں اب آوازیں سن رہا ہوں۔ ڈاکٹروں نے میرے لواحقین سے کہا ہے کہ مبارک ہو، مریض بچ گیا ہے۔ کسی کو کیا پتہ کہ کیا ہوا تھا، اور کیا ہو گیا اور اب —اور کیا کچھ ہونا باقی ہے!!

تیرا شکر ہے، میرے مولا!— اس عظیم احسان کا شکر!!